احساسِ غم



ساحر لکھنوی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آثار و افکار اکادمی (پاکستان) کی ایک اور قابلِ فخر پیش کش

احساسِ غم

ساحر لکھنوی

کوائفِ کتاب

نام کتاب	:	احساسِ غم
مصنف	:	ساحر لکھنوی (سید قائم مہدی نقوی) دانش منزل، اے۔۳۲، بلاک نمبر ۱۳ فون نمبر ۴۹۷۷۷۲۶،۴۹۷۱۹۵ گلشن اقبال، کراچی ۷۵۳۰۰
کمپوزنگ	:	جاوداں لیزر کمپوزرز ۲۸۔ایچ، رضویہ سوسائٹی، ناظم آباد، کراچی
ناشر	:	آثار و افکار اکادمی (پاکستان) باشتراکِ ادارہ "طلوعِ افکار"، کراچی
طابع	:	عزیز پرنٹنگ پریس، کراچی
سرورق	:	ادارہ
سنہ اشاعت	:	۱۴۲۱ھ مطابق ۲۰۰۰ء
قیمت	:	۳۰۰ روپے
ملنے کا پتہ	:	(۱) آثار و افکار اکادمی (پاکستان)، کراچی دانش منزل، اے۔۳۲، بلاک نمبر ۱۳ گلشن اقبال، کراچی ۷۵۳۰۰ (۲) طلوعِ افکار، ۲۸۔ایچ، رضویہ سوسائٹی، کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہدیۂ انتساب

سید الشہدا امام حسین علیہ السلام اور کربلا کے ان تمام شہیدان وفا کی خدمت میں جنھوں نے اسلام کے خزاں رسیدہ چمن کی آبیاری اپنے خون سے کر کے اسے قیامت تک کے لیئے سرسبز و شاداب کر دیا،
انسانیت کی دم توڑتی ہوئی قدروں کو خود جان دے کر ابدی زندگی عطا کر دی اور سارے عالم انسانیت کو اپنا حلقہ بگوش بنا لیا۔
جن کے بے مثال جذبہ ایثار اور عدیم النظیر قربانیوں کو دنیا کی ہر قوم نے خراج تحسین پیش کیا
اور جن پر عقیدت کے پھول نچھاور کرنے کے لیئے انیس و دبیر سے لے اس حقیر فقیر ساحر لکھنوی تک نے سلام، نوحوں اور مرثیوں کے نذرانے پیش کیئے اس تمنا کے ساتھ کہ

گر قبول افتد زہے عز و شرف

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آثار و افکار اکادمی کی پانچویں قابلِ فخر پیشکش

الحمد للہ کہ آثار و افکار اکادمی (پاکستان) کراچی، ماہ نامہ "طلوعِ افکار" کراچی کے اشتراک سے حضرتِ ساحر لکھنوی کے مراثی کا دوسرا مجموعہ "آیاتِ غم" اکادمی کی پانچویں کتاب کے طور پر پیش کر رہی ہے۔

ہمیں امید ہے کہ ہماری یہ خدمت بارگاہِ معصومین علیہم الصلوٰۃ والسلام میں قبول ہوگی اور اردو ادب خصوصاً رثائی ادب کے شائقین میں بنظرِ استحسان دیکھی جائے گی۔

اکادمی علم و ادب کے فروغ اور اہلِ علم و اہلِ قلم کی پذیرائی اور ان کی خدمات کے اعتراف کے لیئے اپنے امکان بھر جو کوششیں کر رہی ہے، وہ یقیناً قوم کی طرف سے ہمت افزائی کی متقاضی ہیں۔

ملتِ جعفریہ کے تمام علم دوست حضرات سے ہماری دردمندانہ گزارش ہے کہ اکادمی کے مقاصد میں کامیابی اور ترقی کے لیئے اس کے ساتھ ہر طرح کا تعاون کریں، فروغِ علم کے لیئے اس کی تحریک کو کامیاب بنائیں، اپنے گراں قدر عطیات سے اس کی مالی حالت مستحکم کریں اور اس کی رکنیت اختیار کر کے اس ادارہ کو استحکام بخشیں۔ یہ اکادمی ہی کی نہیں، علم و ادب کی خدمت ہوگی جس کا صلہ بارگاہِ مدینۃ العلم اور بابِ مدینۃ العلم سے انشاءاللہ ہماری توقعات سے زیادہ ملے گا۔

آپ کے تعاون کے لیئے شکر گزار

انتظامیہ

آثار و افکار اکادمی (پاکستان)

دانش منزل، اے ۴۴، بلاک نمبر ۱۳، گلشنِ اقبال، کراچی ۷۵۳۰۰

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ترتیب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کچھ اس مجموعہ کے متعلق

یہ میرے مراثی کا دوسرا مجموعہ ہے۔ پہلا مجموعہ "آیاتِ درد" کے نام سے ۱۹۹۲ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں سات مرثیے تھے۔ میں چاہتا تھا کہ اس مجموعہ میں بھی سات مرثیے شامل کر دوں لیکن اس طرح کتاب میں تقریباً ساٹھ ستر صفحوں کا اضافہ کرنا پڑتا اور اس کی ضخامت بڑھ جاتی جس کا اثر طباعت کے اخراجات پر بھی پڑتا جو اس زمانہ میں مجھ جیسے شخص کے لیئے برداشت کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ کتاب کی قیمت بھی بڑھ جاتی گو کہ اس کا کوئی اثر کتاب پڑھنے والوں پر نہیں پڑتا اس لیئے کہ کتاب خریدتا ہی کون ہے۔ بہر حال ان وجوہ کی بنا پر میں نے اس مجموعہ میں صرف پانچ مرثیے شامل کیئے جس کا مجھے قلق ہے اس لیئے کہ میرے باقی چھ سات آٹھ مرثیے اشاعت سے رہ جائیں گے۔ اب موجودہ حالات میں جن میں میری طویل علالت بھی شامل ہے، یہ امید کرنا کہ اس مجموعہ کے بعد کوئی اور مجموعہ بھی شائع ہو سکے گا، غیر حقیقت پسندانہ بات ہوگی۔ بہر حال جو اللہ کو منظور ہو۔

اس کے علاوہ بعض حضرات کے اصرار پر میں اپنے نوحوں اور سلاموں کا بھی ایک مجموعہ شائع کرنا چاہتا تھا، دوسرے کچھ آسان سے قصیدے بھی، اس لیئے کہ آج کل کے بڑے بڑے اہل علم واہل قلم اور دانشور حضرات بھی جنھوں نے یقیناً مجھ سے

کہیں زیادہ علم حاصل کیا ہے اور مجھ جیسے کم سواد و کم نظر کے مقابلہ میں یقیناً عالم فاضل ہیں، "صحیفۂ مدحت" میں شامل میرے قصیدوں کی زبان اور تخیّل وغیرہ کو ناقابل فہم سمجھتے ہیں اور آج کل کے جدت پسند حضرات کے مقبول نعرہ "جدید حسیت اور عصری آگہی" سے تجاہل، بے خبری اور کم نظری سے تعبیر کر کے مسترد کر دیتے ہیں۔ ان کی ضیافتِ طبع کے لیئے آسان اردو میں کہے ہوئے قصیدے اور مناقب شاید ان کے معیار سخن پر پورے اترتے۔ مگر اب ان سب خواہشوں کو پورا کرنے کا وقت نہیں رہا۔

اس مجموعہ کا آخری مرثیہ "مرثیہ قطب شاہ سے ساحر تک" میرا پہلا مرثیہ ہے جو ۱۹۷۷ء میں انفرادی مرثیہ کے طور پر کتابی شکل میں شائع ہو چکا تھا۔ اس مرثیہ میں چونکہ کچھ مفید باتیں ہیں مثلاً تقریباً سوا سو مرثیہ نگاروں کے ناموں کے علاوہ مرثیہ کے آغاز اور مختلف ادوار وغیرہ کے بارے میں کچھ تاریخی اور ادبی تحقیقی اہمیت کی چیزیں ہیں جو خصوصیت سے رثائی ادب کے طلبا اور محققین کے لیئے دلچسپی کا باعث ہو سکتی ہیں جن میں ڈاکٹر ہلال نقوی کا لکھا ہوا "مرثیہ گو حضرات کا تعارف" بھی بہت اہم ہے۔ اس وجہ سے میرے بعض کرم فرما خصوصاً حضرتِ حسین اعظمی مرحوم یہ اصرار کرتے رہے کہ یہ مرثیہ دوبارہ شائع ہونا چاہیئے اس لیئے کہ جب یہ مرثیہ شائع ہوا تھا، اس وقت مجھے کوئی جانتا نہ تھا اور مرثیہ لوگوں تک پہنچ نہیں سکا تھا چنانچہ میں نے اس مجموعہ کے آخر میں اسے شامل کر دیا ہے۔

"بیاں اپنا" اور حضرتِ رئیس امروہوی مرحوم کا اس مرثیہ پر تبصرہ بھی شامل اشاعت ہے۔

میں کچھ اپنے مزاج کے خلاف ہونے کی وجہ سے اور کچھ تلخ تجربوں کی بنا پر کسی نقاد، مبصر یا ادیب و شاعر سے یہ نہیں کہتا کہ میری کسی کتاب کا پیش لفظ لکھ دیں یا اس پر تبصرہ کر دیں۔ "آیاتِ درد" جو میرے مراثی کا پہلا مجموعہ تھا، اس کے سات مرثیوں پر سات اہل قلم نے علیحدہ علیحدہ تبصرے لکھے تھے جو اس میں شامل ہیں اور جن کے لیئے میں ان کا ازحد شکر گزار ہوں، مگر اس میں میری کوشش سے کہیں زیادہ

حضرتِ اختر لکھنوی مرحوم کی کوششوں کا دخل تھا۔ ہندوستان سے تین نامور مرثیہ شناس اور نہایت معتبر دانشور و نقاد گرامی مرتبت جناب محترم ڈاکٹر تنویر احمد علوی (دہلی)، عالی منزلت جناب محترم ڈاکٹر شارب ردولوی، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی دہلی اور گرامی قدر جناب محترم ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری لکھنؤ نے بھی "آیاتِ درد" پر زحمت کر کے تبصرے تحریر فرمائے تھے جو میرے لیئے ایک بڑا اعزاز ہے۔ کتاب شائع ہو چکنے کی وجہ سے وہ تبصرے اس میں شامل نہیں کیئے جا سکتے تھے مگر ان حضرات کی کرم فرمائی اور زحمت کا لازمی تقاضہ تھا کہ وہ تبصرے بہر طور شائع کیئے جائیں لیکن اس کی کوئی مناسب صورت نظر نہیں آتی تھی۔ اب خدا کے فضل سے میرے مرثیوں کے اس دوسرے مجموعہ "آیاتِ غم" کی اشاعت کا موقع آیا تو میں نے فیصلہ کیا کہ ان تینوں اربابِ علم و دانش کے تبصرے ان کے شکریہ کے ساتھ اس میں شامل کر دوں۔ گو کہ وہ تبصرے "آیاتِ درد" کے مرثیوں کے حوالہ سے ہیں مگر بہر حال میری مرثیہ گوئی کے متعلق ایک مجموعی تاثر بھی ان سے مرتب ہوتا ہے۔ ان کی اشاعت میں غیر معمولی تاخیر افسوس ناک ہے جس کے لیئے میں انتہائی شرمندگی کے ساتھ ان عظیم المرتبت اہلِ قلم سے معذرت خواہ ہوں مگر بہر حال دیر آید درست آید کے مصداق اتنی تاخیر سے ان کی اشاعت بھی میرے لیئے کسی حد تک دلی تسکین کا سبب ہو سکتی ہے۔

جن حضرات کو اس مجموعہ کے مراثی کے مطالعہ سے حسینؑ و غمِ حسینؑ کے حوالہ سے کوئی مثبت تاثر ملے، وہ اس حقیر فقیر کے حق میں دعائے خیر کریں۔ اللہ ان کو اجرِ جزیل عطا فرمائے۔ آمین۔

گدائے درِ مولائے علم

ساحر لکھنوی

رباعی

شبیر سے امداد ملی ہے مجھ کو
توقیر ملی داد ملی ہے مجھ کو
اس مرثیہ گوئی کی اسی ڈیوڑھی سے
توفیق خداداد ملی ہے مجھ کو

ڈاکٹر تنویر احمد علوی

"آیاتِ درد" کا شاعر

ساحر لکھنوی (قائم مہدی صاحب) خاندان اجتہاد کے مفاخر میں سے ہیں۔ مجھے ان کی تہذیبی روش اور ان کے حسن اخلاق کی کشش کا کچھ اندازہ اس وقت ہوا تھا جب وہ محب مکرم مہدی عابدی کے ساتھ میرے غربت کدہ میں رونق افروز ہوئے تھے۔ ان کی پُر خلوص و مہذب شخصیت میں اس شہر ادب و ثقافت کی شعری اور شعوری روایتوں کو آج بھی دیکھا جاسکتا ہے جسے "لکھنؤ" کہتے ہیں۔

لکھنؤ کو "مشرقی تہذیب کا آخری نمونہ" کہا گیا ہے لیکن اس کے تہذیبی امتیازات پر سنجیدگی سے غور و فکر کی نوبت مشکل ہی سے آئی ہے۔ تنقیدی و نیم تحقیقی انداز پر بھی "دبستانی" انداز نظر کی پرچھائیاں پڑتی ہیں، غالب جیسا نابغۂ روزگار بھی اپنے REMARKS میں اس کا شکار ہو گیا۔

لکھنؤ کے ادبی مزاج اور لسانی معیار کی شناخت کے لیئے ناسخ و آتش کی ان غزلوں کو سامنے رکھا گیا جن سے ایک خاص طرز فکر اور اسلوب ادا کی نمائندگی ہوتی تھی اور نثری اسالیب کی عیار گیری کے لیئے "نو طرز مرصع"، "فسانۂ عجائب" اور رتن ناتھ سرشار کا ایک خاص انداز نگاہ اور اسلوب نگارش پیش نظر رہا۔

لکھنوی شہریت تکلف و تصنع اور حقائق حیات سے چشم پوشی اور عصری کوائف کی صحیح تفہیم و تحسین سے روگردانی کی مترادف بنی رہی۔ لکھنؤ کے فن تعمیر، فن رقص،

فن مصوری، فن نقاشی اور فن خطاطی کے امتیازات پر کسی سیریس (SERIOUS) گفتگو کے مواقع بہت کم آئے۔

غزل کے مقابلہ میں قصیدہ، مثنوی اور مرثیہ کے ادبی و تہذیبی مطالعہ میں یہ پہلو یا تو نظر انداز کیا جاتا رہا اور جب اس کی نوبت آئی تو بات موازنہ یا مناظرہ سے آگے نہ بڑھی۔ مرثیہ جسے لکھنؤ کی ادبی فتوحات میں ایک ممتاز مقام حاصل ہے، اس پر گفتگو آئی تو لکھنؤ اور دہلوی مرثیہ کو ادبی عیار گیری سے الگ رکھنے کی سعی بھی ہمارے نقادوں کی زبان قلم کو اپنے حلقۂ تسخیر کا پابند بلکہ اسیر دام خیال بنائے رہی۔ انیس و دبیر کے کمالات فن پر روشنی ڈالنے کی سعیٔ مشکور تو برابر ہوتی رہی لیکن ان کے فکری اور فنی ماخذ پر تحقیقی زاویۂ نگاہ سے کوئی ادبی محضر نامہ مرتب کرنے کی بات پھر بھی نظر انداز ہو گئی۔

واقعات ملا مقبل سے بہت سے خیال انگیز استعارے اور تشبیہیں انیس نے اخذ کی تھیں اور اپنے خلاقانہ لطف اظہار اور شاعرانہ حسن بندش کے ساتھ انھیں پیش کیا تھا۔ مدعائے ضروری الاظہار یہ ہے کہ لکھنؤ کی ادبی و تہذیبی فکر کو پچھلی دو ڈھائی صدیوں میں کسی جانی پہچانی لکیر یا "لیک" پر چلتے رہنے کے بجائے تاریخ و تہذیب اور شعروادب کے وسیع تناظر میں دیکھنا اور سمجھنا ضروری ہوگا۔

ساحر صاحب سے ملاقات اور ان کی تخلیقات کو دیکھنے کا اتفاق ہوا تو لکھنؤ کی شہریت و شعریت اور اس کے اسالیب فکر و نظر کو ایک نئے عصری تناظر میں دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ "مرثیہ بعد انیس" کے مطالعہ میں ایک اہم مرحلہ شاد عظیم آبادی سے متعلق ہے اور دوسرا جوش ملیح آبادی سے۔ ان سے آگے بڑھ کر اس میں اب بجا طور پر ساحر لکھنوی صاحب کا نام آتا ہے جو آج اس کی اس ادبی روایت کے "امین" ہیں۔

وہ مجالس عزا میں بحیثیت مرثیہ خوان و عزا نگار شرکت کرتے ہیں اور ان کے سو سو بند پر مشتمل مراثی انیس و دبیر کی عزاداری روایت کو تازہ کرتے ہیں، مگر ان کے فکر و فن کی آبیاری نئی عصری حسیت اور نئی سوچ کے تہذیبی تقاضوں سے ہوئی ہے۔

ماضی سے رشتہ دراصل اپنے تہذیبی ورثہ کے تحفظ کا مسئلہ بھی ہے اور اس کو آگے بڑھانے کا ناگزیر مرحلہ بھی۔ ہمارا ذہن "فانوسِ خیال" کی طرح صرف دائروں میں سفر نہیں کرتا، سمت و رفتار کا تعین ایک گونہ لاتعین بھی ہے۔ نئی زمینوں اور حدبندیوں کے آگے سفر ارتقائے حیات کی ضمانت بھی ہے اور ارتقائے خیال کی بھی جس میں تحرک و تسلسل کے ساتھ نیا تجسس بھی شریک رہتا ہے۔ دریا کے سفر کی طرح نئے موڑ اور نئے نشاناتِ سفر ہماری قدم زنی اور گام فرمائی کا مقدر ہوتے ہیں۔

اگر تجسس کے ساتھ نیا تجربہ شامل نہ ہو تو نئے تجزیوں کی نوبت ہی نہیں آسکتی۔ جذبہ کی صحت اور تجربہ کی صداقت کی بنا پر کوئی تجزیہ حقیقت آشنا نہیں ہو سکتا زندگی گزارنے کے لیئے ماضی سے حال اور حال سے مستقبل کی طرف سفر ناگزیر اور اس سفر میں کرمکِ شب تاب کی طرح اپنے ضمیر کی روشنی لازمی ہے۔ دوسرے لفظوں میں اپنے قدموں کے نیچے اپنی زمین بھی ضروری ہے۔

اس روشنی کی تلاش کسی ایسے فلسفہ کے بغیر ممکن نہیں جو زندگی سے جڑا ہوا نہ ہو اور جو حقیقت فلسفہ کو زندگی سے جوڑتی ہے، اسے ہم کسی روشن و شفاف کردار ہی کی صورت میں دیکھ سکتے ہیں جو آئینہ کی طرح ہمیں اپنی شناخت پر مجبور کرے۔

تاریخ کی پہنائیوں اور وقت کی بے کراں وسعتوں میں ان گنت واقعات حالات و حادثات آب و سراب کی طرح انسانی ذہن اور زندگی ہی کی پرچھائیاں ہیں۔ ان کی اعتباری کشش و روش اپنے معنی اور معنویت کی طرف برابر ہمیں متوجہ کرتی رہی ہے۔ اس سے استفادہ اور استناد میں دو باتیں ہماری مدد کرتی ہیں، ایک قوتِ اخذ و انتخاب اور دوسری قوتِ تفہیم و تعبیر۔ اقوام عالم کے تہذیبی سفر میں ان کا ذہن انھیں دو متوازی خطوط پر آگے بڑھتا نظر آتا ہے۔ یہ دو کنارے حدبندیاں بھی ہیں اور حدبندیوں کو توڑنے کا وسیلہ بھی۔ عالمی تاریخ میں کربلا کا واقعہ اور اس سے وابستہ حضرت امام حسینؑ اور اہل بیتؑ کا کردار اسی سطح پر راہ جوئی اور منزل رسی کی ایک علامت ہے۔ یہ ٹریجڈی (TRAGEDY) شکست و فتح سے ماورا ایک معنی خیز حقیقت ہے۔ ہر ایسے

واقعہ کے گرد خیالات و سوالات اور تسلیم و تعبیر کے دھنک جیسے حلقے بنتے چلے جاتے ہیں انھیں ہم آبی دائروں کی طرح کسی قید میں بھی نہیں رکھ سکتے۔ مرکزی نقطۂ کشش سے وابستگی کے باوجود اپنا ایک وسعت آشنا مزاج ہے ان موجوں کی طرح، آسودگی جن کی عدمیت کا نشان بن جاتی ہے۔

"مرثیہ" عربی سے فارسی، فارسی سے دکنی اور اردو میں آیا پھر علاقائی زبانوں میں پھیل گیا اور ہر مرحلہ میں نئی ذہنی روش اور نئی فکری کشش اسے نئی فنی جہتوں اور فکری ترجیحات سے آشنا کرتی رہی۔ فارسی اور اردو کے اچھے اور اونچے درجہ کے مرثیوں کو سامنے رکھ کر ہم اس دور کے مذہبی افکار اور تہذیبی اقدار کی کلیت کا مطالعہ بھی کر سکتے ہیں۔

مرثیے خانقاہوں اور درباروں سے لے کر کھیتوں کھلیانوں تک ہمارے تہذیبی منظر ناموں کی آئینہ داری کرتے ہیں۔ مرثیے فقرا کی زبان پر بھی رہے ہیں اور اہلِ ثروت کے لب و لہجہ کو بھی انھوں نے اپنی عزادارانہ لَے سے متاثر کیا ہے۔ اس کے ذریعہ لوری کی زبان سے لے کر قصیدہ تک کام آنے والا حسنِ بیان محفوظ ہوا ہے۔ سودا نے محض گریۂ عوام کے لیئے مرثیہ کہنے والے شعرا کو بنگاہِ تحسین نہیں دیکھا۔ اس کے زیرِ اثر بڑے مرثیہ نگار اور اس صنفِ شعر کے بڑے فن کار سامنے آئے جنھوں نے اس کو وسعت دی یہاں تک کہ قصیدہ کی طرح مرثیہ کے بھی کچھ مخصص اجزا قرار پائے لیکن "بین و بکا" کا عنصر مرثیہ سے کبھی خارج نہ ہوا، ہو جاتا تو پھر وہ مرثیہ نہ رہتا۔ "چشمِ نم" کی گریہ سامانی اور اشک افشانی سے زندگی کو الگ کر کے دیکھنا شاید ممکن بھی نہیں۔ ساحر صاحب نے "آیاتِ درد" کے اپنے خود نوشت مقدمہ میں اس کی وضاحت کی ہے کہ ان کے یہاں ساٹھ ستر بند اگر دوسرے مضامین و موضوعات پر مشتمل ہوتے ہیں تو وہ آخر کے پچیس تیس اس اہتمام کے ساتھ لکھتے ہیں کہ وہ گریہ خیز و الم انگیز ہوں۔ ہمیں یہ فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ مرثیہ میں واقعات کے تسلسل اور مرثیہ کی تاریخ سے نسبت رکھنے والے تصور کے ساتھ یہ "تاثر" تالِ مجلس ہی نہیں، تالِ فکر بھی ہے:

دل گیا رونق حیات گئی
غم گیا ساری کائنات گئی

مرگ و شہادت کی جمالیات اور مقصدیت کا بہترین موقع ہمیں مرثیوں ہی میں ملتا ہے۔

ساحر اپنے ہر مرثیہ کو ایک مستقل شعری تخلیق کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ سودا اپنے قصیدوں کے سلسلہ میں یہی سوچتے تھے۔ اس سے فکری "ارتکاز" کی نشان دہی بھی ہوتی ہے اور اس طرح تمہیدی منظر نامہ کی ایک نئی تخلیقی حسیت کے زیر اثر لا کر مرثیہ کہنے کی کوشش نئے مسائل سے علمی اور حیاتی وابستگی کی مستحسن خواہش بھی ہو جاتی ہے۔

ان کے فن اور انداز فکر سے دلچسپی رکھنے والوں کو ان سے یہ شکایت ہے اور کچھ ایسی غلط بھی نہیں ہے کہ وہ اپنے بیان کو بہت طول دیتے ہیں۔ طول کلام اپنے طور پر بعض ذہنوں میں سوالیہ نشان پیدا کرتا ہے اس لیئے کہ ہواؤں کی طرح بیان کا بکھراؤ شاعرانہ انداز بیان کی گھلاوٹ اور کساوٹ کے منافی ہے۔ شاید اس کا بڑا سبب تخاطب بہ عوام بھی ہے جس کے حلقۂ اثر میں آکر شعر گوئی بھی ذکر و وعظ اور داستان و روایت کے حلقۂ کشش سے کلیتاً باہر نہیں رہ سکتی۔ الا ماشاءاللہ مرثیہ کے بڑے فن کاروں کے یہاں لفظوں کی فراوانی اور ان کی طبع رواں کی رقصانی کے باوصف جگہ جگہ اس مدوجزر کو دیکھا جاسکتا ہے۔

بعنوان "قرآن اور وارثان قرآن" مرثیہ کے مطالعہ کے وقت جس بات کا تاثر ذہن پر زیادہ رہا ہے، وہ مضامین نو کی فراوانی تھی۔ ساحر صاحب کے یہاں TIME FACTOR کو بھی اس میں دخل ہے۔ وہ مجلس پڑھتے ہیں، مرثیہ سناتے نہیں اور مجلس کا اختتام اکثر قریب سحر ہوتا ہے۔ ایسے مرثیوں کو منظوم شہادت نامے تصور کیا جا تو زیادہ بہتر ہے۔ ان کے مرثیوں کے مطالعہ کے وقت جو بات زیادہ متوجہ کرتی ہے اور اپنے شعری اسلوب میں اور زیادہ "متاثر کن" ہو جاتی ہے، وہ واقعہ طرازی اور قصہ آفرینی ہے۔ عون و محمد کی روایت میں انھوں نے جو توسیع کی ہے، وہ اس کی مثال

ہے۔

"مرثیہ" تاریخ نہیں، تخلیقی آرٹ ہے۔ تاریخ بیشتر اپنی تفصیلات اور جزئیات میں ایک کاروان رنگ و بو ہوتا ہے جس میں ہر واقعہ کی سند مہیا نہیں کی جاسکتی۔ یہاں اس کا اثبات ضروری ہے جیسا کہ ساحر صاحب کے ذیلی نگارشوں (فٹ نوٹس) سے پتہ چلتا ہے۔ انھوں نے صرف مرثیہ نگاری ہی نہیں کی، تاریخ و سیر کا مطالعہ بھی کیا ہے اور یہیں سے نئے جذباتی حقائق اور تصوراتی وادیوں کی طرف ان کا ذہن مائل ہوتا ہے اور انھیں اپنی سوچ کے سفر میں نئی سچائیوں کی روشنی کو اپنے ساتھ لیئے رہنے پر آمادہ کرتا ہے۔

"علم اور علما" یا "فقہ و شمشیر" جیسے فکر انگیز عنوانات انھیں اس لیئے ملے کہ وہ سوچ کی نئی راہوں سے گزرے۔ انھوں نے کردار و افکار اور شعر و شخصیت کو ایک دوسرے سے ہم آہنگ کر کے بھی دیکھا ہے جسے ہم ساحر صاحب کی بیاض فکر میں مرثیہ کے حوالہ سے نئی حسیت کی نمود کہہ سکتے ہیں۔

روایت بڑی چیز ہے۔ وہ فکری اور نظری زنجیر کی وہ کڑی ہے جو موجود کو ماضی اور ماضی کو موجود سے ملاتی ہے، حالات و حادثات اور تخئیل و تمثیل کے مرئی و غیر مرئی سلسلوں کو اس طرح جوڑتی ہے کہ ہم بہت سے زمانوں میں جی سکتے ہیں اور "عصری حسیت" کی مرمریں چٹان ہمارے قدموں میں ہوتی ہے۔ ساحر صاحب نے اسی عصری حسیت کے سہارے مرثیہ کی روایت میں اضافے کیئے ہیں۔

حضرتِ قاسم و فاطمۃ الکبریٰ کی شادیٔ خانہ آبادی سے متعلق مرثیہ میں انھوں نے حضرتِ رسول مقبولؐ اور حضرتِ خدیجہؑ اور حضرتِ علی کرم اللہ وجہٗ کی حضرت خاتونِ جنت کے ساتھ شادیٔ کتخدائی کا جو تقریب نامہ پیش کیا ہے، وہ ایک اختراعِ فائقہ سے کم نہیں اور ان مقدس تقاریب کے جشن و جلوس کا جو انداز ہے، اس کا حسن اور اس میں فکر و فن کی نزاکتیں لائق شنید سے زیادہ قابل دید ہیں۔

یہ سب "آرٹ آف امیجینیشن" ہے اور اس میں میلادناموں کا پرتو بھی کہیں

کہیں جھلکتا ہے، لیکن روایت کی توسیع کے اس انداز میں سوچ سوچ کر قدم بڑھانے اور بڑھتے ہوئے قدموں کے سوچتے رہنے کا اسلوب دھوپ چھاؤں کا پُراسرار و پُرکشش سفرنامہ ہے۔ روایت کا سفر بھی ندیوں کے سفر ہی کی طرح ہوتا ہے جس میں تحرک و تسلسل اسی وقت اور بیشتر اسی حالت میں باقی رہتا ہے کہ نئے سرچشمے اور علاقائی ندیاں اور جوئبارین اس میں آکر ملتی اور اس کی روانی و رقصانی میں اضافہ کرتی رہیں۔

ساحر صاحب کے یہاں محاورات اور کہاوتوں میں بھی نظرداری کا اہتمام ملتا ہے مگر اس طرح نہیں جس کے لیئے یہ کہہ سکیں کہ وہ تہذیبی رونمائی کے لیئے اس طرزِ خاص کو اختیار کرتے ہیں، پھر بھی ایک خاص بے "لاگ پن" کے ساتھ جب ہم زبان کے ان سنہرے ٹکڑوں کو ان کے اندازِ گل افشانئ گفتار کے ساتھ جھلملاتے دیکھتے ہیں تو کچھ دیر کے لیئے لکھنؤ کی تہذیبی فضا میں خود کو سانس لیتا ہوا محسوس کرتے ہیں۔

مرثیہ کے ذریعہ زبان کا تحفظ بھی ہوا ہے اور توسیع بھی اور یہیں پہنچ کر روایت کے سلسلے یافت سے "بازیافت" کی طرف آگے بڑھتے ہیں۔ انھوں نے حسنِ بیان اور لطفِ زبان کے لیئے تشبیہ و استعارہ کا سہارا نہیں لیا، جدید اسلوب پیکر تراشی اور علامت نگاری سے بھی کوئی خاص دلچسپی نہیں لیکن ان جیسے ایک باکمال شاعر کی "تخلیقی حسیت" اس سے آزاد بھی نہیں رہ سکتی۔ دھنک جیسے ان رنگوں کو بھی ان کے یہاں شعری حسن آفرینیوں کے ساتھ دیکھا جا سکتا ہے۔ ایک موقع پر جہاں تلوار کی چمک ہے، اس کی ریشم جیسی تیز دھار سے جب تار نگاہ کے کٹنے کی بات سنتے ہیں تو ان کے حسنِ تلاش پر حیرت ہوتی ہے۔

ہمارے یہاں بعض تنقیدی اصطلاحات کے معنی کا تعین نہیں ہوا اور شاید اسی لیئے نہیں ہوا کہ ہر اچھے شاعر کے یہاں اس کی فکری اور فنی APPROACHES کے ساتھ یہ ریشم کی سی سرحدیں ٹوٹ جاتی ہیں اور تخلیق کا ایک نیا نمونہ سامنے آتا ہے۔ ان کے چند اشعار بلکہ مصرعوں کی طرف توجہ دلانا چاہوں گا:

کچھ اور قد جو بڑھے ، ذوالفقار ہو جائے

سوں کی تھاپ پہ دھمال رن میں پڑتی تھی

○○○

وہ توڑ پھوڑ مچائی کہ رن اجاڑ دیا

○○○

ہوائے صبح کی زد پر چراغ شام آیا چمک گئی جو یہ بجلی تو سر برسنے لگے

○○○

عظمتِ کردار جو آخری حد تک آ گئی رفتہ رفتہ یہ حسینؑ ابن علیؑ تک آ گئی

○○○

دیکھیئے اوجِ منیٰ سے گر بچشم آگہی کربلا ہے ایک تاریخِ تسلسل کی کڑی

○○○

معجزے یہ دیکھیئے کردار کی تعمیر کے
ایک آئنہ میں دونوں رخ ہیں اس تصویر کے

• مرثیہ تزئینی صنف نہیں، تحسینی صنف ہے۔ تحسین کا تعلق حسنِ بیان اور لطفِ زبان کے ساتھ جذبہ کے خلوص اور انسانی خوبیوں کی بازیافت سے ہے جن سے کردار کی تعمیر اور اقدار شناسی کے پیمانے میسر آتے ہیں۔ سورج کے قتل کے بعد شمعِ ماتم خانہ کو برق سے روشن کرنے کا مرحلہ بھی سامنے آتا ہے اور وہ بھی جس کے لیئے غالب نے کہا:

جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ دو شمعیں فروزاں ہو گئیں

مرثیہ کی روایت یہی شمع افروزی کی روایت ہے۔ صدیوں سے روشنی کے سفر کی یہ علامت چراغوں کی لڑی کی طرح برابر چلے جارہی ہے۔

چراغ سے چراغ جلتا ہے۔ مرثیہ بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں۔ ساحر صاحب

نے اپنے خاندان سے بھی بہت کچھ لیا ہے۔ میر انیس تو ان کے ایک معنی میں مرشد ہیں اس پر بھی ان کے ذہن نے اپنے لیئے بہت سے موڑ قبول کیئے ہیں اور وہ ان پر خود چراغ رکھتے ہوئے آگے بڑھے ہیں۔

انھوں نے ایک موقع پر زبان وادب میں فصاحت و بلاغت کے معیار "لکھنؤ اور دہلی" میں تلاش کیئے۔ وہ لکھنؤ کے ہیں، اس لیئے بڑی بات ہے کہ دہلی کی مرکزی حیثیت بھی ان کی نگاہ میں رہی ہے لیکن آج زبان و ادب کے معاملہ کو ان دبستانی حد بندیوں سے آزاد ہو کر دیکھنا چاہیئے۔

بیانیہ شاعری میں ایجاز و اختصار کی حدود کی پابندی ضروری نہیں۔ "کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیان کے لیئے" مرثیہ جیسی صنفِ شعر کا صحیح تقاضہ ہے لیکن انتخابیت کی طرف سے اب اتنی بے نیازی بھی آخر کیوں۔ بعض جگہوں پر اس کا احساس ہوتا ہے کہ شاید نظرِ ثانی سے نور نہیں پایا۔

پروفیسر ڈاکٹر شارب ردولوی
(جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی)

عصری مرثیہ اور ساحر لکھنوی

مرثیہ کے لیئے جدید و قدیم اور روایتی و غیر روایتی اصطلاحیں مجھے ہمیشہ ہی غیر ضروری سی محسوس ہوتی ہیں اس لیئے کہ مرثیہ صرف مرثیہ ہے اور اگر وہ مرثیہ نہیں ہے تو خواہ اسے جدید کا نام دیا جائے یا قدیم کا، روایتی کا یا کلاسیکی کا، وہ میری گفتگو کا موضوع نہیں ہے۔ ہر صنف سخن وقت کی ضرورتوں کے ساتھ وجود میں آتی ہے، مخصوص تہذیبی و سماجی تقاضے اس کے عناصر متعین کرنے میں معاون ہوتے ہیں اور یہی عصری تقاضے شاعر کی فکر کو کسی خاص سمت کی طرف لے جاتے ہیں۔ یہ ایک ایسا عمل ہے جو ہر صنف میں ہمیشہ جاری رہتا ہے اور جب کہیں یہ عمل رک جاتا ہے تو وہ صنف سخن ختم ہو جاتی ہے۔ اردو میں اس کی مثال قصیدہ اور واسوخت سے دی جا سکتی ہے۔ مرثیہ کے باقی رہنے کا بھی یہی سبب ہے کہ وہ ہمیشہ عصری تقاضوں سے ہم آہنگ رہا اور غم حسینؑ کے پردہ میں اس نے ہمیشہ ایک بہتر زندگی، برائیوں سے پاک معاشرہ اعلیٰ انسانیت اور بلند پایہ انسانی اقدار کا درس دیا۔ یہ صفات مرثیہ کا ایسا جزو ہیں کہ اس کے بغیر مرثیہ کا تصور ممکن نہیں خواہ وہ زمانی اعتبار سے قدیم مرثیہ ہو یا جدید۔ قدیم و جدید کا تعلق زمانہ سے تو قائم کیا جا سکتا ہے مرثیہ سے نہیں۔ مرثیہ تو ان اقدار حیات کا نام ہے جن کو پہچنوانے کے لیئے امام حسینؑ اور ان کے اعزا اور اصحاب

میدانِ کربلا میں شہید ہوگئے ۔ انھیں اقدار کا ذکر قلی قطب شاہ سے لے کر انیس و دبیر، اوج و تعشق، ذاکر و فاخر، جوش و آلِ رضا، رزم و نسیم، مہدی نظمی و ساحر وقت اور سماجی تقاضوں کی تبدیلیوں کے ساتھ کرتے رہے ہیں ۔ "جدید" کا تصور ذہن کو اس کے دوسرے پہلوؤں کی طرف لے جاتا ہے اس لیئے اس کے لیئے جدید سے بہتر اصطلاح عصری مرثیہ کی ہوگی اور جس کا تجزیہ اگر عصری تقاضوں اور میلانات کے تحت کیا جائے تو ہر عہد کے اہم مرثیہ نگاروں کے منفرد کارناموں کا بہتر طریقہ پر مطالعہ کیا جاسکتا ہے ۔

مرثیہ کے لیئے عصری تقاضوں کی بات بعض ذہنوں کو کھٹک سکتی ہے، اس لیئے مرثیہ کا بنیادی موضوع تاریخی المیہ ہے جس کے واقعہ یا کرداروں میں کسی طرح کی تبدیلی نہ شاعر کر سکتا ہے اور نہ سامع برداشت کر سکتا ہے ۔ اس کے باوجود انیس و دبیر کے مراثی کی مقبولیت کا ایک بہت بڑا سبب یہ تھا کہ انھوں نے اسے عصری تہذیب میں اس طرح ڈھال دیا تھا کہ سامع بھی اپنے کو اسی کا ایک کردار محسوس کرنے لگتا تھا اور ہر واقعہ کا چشم دید گواہ بن جاتا تھا ۔ اس کے بعد جوش نے اسے اپنے عصری تقاضوں میں ڈھالنے کی کوشش کی ۔ یہ مرثیہ کی تاریخ میں ایک بڑی تبدیلی تھی انھوں نے مجاہدینِ کربلا کے عزم و استقلال اور عزتِ نفس، ان کی جرأت و ہمت، بہادری و شجاعت اور ظلم و استبداد کی مخالفت کا احساس دلا کر اسی راستہ پر چلنے اور حق کی حمایت میں قربان ہو جانے، ظلم کو برداشت نہ کرنے اور غلامی کی زنجیروں کو توڑ کر پھینک دینے کا درس دیا:

مجروح پھر ہے عدل و مساوات کا شعار
اس بیسویں صدی میں ہے پھر طرفہ انتشار
پھر نائبِ یزید ہیں دنیا کے شہریار
پھر کربلائے نو سے ہے نوعِ بشر دوچار
اے زندگی، جلالِ شہِ مشرقین دے

اس تازہ کربلا کو بھی عزمِ حسینؑ دے
(حسینؑ اور انقلاب)

یہ عصری تقاضہ ہی تھا جس میں جوش کربلا کی ایک نئی تعریف پیش کرتے ہیں:

کوئی کہہ دے یہ حکومت کے نگہبانوں سے
کربلا اک ابدی جنگ ہے سلطانوں سے

انیس کے بعد یہ مرثیہ میں ایک نئی آواز تھی ۔ اس کے بعد اچانک محسوس ہوا کہ جیسے گردشِ وقت کی رفتار بہت بڑھ گئی ہو ۔ حالات تیزی سے تبدیل ہونے لگے ۔ ہر لمحہ ایک نیا منظر نامہ سامنے آنے لگا ۔ آزادی ملی، ملک تقسیم ہوگیا، بد اعتمادی، قتل و غارت گری، معاشی و تہذیبی بحران، ہجرت اور اس سے پیدا ہونے والے مسائل، زندگی ایک طوفان میں گھر گئی ۔ زندگی کے بارے میں نظریات اور جینے کے طریقے بدل گئے ۔ اس کے بعد ادبی نظریات اور اظہار میں بھی تبدیلی لازمی تھی ۔ مرثیہ پر بھی اس کا اثر پڑا ۔ نجم آفندی، رزم ردولوی، آلِ رضا، مہدی نظمی اور ساحر لکھنوی نے مرثیہ میں نئے فکری گوشے تلاش کیئے اور اس کے ذریعہ اسلامی تعلیم کو عام کرنے کی کوشش کی ۔ اس کی ضرورت اس لیئے پڑی کہ اس شکست و ریخت اور تیزی سے تبدیل ہوتی ہوئی قدروں میں انسانیت ان اعلیٰ اقدار سے دور جا پڑی تھی جس کا درس قرآن، اسلام اور واقعۂ کربلا نے دیا تھا ۔ جن مرثیہ گو شعراء نے اس سلسلہ میں بہت کام کیا، ان میں ساحر لکھنوی کا نام بہت اہمیت رکھتا ہے ۔

ساحر لکھنوی ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں جو برِ صغیر میں اپنے علم اور روشن خیالی کے لیئے مشہور ہے ۔ شاعری ان کی خاندانی وراثت ہے، یہی وجہ ہے کہ اردو مرثیہ کو جس فکرِ تازہ سے انھوں نے مالا مال کیا ہے وہ انھیں کا حصہ ہے ۔

ساحر لکھنوی اردو مرثیہ گوئی کی روایت میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں ۔ انھوں نے بہت سے مرثیے لکھے ہیں ۔ ان کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کا ہر مرثیہ واقعۂ کربلا کو ایک نئے انداز، نئے رخ اور نئی فکر کے ساتھ پیش کرتا ہے ۔ ان کے یہاں واقعۂ کربلا

کی تاریخ اور مرثیہ کی روایت کی اپنی ایک اہمیت ہے، لیکن اس کے باوجود ان کے یہاں حسینیت اور پیغام حسینی کو پیش کرنے پر زیادہ زور ملتا ہے۔ "آیات درد" میں ان کے سات مرثیے شامل ہیں۔ اس سے قبل ان کا ایک مرثیہ "علم اور علماً" علیحدہ کتابی صورت میں شائع ہو چکا ہے جو شخصی مراثی کی تاریخ میں ایک اضافہ ہے۔

ساحر کے مرثیوں کی سب سے بڑی خوبی ان کی ادبیت اور زبان پر ان کی قدرت ہے۔ عالمانہ مسائل کو نظم کر دینا اتنا بڑا کام نہیں ہے۔ بات تو اس شعری جمالیات کی ہے جو فلسفیانہ خیالات یا علمی مسائل کو شعر میں ڈھال دے اور انھیں پڑھتے وقت یہ نہ محسوس ہو کہ منطق و حکمت کا سبق پڑھا جا رہا ہے بلکہ اس سے جمالیاتی حظ بھی ملے، مسرت کا احساس بھی ہو اور جذبے کا ارتفاع بھی۔ ساحر کو زبان اور اظہار پر ایسی قدرت حاصل ہے کہ وہ مشکل سے مشکل مسئلہ کو بڑی خوب صورتی کے ساتھ نظم کر دیتے ہیں۔ مرثیہ "علم اور علماً" میں علم کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

جہانِ فکر میں انسانیت کی آس ہے علم
بشر کی عظمت و توقیر کی اساس ہے علم
قبائے فکر و ہنر، عقل کا لباس ہے علم
ہے ناشناسِ خدا جہل، حق شناس ہے علم
کبھی یہ دامنِ گل ہے، کبھی گلاب ہے یہ
کبھی کتاب، کبھی صاحبِ کتاب ہے یہ

یہ مصرعے بظاہر بہت صاف اور سادہ ہیں لیکن جیسے جیسے ان پر غور کرتے جائیے، ان کی معنوی تہیں کھلتی جاتی ہیں اور علم کی وسعت کا احساس بڑھتا جاتا ہے۔ بشر کی عظمت و توقیر کی اساس کہہ کر انھوں نے انسان کی تمام کامیابیوں اور کامرانیوں کا جس طرح احاطہ کیا ہے، وہ بے مثال ہے۔ ساحر نے اسی مرثیہ میں ایسے عالموں کا بھی ذکر کیا ہے جو حریصِ دنیا اور موقع پرست ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ہر زمانہ میں ایسے لوگ مل جائیں گے جنھوں نے شہنشاہوں اور سلاطین کے اشاروں پر ناجائز کو جائز قرار دے دیا

اقبال نے اس کی شکایت اس طرح کی کہ

احکام ترے حق ہیں مگر اپنے مفسر
تاویل میں قرآں کو بنا سکتے ہیں پاژند

اقبال نے بڑے بلیغ اشارہ میں ساری باتیں کہہ دیں۔ایسے مفسرین اور مبلغین ہر عہد میں ظالم کی قوت بنتے رہے ہیں۔ساحر نے ایک بند میں ایسے ہی لوگوں کی تصویر کشی کی ہے جس میں عہدِ حاضر کی تصویر بھی صاف نظر آتی ہے:

حریصِ دولتِ دنیا ، مریضِ حرص و ہوس
حصول زر کے لیئے وقف ایک ایک نفس
ملوکیت کی غلامی میں ان کو پیش نہ پس
کھلی فضاؤں سے بہتر انھیں جڑاؤ قفس
ملے جو شمر سے "زر" اس کو بے قصور کہیں
یزیدِ وقت پکارے تو "جی حضور" کہیں

ساحر نے دوسرے مراثی بھی بعض موضوعات کو لے کر لکھے ہیں۔عصری مرثیے عام طور پر براہِ راست واقعۂ کربلا کے بجائے کسی موضوع سے شروع ہوتے ہیں کلاسیکی مرثیوں میں بالعموم شعراچہرہ نظم کرنے میں کبھی صبح کا سماں، سفر کا حال، رات کی ہیبت ناکی، طلوعِ آفتاب وغیرہ کا منظر نظم کیا کرتے تھے اور اس کے بعد گریز کے بند سے مرثیہ کے اصل موضوع واقعۂ کربلا پر آجاتے تھے اور پھر عناصرِ مرثیہ کی جو تقسیم کی گئی ہے، اس کے مطابق مرثیہ مکمل کرتے تھے لیکن عصری مرثیہ کسی خاص موضوع سے شروع ہوتا ہے اور پھر رفتہ رفتہ اس علمی یا تاریخی بحث کو واقعۂ کربلا تک لے جاتا ہے۔عصری مرثیہ میں اس تبدیلی کے کئی سبب ہو سکتے ہیں جس پر تفصیلی گفتگو کا یہ موقع نہیں ہے، پھر بھی یہ عرض کردوں کہ اس کا ایک سبب یہ ہے کہ کلاسیکی مرثیہ کی پیروی کر کے عصری مرثیہ نگار اپنی انفرادیت قائم نہیں کر سکتا تھا اس لیئے کہ انیس و دبیر نے اس میں کوئی گنجائش باقی نہیں رکھی تھی۔وہ کچھ بھی کہے لیکن دبیر کی کوئی ہیئت

یا انیس کا کوئی مصرع ذہن میں کوندنے لگتا تھا اس لیئے ضروری تھا کہ وہ مرثیہ کے لیئے نئی فضا بندی کرے اور اپنے سامع کو اس فضا سے علیحدہ کر دے جو ذہنوں کو انیس و دبیر کی طرف لے جاتی تھی ۔ دوسرا ایک اہم سبب اور بھی ہے ۔ حالات کی تبدیلی، اعلیٰ معیار کی پستی اور معاشرہ کے بکھراؤ سے مرثیہ کی مقبولیت پر حرف آیا ۔ مجالس میں مرثیہ کے مقابلہ میں ذاکری کو زیادہ مقبولیت حاصل ہو گئی ۔ ذاکر واقعۂ کربلا ضرور بیان کرتا تھا لیکن وہ قرآن مجید کی کسی آیت یا حدیثِ رسولؐ کو اپنا موضوع بناتا تھا، اس کی علمی گفتگو اور دلائل دلوں پر زیادہ اثر کرتے تھے ۔ اس لیئے مرثیہ کو دوبارہ وہی مرتبہ دینے کے لیئے شعرا نے اسی طرح کے علمی مباحث کو سرنامہ بنایا، یہ عصری تقاضہ بھی تھا اور شاعر کی اپنی انفرادیت کی شناخت بھی ۔

ساحر لکھنوی کے تمام مراثی کسی نہ کسی موضوع سے متعلق ہیں ۔ "آیاتِ درد" کا پہلا ہی مرثیہ "قرآن اور وارثانِ قرآن" ہے جسے تخلیقِ کائنات سے شروع کیا ہے ۔ تخلیقِ کائنات سے واقعۂ کربلا تک کا سفر آسان نہیں لیکن ۱۱۴ بند میں ساحر نے جس طرح قرآن کی اہمیت، وارثانِ قرآن کی فضیلت اور واقعۂ کربلا کا احاطہ کیا ہے، وہ اظہار و بیان پر ان کی گرفت کی نشان دہی کرتا ہے ۔ جنگِ کربلا دراصل تحفظِ قرآن کی جنگ تھی اس لیئے یہاں اس موضوع کی بلاغت اور بڑھ جاتی ہے ۔ ساحر نے اس مرثیہ کی جس طرح ابتدا کی ہے، وہ بھی قابلِ توجہ ہے:

جب کبریا نے خلق کیا کائنات کو
صبحِ وجود دی عدم شبِ صفات کو
شمس و قمر کا نور دیا شش جہات کو
موڑا سوئے زمیں نگہِ التفات کو
آدم کو حدِ خلد سے آزاد کر دیا
پھر ان کو اس زمین پر آباد کر دیا

دوسرے مصرع میں کس خوب صورتی کے ساتھ وجود کو صبح اور عدم کو شب صفات کہہ

کر اس کے بارے میں سب کچھ کہہ دیا ہے۔ اردو میں ایسی مثالیں مشکل سے کہیں نظر آئیں گی۔ اسی طرح قرآن ایک ایسا صحیفہ ہے جو زندگی کے تمام مسائل پر محیط ہے۔ جیسے جیسے انسانی علم ترقی کرتا جارہا ہے، اس پر رموزِ قرآنی روشن ہوتے جارہے ہیں۔ ساحر نے کئی بند میں قرآن کی خوبیاں نظم کی ہیں۔ ایک بند میں کہتے ہیں:

یہ کشتیٔ نجات بھی ، بادِ مراد بھی
اس میں حقوقِ رب بھی ، حقوق العباد بھی
عرفانِ حق بھی ، مسئلۂ اقتصاد بھی
پیغامِ امن بھی ہے ، پیامِ جہاد بھی
مدحِ حرم بھی اس میں ہے ، قدحِ کنشت بھی
دوزخ کا ذکر بھی ہے ، نویدِ بہشت بھی

اور پھر یہ کہہ کر اس کا احاطہ کیا ہے کہ کُل کائنات اس کی حدوں میں سمائی ہے۔ اس کے بعد وارثانِ قرآن کی فضیلت قرآن اور آیاتِ قرآن ہی کے حوالہ سے نظم کی ہے اور حضرتِ علی اصغر کا سراپا تو بڑے عجیب انداز سے نظم کر دیا ہے۔ یہ بات تمام ذاکر مجلسوں میں پڑھتے رہے ہیں اور مرثیہ گو شعرا نے نظم کیا ہے کہ امام حسینؑ دھوپ کی شدت سے حضرتِ علی اصغر کو بچانے کے لیئے عبا کا دامن ڈالے ہوئے جب میدان جنگ میں لے کر آئے تو لوگ سمجھے کہ حسینؑ قرآن لے کر آرہے ہیں۔ ساحر اس موقع پر لکھتے ہیں:

روکے قدم جو رن میں شہِ خاص و عام نے
دامن عبا کا اپنی ہٹایا امام نے
منظر عجیب دیکھا یہ افواجِ شام نے
قرآں نہیں ہے ، آیتِ قرآں ہے سامنے
بچہ ہے ، عام بچوں کا جس میں چلن نہیں
گو تشنہ لب ہے پھر بھی جبیں پر شکن نہیں

• والشمس • جس کی شان میں وہ روئے دل نشیں
• والفجر • جس کو چوم لے ، پُر نور وہ جبیں
• واللیل • جس کا حسن ہے ، آنکھیں وہ سرمگیں
• والعصر • جس کی کھائے قسم ، وہ رخِ حسیں

دیکھا تو غیر قائلِ قرآن ہو گئے
حیران اک نظر میں مسلمان ہو گئے

• فقہ و شمشیر • بھی ساحر لکھنوی کا ایک بہت اہم مرثیہ ہے اور اپنے موضوع کے لحاظ سے بے حد مشکل ہے۔ جب تک کوئی اصول دین اور فروعِ دین پر پوری دسترس نہیں رکھتا، اس کے لیئے اس موضوع پر اظہارِ خیال ممکن نہیں ہے۔ فقہ کی تعریف تو لغات کی مدد سے بیان کی جا سکتی ہے لیکن اسے مرثیہ کی بنیاد بنانا اور شمشیر سے اس کا رشتہ جوڑنا آسان نہیں ہے۔ یہ مرثیہ اگر ایک طرف ساحر کے علم کی نشان دہی کرتا ہے تو دوسری طرف شعری اظہار پر ان کی قدرت کی۔ اس مرثیہ میں ساحر لکھنوی نے علم و فقہ کی جس طرح تعریف کی ہے، وہ یقیناً قابلِ تعریف ہے۔ اس پورے مرثیہ کو رسول اللہ صلعم کے اس قول کہ انا مدینۃ العلم و علیؑ بابھا کی روشنی میں پڑھیئے تو ایک نیا لطف آتا ہے۔

مرثیہ حمد و شکر اور اپنے لیئے دعا سے شروع ہوتا ہے:

تو ہی بس نقش گرِ لوح و قلم ہے یا رب
تجھ سے ہے علم جو بندوں کا بھرم ہے یا رب

اور اس کے بعد پانچویں بند سے علم کی تعریف اور اہمیت اور حضرتِ علیؑ سے علم کا تعلق بڑے مدلل اور دل کش انداز میں نظم کیا ہے۔ علم کے بارے میں یہ دو بند ملاحظہ ہوں۔

علم تنویرِ ازل ، رحمتِ غفار ہے علم
جنسِ عرفاں کے لیئے درہم و دینار ہے علم
قامتِ فن کے لیئے جبّہ و دستار ہے علم

نوعِ انساں کے لیئے عقل کا معیار ہے علم
عقل بے علم نہ بینش ہے نہ دانائی ہے
علم سے عقل کی کونین میں دارائی ہے
علم لوح و قلم کاتبِ تقدیر بھی ہے
علم فانوس بھی ہے، نور بھی تنویر بھی ہے
علم تخئیل بھی، تقریر بھی، تحریر بھی ہے
علم اعزاز بھی، انعام بھی، توقیر بھی ہے
منزلِ کُن میں انھوں نے جو قدم رکھا ہے
علم نے حضرتِ آدم کا بھرم رکھا ہے

اس کے بعد علم اور حضرتِ علیؑ سے تعلق پر کئی بند لکھے ہیں یہاں صرف ایک بند پیش کر رہا ہوں۔ایک ایک مصرع پر غور کیجیئے کہ ساحر نے اس میں کیسے کیسے گوشے پیدا کیئے ہیں:

علم اک رتبۂ عالی ہے اور اعلیٰ ہیں علیؑ
علم اذہان کی صحت ہے، مسیحا ہیں علیؑ
علم آباد ہے جس میں، وہی دنیا ہیں علیؑ
علم مولائی ہے اور علم کے مولا ہیں علیؑ
آپ کے در پہ ملک شاد بھی، آباد بھی ہیں
آپ جبرئیل کے مولا بھی ہیں، استاد بھی ہیں

علم کی تعریف بیان کرنے کے بعد ساحر نے فقہ کی طرف گریز کیا ہے اور یوں تو فقہ کی تعریف و تفسیر میں اور اس کی اہمیت میں انھوں نے بہت سے بند لکھے ہیں لیکن ایک مصرع میں جس طرح انھوں نے فقہ کی تعریف کا احاطہ کیا ہے، وہ انھیں کا حصہ ہے، یعنی "فقہ ہے شرع کے ماخذ کا مکمل ادراک"۔

فقہ اور شمشیر میں بظاہر کوئی تعلق نہیں ہے اور یہ بہت مشکل کام تھا کہ وہ

غیر متعلقہ چیزوں میں ربطِ ظاہری و معنوی بھی پیدا کیا جائے اور اس پر پورے مرثیہ کی عمارت تعمیر کی جائے۔ دیکھیئے، ساحر کس طرح ایک گریز کے ذریعہ فقہ و شمشیر میں ربط پیدا کرتے ہیں۔ یہ صرف ان کا شاعرانہ کمال فن نہیں بلکہ ان کی عالمانہ نکتہ رسی کی بھی مثال ہے:

فقہ کی رو سے جہاد ایک دفاعی تدبیر
ظلم سے اس کا اٹھایا نہیں مذہب نے خمیر
جارحیت کے خلاف اس کی بڑی ہے توقیر
اس کو درکار ہے بازوئے قوی اور شمشیر
جنگ بے اسلحہ ہوگی تو اجل لازم ہے
فقہ کے علم کو شمشیر عمل لازم ہے

فقہ و شمشیر کے رشتے کی علیؑ ہیں وہ مثال
جن کا دونوں پہ ہے قبضہ بہ حد اوج و کمال
بزم میں موج صبا، رزم میں شمشیر جلال
سرِ منبر وہ سلونی، سرِ میدان وہ قتال
بزم بھی ان کا حشم، رزم بھی توقیر ان کی
فقہ بھی بلک ہے، شمشیر بھی جاگیر ان کی

ان تمام جدت طرازیوں کے باوجود ساحر کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے مرثیہ کی کلاسیکی روایت کا احترام بھی کیا ہے اور اسے اپنے مرثیوں میں برقرار بھی رکھا ہے۔ ان کے مرثیوں میں سراپا بھی ہے، کردار نگاری بھی ہے، رخصت بھی ہے، تلوار کی تیزی و صفائی بھی گھوڑوں کی سرعت اور جست و خیز بھی، جنگ و جدل کی گرمی اور شدت بھی اور شہادت کی رقت انگیزی بھی۔ انھوں نے مرثیہ کے لیئے جس موضوع کا بھی انتخاب کیا، اس کے نظم کرنے میں اس کا خیال رکھا کہ مرثیہ صرف ایک موضوعاتی نظم ہو کر نہ رہ جائے۔ یہ ان کی خوبی ہے کہ ان کے مرثیوں کا دوسرا حصہ جو مرثیے کو مرثیہ بناتا

ہے، کمزور نہیں ہونے پاتا۔ مرثیہ میں جنگ کی جو اہمیت ہے، اس کا اندازہ مرثیہ کے قاری کو بخوبی ہے اور مرثیہ گو شعراء نے جنگ کو نظم کرنے میں اپنی پوری شعری صلاحیت صرف کر دی ہے۔ ساحر نے بھی جنگ کو بڑے اہتمام سے نظم کیا ہے۔ "کربلا اور عصرِ جدید کی رہبری" کا یہ بند ملاحظہ کیجیے:

تحتِ دل حسنؑ کی وہ تیغ آزمائیاں
باطل نے پہلے دیکھی نہ تھیں یہ لڑائیاں
شمشیر کی ادھر جو دکھائیں صفائیاں
توڑیں اُدھر سپر سے کسی کی کلائیاں
پٹخا کسی کو ہاتھ گریباں میں ڈال کے
پھینکا کسی کو نوکِ سناں پر اچھال کے

تلوار کی تعریف شعراء نے اس اس طرح سے نظم کی ہے کہ اس میں کسی نئی بات کے کہنے کی گنجائش نہیں چھوڑی۔ آج بھی تلوار کا ذکر آتے ہی انیس و دبیر کے نہ جانے کتنے بند ذہن میں گردش کرنے لگتے ہیں لیکن ساحر نے اس میں بھی ایک پہلو پیدا کر ہی لیا۔ تلوار کی تعریف میں ان کا ایک بند دیکھیے۔ مجھے یہ بات کہیں اور نظر نہیں آئی یہاں جنگ میں عون و محمدؑ کی تلواریں چمک رہی ہیں۔ ان کی عمریں ذہن میں رہیں تو لفظوں کا انتخاب زیادہ لطف دے گا:

چمک دکھاتیں تو خیرہ نظر یہ چھینتے تھے
یہ کون دھوپ میں چمکا رہا ہے آئینے
بلند ہوتیں تو کوندے سے وہ لپک جائے
چمک جو چرخ پہ جاتی ملک یہ بول اُٹھتے
فلک کی گردشیں کیا انقلاب لاتی ہیں
زمیں سے بجلیاں اب آسماں پہ آتی ہیں

اسی طرح گھوڑے کی تعریف میں ایک بند ملاحظہ کیجیے:

ایڑ دی رہوار کو شہ نے تو بجلی بن گیا
یہ ہوا سے تیز سوئے لشکرِ دشمن گیا
مثلِ صرصر جب صفوں میں اڑ کے یہ زن زن گیا
اس کا شملہ، اس کا خود اور اس کا پیراہن گیا
اڑ کے مرکب کے سموں سے گرد اتنی چھا گئی
فوج میں اک شور تھا، چھپ جاؤ، آندھی آگئی

میں نے کوشش کی ہے کہ بہت زیادہ مثالیں نہ دی جائیں پھر بھی مرثیہ میں بغیر مثال کے کام نہیں چلتا۔یہاں میں نے صرف وہی بند نقل کیئے ہیں جن کا پیش کرنا ضروری تھا اور جن سے ساحر کی مرثیہ نگاری کی اہمیت پر روشنی پڑتی ہے لیکن اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ صرف یہی بند نقل کے قابل تھے۔ ساحر کے یہاں اس طرح کی بہت سی مثالیں مل جائیں گی۔انھیں زبان پر اس قدر قدرت ہے کہ وہ مشکل سے مشکل مسئلہ کو بڑی روانی اور فصاحت کے ساتھ نظم کر دیتے ہیں۔ میں نے شہادت اور بین کے بند بھی مثالوں میں نہیں دیئے ہیں۔ ساحر نے مرثیہ کے رثائی حصہ کو بھی بڑی خوبی کے ساتھ نظم کیا ہے۔ایسی جذبات نگاری سے سے کام لیا ہے کہ سننے والے کی آنکھیں نم ہوئے بغیر نہیں رہ سکتیں۔مرثیہ میں جذبات نگاری کا یہ حصہ ساحر کے یہاں صرف آخر میں شہادت کے ردِ عمل کے طور پر نہیں آتا بلکہ مرثیہ کے بیشتر حصہ پر پھیلا ہوا ہے جو دل کے تاروں میں ارتعاش پیدا کرتا رہتا ہے۔ ساحر کی مرثیہ گوئی کی یہ ایک بہت بڑی خوبی ہے۔اپنی انھیں خوبیوں کی وجہ سے ہم عصر مرثیہ گویوں میں وہ صرف ایک منفرد مقام ہی نہیں رکھتے بلکہ آنے والی نسلوں کے لیئے ایک مشعلِ راہ کی بھی حیثیت رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر اکبر حیدری کشمیری

"آیاتِ درد"

"آیاتِ درد" حضرتِ ساحر لکھنوی کے معرکہ آرا مرثیوں کا مجموعہ ہے جو کراچی پاکستان میں خوب صورت انداز میں شائع ہوا۔ ساحر کی ذات محتاجِ تعارف نہیں ہے۔ وہ لکھنؤ کے مشہور خاندان اجتہاد علامہ حضرت غفراں مآب کے خانوادہ کے چشم و چراغ اور نوابینِ زہاء کی قابل فخر یادگار ہیں۔ موصوف کے پردادا نواب سید اصغر حسین تخلص "فاخر" کی کوٹھی پر اس صدی کی ابتدا میں مسلسل معرکہ آرا مشاعرے ہوا کرتے تھے جن میں لکھنؤ کے بڑے بڑے نامی گرامی شعرا علی میاں کامل، مشاق لکھنوی مظہر لکھنوی مرزا محمد ہادی رسوا اور نوبت رائے نظر وغیرہ اپنا کلام سنایا کرتے تھے۔ اس طرح ساحر لکھنوی خاندانی شاعر ہیں۔ ان کے والدِ گرامی حضرتِ مصور لکھنوی بھی ایک کہنہ مشق شاعر تھے۔

"آیاتِ درد" کا ہم نے بخوبی مطالعہ کیا۔ زبان کی سادگی اور شوکتِ الفاظ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا میر انیس اور مرزا دبیر کی روح نے ان میں حلول کیا ہے۔ بعض مرثیوں کے چہروں سے ایسا لگتا ہے کہ ان کے منہ میں جوش کی زبان بھی کار فرما نظر آتی ہے جس سے زورِ بیان اور قوتِ تخیل کے پھول جھڑتے ہیں۔ یہ خوبیاں مصنف کی قادر الکلامی پر دال ہیں۔

"آیاتِ درد" کے ہر مرثیہ کی ابتدا میں اردو کے جن معتبر ناقدین کے تبصرے

شامل ہیں، ان کے نام یہ ہیں: سید محمد باقر شمس، سید وحید الحسن ہاشمی، پروفیسر مظفر حسن ظفرجون پوری، پروفیسر شبیہ الحسن، پروفیسر ذوالفقار حسین، ڈاکٹر شکیل نوازش رضا اور پروفیسر محمد رضا کاظمی۔

ساحر نے مرثیوں کے موضوع بھی قرار دیئے ہیں۔ ذیل میں ہر مرثیہ کا عنوان اور مطلع پیش کیئے جاتے ہیں۔

عنوان	مطلع	بند
(۱) قرآن اور وارثانِ قرآن	جب کبریا نے خلق کیا کائنات کو	۱۱۴ بند
(۲) فقر و شمشیر	تو ہی بس نقش گر لوح و قلم ہے یارب	۱۱۲ بند
(۳) مداحی و پیروی	خدا کی حمد سے سرنامۂ کتابِ سخن	۱۱۴ بند
(۴) کعبہ سے کربلا تک	خدا کا شکر کہ مجھ کو یہ دن دکھایا ہے	۴۸ بند
(۵) کردارِ حسینؑ کی تشکیل اور اسلاف	پاک ہے وہ ذات جس نے یہ جہاں پیدا کیا	۱۱۲ بند
(۶) کربلا اور عصرِ جدید کی رہبری	جب روشناس نورِ عمل سے نظر ہوئی	۹۷ بند
(۷) عروسِ کربلا	تمام حمد و ستائش ہے کبریا کے لیئے	۱۱۴ بند

ساحر کے مرثیے EPIC کے دائرہ میں آتے ہیں اور ایپک کو اردو میں رزمیہ کہتے ہیں جو متنوع مضامین کے اعتبار سے تمام اصنافِ سخن میں افضل ترین قسم کی شاعری مانی جاتی ہے۔ ہمارے ناقدینِ ادب نے رزمیہ کی تعریف کو بہت ہی محدود کر دیا ہے۔ ان کے نزدیک رزمیہ وہ شاعری ہے جس میں میدانِ جنگ کا نقشہ پیش کیا جاتا ہے۔ دراصل ایپک (رزمیہ) اس بیانیہ نظم کو کہتے ہیں جس میں شاعر کسی تاریخی کردار کو پیش کرتا ہے جس کا مقصدِ حیات عظیم اور ارفع ہو، وہ کسی بلند نصب العین کی بقا کے لیئے اپنی جان کا نذرانہ بھی دیتا ہے۔ ایسا شخص مذہبی اہمیت کا بھی حامل ہوتا ہے۔ جو کردار اس کے ساتھ ہوتے ہیں، وہ TRUE TO LIFE یعنی گوشت و

پوست کے مالک ہوتے ہیں۔

ارسطو جس کو دنیا نے فنِ تنقید کا بانی قرار دیا ہے، اس نے ایپک کے لیئے کچھ اصول بھی مقرر کیئے ہیں۔ ان اصولوں سے کوئی بھی شخص انکار نہیں کر سکتا۔ جس واقعہ کو رزم نگار نظم کرتا ہے، وہ تین حصوں پر مشتمل ہونا چاہیئے: ۱) ابتداً (BEGINNING) 2) درمیانی کڑیاں (MIDDLE) اور 3) خاتمہ (END)۔ اگر یہ واقعہ ایک ہی نشست میں ختم بھی ہو جائے تو بھی رزمیہ نظم کہلائے گی۔ ارسطو کے الفاظ کا ترجمہ یہ ہے:

"THIS CONDITION (OF BEING WITHIN A SINGLE VIEW) WILL BE SATISFIED BY POEMS ON A SMALLER SCALE THAN THE OLDER EPICS."(1)

ارسطو نے رزمیہ (ایپک) کے لیئے اور بھی شرطیں مقرر کی ہیں، ان میں سے چند یہ ہیں: REVERSAL OF INTENTION (انقلاب) یعنی ارادوں میں وہ تبدیلیاں جو خلافِ امید وقوع پذیر ہوتی ہیں۔ پہچان (RECOGNITION) وہ تبدیلی ہے جس کے باعث کسی نامعلوم واقعہ کے آثار قبل از وقت ظاہر ہوں۔ انگریزی میں مشہور مقولہ ہے:

"COMING EVENTS CAST THEIR SHADOWS BEFORE."

المیہ سانحات (TRAGIC INCIDENTS): سانحہ سے ارسطو کا مفہوم ہر جاں گداز اور الم ناک واقعہ سے ہے۔ مثال کے طور پر موت کا منظر، جسمانی اذیت اور دوسرے لرزہ خیز وقعات۔

(1) THE GREAT CRITICS BY JAMES HARRY AND EDDWINFIELD, PARKS LINE 15, P.P. 55.

ارسطو نے طرزِ ادا کے لیئے مبالغہ لازم قرار دیا ہے۔ اس سے نظم کی اثر پذیری نمایاں ہو جاتی ہے، مبالغہ سے قرینِ قیاس ناممکنات کو خلافِ قیاس ممکنات پر ترجیح دی جاتی ہے، جنگ کا عنصر بھی ضروری ہے۔ ذیل میں ارسطو کے مقرر کردہ اصولوں کے تحت ساحر لکھنوی کی ایک رزمیہ نظم (مرثیہ) کا جائزہ مختصر ترین الفاظ میں پیش کیا جاتا ہے۔ مطلع ہے:

جب روشناس نورِ عمل سے نظر ہوئی (۹۷ بند)

ایسا ہی ایک مرثیہ میر انیس کا ہماری نظر سے گزرا ہے۔ مطلع یہ ہے:

جب کربلا میں داخلۂ شاہِ دیں ہوا

مرثیہ حضرت عباسؑ کے حال میں ہے اور وہی ہیرو بھی ہیں۔ اس میں ۲۴۴ بند ہیں۔ جو مضامین انیس نے بیان کیئے ہیں، وہی کماحقہ ساحر نے بھی باندھے ہیں۔ ساحر نے امام حسینؑ کی شہادت نظم کی ہے اور وہی ہیرو بھی ہیں۔ امام حسینؑ کا مقصد یہ تھا کہ گھر کا گھر تباہ ہو جائے، مال و اسباب لٹ جائے، خیموں میں آگ لگا دی جائے، عزیز و اقارب موت کے گھاٹ اتارے جائیں، رسول زادیوں کے سروں سے چادریں چھن جائیں لیکن دینِ اسلام پر آنچ نہ آنے پائے۔

شاعر نے مرثیہ میں ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ امام حسینؑ نے اسلام کو ایک فاسق و فاجر ملوکیت سے بچانے کے لیئے اپنا گھر (مدینہ) چھوڑ دیا۔ وہ کوفہ جانا چاہتے تھے لیکن دورانِ سفر راستہ امیہ کے خلاف روکا گیا اور وہ واردِ کربلا ہوئے۔ یہاں خیمے دریا کے قریب نصب کروائے۔ دشمن ہزاروں کی تعداد میں آن پہنچا اور اس نے خیمے ہٹوانے کے لیئے کہا۔ خیمے ہٹائے گئے۔ دشمن زر کا غلام تھا۔ اس کے پاس کوئی اصول نہ تھا اور جنگ کرنے میں پہل کی۔ امام حسینؑ کے سپاہی مارے گئے اور آخر میں وہ بھی نہایت ہی بے دردی کے ساتھ قتل کیئے گئے۔

نظم میں تینوں اجزا موجود ہیں یعنی ابتدا، درمیانی حصہ اور خاتمہ۔

ابتدا: ابتدا میں بیان ہوا ہے کہ حسینؑ کوفہ جانے کا ارادہ کر رہے تھے لیکن

حالات نے ایسا مجبور کیا کہ کربلا میں اترنا پڑا۔ شاعر کہتا ہے:

اترا ہے ایسے دشت میں یہ حق کا کارواں
حدِ نظر کے پار بھی سبزہ نہیں جہاں
اس دشتِ بے گیاہ میں ہیں نخل بے نشاں
جب نخل ہی نہیں ہیں تو سایہ بھلا کہاں
بے سایہ دشت میں کوئی کیونکر بسر کرے
ایسی جگہ گزر سے بھی انساں حذر کرے

امام حسینؑ کے ساتھ اہل حرم اور اطفال بھی تھے، اس لیئے انھیں پانی کی تلاش بھی تھی اور دریا کے قریب خیمے لگوادیئے تھے:

صحرا میں دیکھ کر لبِ دریا کی یہ فضا
ساحل پہ آ کے قافلہ اہلِ دل رکا
اترے مسافرانِ رہِ منزلِ وفا
خیمے لگائے گھاٹ پہ بڑھ بڑھ کے جا بجا
دل مطمئن کہ دشت میں سایہ نصیب ہے
اس پر خدا کا شکر کہ پانی قریب ہے

درمیانی حصہ: اتنے میں دشمن کا سیلاب امنڈ آتا ہے اور قافلۂ حق کے خیمے یہاں سے ہٹانے کو کہتا ہے۔ یہ اس کا پہلا کافرانہ اقدام تھا جو اخلاقیات یا کسی قانون کے دائرہ میں نہیں آتا ہے۔ دنیا یہ اصول تسلیم کر چکی ہے کہ جو کسی بے نام ونشان مقام پر پہلے پہنچتا ہے، وہ اپنا جھنڈا وہاں گاڑ دیتا ہے۔ دشمن کی اس بے جا مداخلت پر امام حسینؑ کے علم بردار عباسؑ کو غیظ آتا ہے کہ کس کی جرأت ہے جو ہمیں یہاں سے ہٹا سکے۔ اگر ان کی بڑی بہن نبی زادی جناب زینبؑ عباسؑ کا غصہ ٹھنڈا نہ کرتیں تو لڑائی کی نوبت آجاتی خاندان رسالت مآب کا یہ مسلمہ اصول تھا کہ

کچھ بھی ہو، ہم کو جنگ میں سبقت روا نہیں

آخر عباسؑ نے زینبؑ کے سمجھانے پر خیمے یہاں سے ہٹائے اور پھر لشکرِ حسینی ایک ایسے مقام پر فروکش ہوا جہاں نہ پانی تھا اور نہ کوئی سایہ ہی۔ عرفِ عام میں یہی جگہ ارضِ کربلا تھی۔ یہاں ہُو کا عالم تھا۔ ہر طرف دھوپ ہی دھوپ اور اس پر گرد و غبار چھایا ہوا تھا۔ بقول شاعر:

وہ کربلا کی دھوپ ، وہ گرمی ، وہ قحطِ آب
وہ بے کسوں کی پیاس ، وہ موجوں کا اضطراب
چھپتا ہوا وہ گرد کے پردوں میں آفتاب
گھبرا کے اس تپش سے بگولوں کا پیچ و تاب
وہ گرد اٹھی کہ چھا گئی دنیا جہان پر
چڑھنے لگے زمیں کے طبق آسمان پر

درمیانی حصہ میں شاعر نے جدت پیدا کر کے اپنے کمال فن کا مظاہر کیا۔ وہ کربلا کو کرب و بلا اور قتل گاہِ حسینؑ کے ماورا کچھ اور بھی سمجھتا ہے۔ اس کی نظر میں کربلا بادۂ عرفان کی مستی، درس گاہِ عشق و انسانیت، شرافتِ انسان کی آماج گاہ اور آزادیٔ خیال کا سرچشمہ ہے۔ شاعر کا ذیل کا بند قابل ذکر ہے:

آئینۂ جمال شہادت ہے کربلا
حسن رخ حیات کی زینت ہے کربلا
انسان کا شعورِ قیادت ہے کربلا
شبیر سے ملی جو وہ دولت ہے کربلا
آزادیٔ بشر کی ضمانت اسی سے ہے
انسان کے لہو میں حرارت اسی سے ہے

سات محرم کو دشمن نے آل رسولؐ پر پانی بند کر دیا اور وہ آمادۂ جنگ ہوا۔ امام حسینؑ نے ایک رات مہلت مانگی تاکہ جی بھر کر عبادت کریں۔ مہلت منظور کی گئی۔ رات کا سناٹا تھا۔ امام حسینؑ نے شمع گل کر کے اپنے ساتھیوں سے خطاب کیا اور کہا کہ

وہ چلے جائیں، اپنی جانیں بچالیں۔ کل دشمن کو صرف ان کے خون کی ضرورت ہے۔
ان سب نے ایک زبان ہو کر اپنے بلند مقصد کی ترجمانی کی:

ہم اس سے کیوں ہٹیں جو رو مستقیم ہے
ہم جانتے ہیں آپ کا مقصد عظیم ہے

خاتمہ: مہلت کی رات، جس کو عرفِ عام میں شب عاشور کہتے ہیں، ایک خونی منظر اور یاس و حرمان کے عالم میں گزر گئی۔ دسویں محرم کا دن اپنے دامن میں تباہی کے اسباب کے ساتھ طلوع ہوا۔ دشمن جنگی ہتھیاروں کی تیاری کرنے میں محو۔ خاصانِ خدا میں صبح کی اذان سنائی دیتی ہے اور نماز کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ اتنے میں دشمن نے لڑائی لڑنے میں پہل کی۔ فوجِ حسینی اپنے بلند ترین مقصد میں اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر کے سرخ رو ہو جاتی ہے۔ امام حسینؑ تنہا رہ جاتے ہیں اور دشمن لاتعداد میں صف آرا:

لاکھوں عدو اور ایک شہِ مشرقین تھے
کتنے ستم تھے جن کا نشانہ حسینؑ تھے

انجام کار قیامت خیز جنگ ہوتی ہے۔ حسین پر نت نئے حربوں سے وار کیئے جاتے ہیں۔ وہ زخموں سے چور چور ہو کر تپتی ریت پر آتے ہیں۔ آخری سجدہ میں عبد اور معبود میں کچھ راز و نیاز کی باتیں ہو رہی ہیں۔ اتنے میں قاتل نے سرتن سے جدا کر دیا اور حق کی شمع کو بخیال خود ہمیشہ کے لیئے گل کر دیا:

ہر حال میں جو پیش نظر حق کی تھی رضا
محو نماز عصر ہوا جان مصطفیٰ
قاتل یہ حال دیکھ کے خنجر بکف چلا
زہرا نے بال کھول دیئے ، وامصیبتا

تڑپی سکینہ دردِ دلِ بے قرار سے
نکلے تڑپ کے شاہِ مدینہ مزار سے

ارسطو نے ایپک (رزمیہ) کے لیئے مبالغہ کی صنعت کو لازمی جز قرار دیا ہے۔ مبالغہ ہی وہ خوبی ہے جو شاعر اور مؤرخ میں تفاوت کرتی ہے۔ شاعر قرین قیاس (LAW OF IMPOSSIBILITIES) کو خلافِ قیاس ممکنات (LAW OF POSSIBILITIES) پر ترجیح دیتا ہے، یعنی وہ اپنی قوتِ متخیلہ سے ایسا کوئی غیر حقیقی واقعہ پیش کرتا ہے جو اصلیت میں رو نما نہیں ہوتا ہے۔ پڑھنے والے کو ضرور احساس ہوتا ہے کہ ایسا واقعہ عمل میں آیا ہوگا۔ مثال میں چند بند حاضر ہیں:

گرمی کی شدت

اک تو فضائے دشت کی یہ ہول ناکیاں
اس پر یہ دھوپ اور یہ گرمی کہ الاماں
اڑتی ہوئی یہ خاک، یہ ذرے شرر فشاں
جیسے ہو سارے دشت میں یا آگ یا دھواں
حیرت تھی اس تپش پہ عجب عالمین کو
بھٹی میں کس نے جھونک دیا ہے زمین کو

تلوار کی تعریف:

تلوار سب کی تیز تھی، چھوٹی ہو یا بڑی
ہر وار تھا غضب کا تو ہر ضرب تھی کڑی
بجلی سی جب کڑک کے کسی سر پہ آ پڑی
برسا لہو کہ لگ گئی برسات کی جھڑی
آئی ادھر، لہو میں ادھر لوٹ کر گئی
چھیڑا ادھر کسی کو، ادھر چوٹ کر گئی

گھوڑے کی جست و خیز:

سرعت وہ راہوار کی ، وہ گرمیٔ ستیز
وہ ہمہمہ کہ قہر ، وہ صیحہ کہ شعلہ ریز
وہ آہوؤں کا رم ، وہ چکاروں کی جست و خیز
فرسے اڑا تو سن سے چلا مثل تیغ تیز
چھپ کر نظر سے گوہر مکنون کی طرح
اترا زمیں پہ وحی کے مضمون کی طرح

ارسطو کی مقرر کردہ شرائط میں ایک شرط رزمیہ نظم کے لیئے پہچان (RECOGNITION) ہے جس کے معنی کسی نامعلوم واقعہ کے آثار کا قبل از وقت پتہ چل جانا۔ جب امام حسینؑ نے کربلا میں اپنے خیمے نصب کیئے تو انھیں پانی دیکھ کر مسرت ہوئی جیسے کہ ان اشعار سے واضح ہوتا ہے:

پانی بھی حق نے بخشا ہے صحرا میں اس قدر
انساں تو کیا کہ پی کے ہوں سیراب جانور

ooo

محفوظ اب ہیں تشنہ لبی کے ہراس سے
ہوگا ہلاک اب کوئی بچہ نہ پیاس سے

یہ واقعہ خلافِ امید رونما ہوا۔ یعنی جس پانی کو دیکھ کر آلِ رسولؐ میں مسرت پیدا ہوئی تھی، وہی پانی ان کے کام نہ آیا۔ زینبؑ حسینؑ سے پوچھتی ہیں:

پانی بھی وقت ذبح ملا تم کو یا حسینؑ
پیاسے ہی یا شہید ہوئے بے خطا حسینؑ

شاعر کا زورِ بیان: جب فوجِ حسینی نے خیمے دریا کے قریب لگائے تو دشمن نے اعتراض کیا کہ یہاں خیمے نہ لگائیں۔ عباسؑ کو دشمن کے اس غیر انسانی طرزِ عمل پر جلال آیا۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ ہمارا سر کٹ جائے لیکن حسینؑ کے اعزاز میں کسی قسم کی سبکی نہ آئے۔ جب دشمن خیمے ہٹوانے پر مُصِر رہا تو عباسؑ غیظ و غضب میں آتے ہیں:

برپا کریں گے حشر وہ ہم کارزار میں
مرحب بھی کانپ کانپ اٹھے گا مزار میں

اور پھر

گرجا جو اس جلال سے شیر خدا کا شیر
مردے یہ سمجھے حشر میں اب کچھ نہیں ہے دیر
زندوں کا حال یہ کہ ہوئے زندگی سے سیر
ہیبت سے مر کے رہ گئے سب نام کے دلیر
دہشت سے پھٹ کے رہ گئے سینے پہاڑ سے
تھرائے دشتِ ضیغم حق کی دہاڑ سے

عباسؑ کے غصہ پر قابو پانا آسان کام نہ تھا ہر چند زینبؑ سمجھاتی ہیں کہ

بھیا، قدم یہ جادۂ مقصد سے ہٹ نہ جائے
الٹو نہ آستیں کہ زمانہ الٹ نہ جائے

زینبؑ کی گفتگو کا یہ اثر ہوا کہ عباسؑ تھر تھرائے اور:

یہ سن کے سر جھکا کے ہٹا اک طرف وہ شیر
غصے کو حکم دخترِ حیدر سے کر کے زیر
خیمے اکھاڑنے لگا یوں جلد وہ دلیر
تعمیلِ حکم میں کہیں کچھ ہو نہ جائے دیر
دریا سے ہٹ کے موردِ بیداد ہو گئے
اک دشتِ تشنگی میں سب آباد ہو گئے

مرثیہ میں واقعات ہر چند لرزہ خیز اور عبرت ناک ہیں لیکن شاعر نے ایسا طرزِ ادا اختیار کیا کہ رنج و غم کے ساتھ ساتھ سننے والے کے دل میں ایک روحانی کیفیت بھی پیدا ہوتی ہے۔ امام حسینؑ کی شہادت کے بعد جب آلِ محمدؐ کے خیمے تاراج ہوئے تو یہ لٹا ہوا قافلہ کس وقار سے شام کی طرف جاتا ہے:

اس شان سے چلا سوئے منزل وہ کارواں
کچھ بے کجاوہ اونٹوں پہ بے پردہ بی بیاں
سجادِ زار قافلہ سالار و ساربان
نیزوں پہ سر شہیدوں کے قرآن بر زباں
رخ پر وقار و شانِ شہادت لیئے ہوئے
زخمی جبیں میں نورِ قیادت لیئے ہوئے

مرثیہ کا اسلوبِ بیان شان دار ہے۔ محاورے درست، ترکیبیں چست، تشبیہیں جدت آفریں، استعارے دل آویز اور لطف آور ہیں، کوئی لفظ بھرتی کا نہیں ہے، الفاظ کا حسن انتخاب لاجواب، زبان رواں دواں، شیریں اور کوثر و تسنیم سے دھلی ہوئی ہے۔ ہم اس مرثیہ سے اتنا لطف اندوز ہوئے کہ اسے کئی مرتبہ ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالا۔ آپ بھی اس سے لطف اٹھایئے اور میر انیس اور مرزا دبیر کی خاص لکھنؤ کی زبان کی داد دیجیئے۔

کتاب "آیاتِ درد" جناب اختر لکھنوی، مالک قلم نشان کراچی سے ۱۵۰ روپیہ میں مل سکتی ہے۔ کتاب ہر اعتبار سے خوب صورت، مزین اور مجلد ہے۔ گٹ اپ طباعت، کاغذ بہت عمدہ۔ ہم ایسی گراں مایہ کتاب پر جس میں رزم نگاری کے عمدہ اور معرکہ آرا شہ پارے شامل کیئے گئے ہیں، حضرتِ ساحر لکھنوی کو دل سے مبارک باد پیش کرتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ موصوف آئندہ بھی رزمیہ مرثیوں میں اپنے کمال فن کا مظاہرہ کر کے سامعین کے دلوں کو محظوظ فرمائیں گے۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آل محمدؐ کے صدقہ میں ساحر صاحب کے زورِ قلم کو مزید توانائی بخشے۔ آمین۔

رباعی

شبیرؑ کے غم خوار سدا شاد رہیں
دنیا کے غم و رنج سے آزاد رہیں
یہ بزمِ غم آباد ہے ان کے دم سے
اس غم کے تصدق میں یہ آباد رہیں

ڈاکٹر سردار زیدی

ساحر لکھنوی کے نو تصنیف مراثی کی تحلیل و نقد

میرے پیشِ نظر جناب ساحر لکھنوی کے چار مختلف العنوان موضوعاتی مراثی پر مشتمل ایک مجموعہ ہے جو فی الوقت طباعت کے مرحلہ میں ہے۔ اس سے پہلے کہ ان مراثی کا جائزہ لیا جائے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اردو مرثیہ کی تاریخ، اس کے ارتقائی سفر اور صنفِ مرثیہ کے شعری امکانات پر ایک سرسری سی نظر ڈال لیں تاکہ اس تناظر میں ساحر صاحب کے مراثی کو دیکھا جا سکے اور ان کی تحلیل و نقد میں آسانی ہو۔

اردو مرثیہ اردو شاعری کی خشتِ اول نہ بھی سہی لیکن قرائن سے ظاہر ہے کہ اس کی داغ بیل اردو شاعری کے ابتدائی دور ہی میں پڑ گئی تھی۔ تاریخی اعتبار سے اشرف بیابانی کی عزائیہ مثنوی "نوسرہار"، جس کا سنِ تصنیف ۱۵۰۳ء ہے، پہلی منضبط رثائی نظم ہے۔

بقولِ ڈاکٹر سیدہ جعفر:

"مربوط رثائیہ تاثرات کی پیش کش اور ربطِ بیان کو دیکھ کر یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ 'نوسرہار' سے پہلے بھی دکنی زبان میں واقعاتِ کربلا نظم کیے جاتے رہے ہوں گے"۔

بہمنی دور کی رثائی منظومات سے عصرِ حاضر کی عزائیہ شاعری تک مرثیہ نے اردو شاعری کی

دیگر اصناف کے متوازی ایک طویل سفر طے کیا ہے۔پانچ سو سال پر محیط اس لمبے سفر میں مرثیہ بہ اعتبار ہیئت بہت سے ساختیاتی مراحل سے گزرا۔دکنی شعرا نے بالعموم مرثیوں کو غزل کی ہیئت میں لکھا، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ غزل کی ہیئت میں مرثیہ کے STACCATO STYLE کے ساتھ ساتھ مسلسل اور مربوط مرثیہ کے ابتدائی خدوخال بھی دکن ہی کے شعرا کے ہاتھوں صورت پذیر ہوئے۔قلی قطب شاہ کے ہاں کہ جو اردو کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر بھی ہیں اور بعد ازاں احمد گجراتی کے ہاں مسلسل مرثیہ کے نقوش ملتے ہیں۔

مرثیہ میں،اس کی ابتدا سے کئی سو برس بعد تک ،بڑی حد تک محض عقیدہ و عقیدت کی کارفرمائی رہی اور یہ محض کارِ ثواب کے طور پر برائے گریۂ عوام کہا جاتا رہا۔مرثیہ کی ادبی فارم کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی گئی اور مرثیہ کو محض بجواشاعری سمجھا جاتا رہا۔شمالی ہندوستان میں سودا پہلے شاعر ہیں جنھوں نے مرثیہ کی سنجیدہ ادبی حیثیت پر اصرار کیا اور اپنے مرثیوں میں ادبی اور شاعرانہ لوازمات کا لحاظ رکھا۔یوں تو سودا نے مرثیے بصورت مثلث مربع اور مخمس بھی لکھے لیکن وہ پہلے شاعر ہیں جنھوں نے مسدس کی ہیئت کو مرثیہ کے لیے اختیار کیا جو بعد میں مقبول ہو کر بڑی حد تک مرثیہ سے مختص ہو گئی۔

سودا کی روایت کو اودھ میں میر خلیق اور میر ضمیر کے ہاتھوں استحکام نصیب ہوا۔میر ضمیر نے اردو شاعری کی دیگر اہم اصنافِ سخن سے استفادہ کرتے ہوئے مرثیہ کو ایک جامع شکل دی اور اس صنف کی موضوعاتی ترتیب (SCHEMA) کو متعین کیا۔میر ضمیر کے تیار کردہ ساختیاتی ڈھانچے کے مطابق ایک مکمل مرثیہ کے اجزائے ترکیبی کہ جن کے ابتدائی نقوش دکن اور شمالی ہند کے شعرا کے ہاں غیر منضبط شکل میں کم و بیش موجود تھے، کچھ یوں ٹھہرے، یعنی چہرہ، سراپا، رخصت، آمد، رجز، جنگ، شہادت اور بین۔بعد میں پیارے صاحب رشید نے ساقی نامہ کو مرثیہ میں داخل کیا اور اپنی حد تک اس کو مرثیہ کا مستقل جزو بنا دیا۔میر خلیق اور میر ضمیر تک آتے آتے اور ان اصحاب کی کاوش سے مرثیہ کی ہیئت اور ادبی حیثیت مسلم ہو گئی۔

ہیئتی اعتبار سے مرثیہ جب اپنی جامع شکل میں میر انیس اور مرزا دبیر جیسے قادر الکلام اور کل وقتی شعراء کے ہاتھوں میں آیا تو انھوں نے اپنی فطری خلاقانہ صلاحیتوں سے مرثیہ کو اس منتہائے کمال تک پہنچا دیا کہ ان کے بعد تمام تر اختراعات اور کوشش بسیار کے باوصف آج تک کوئی دوسرا شاعر ان کے پایہ کا مرثیہ کہنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔

جہاں تک جدید مرثیہ کا تعلق ہے تو یہ اپنی ہیئت، اپنے مقصد، اپنی لغت اور اپنے اعتقادی نظام کے تناظر کے اعتبار سے آج بھی کلاسیکی روایت سے بہت مختلف نہیں۔ بہ لحاظ موضوع، مواد اور ہیئت جوش سے جمیل مظہری اور صادقین تک جو مساعی کی گئی ہیں وہ بہت مستحسن ہیں، لیکن یہ کوششیں اتنی اساسی نوعیت کی نہیں کہ مرثیہ کو بالکل ایک نئی ڈگر پر ڈال دیں۔ مرثیہ آج بھی منبر سے سنانے کی چیز ہے۔ مرثیہ کے موضوعات محدود اور مقاصد پہلے سے طے شدہ ہیں۔ مرثیہ کے مسلمات سے واضح انحراف کی گنجائش ہی موجود نہیں۔ قدیم و جدید میں یوں بھی ایک واضح خطِ تفریق کھینچنا ممکن نہیں ہوتا۔ تبدیلیاں بتدریج آتی ہیں لیکن حوالہ جاتی سہولت کے لیئے ہم کوئی WATERSHED EVENT مقرر کر لیتے ہیں جو اکثر ایک تحریک یا واقعہ کی صورت میں ہوتی ہے، ورنہ تاریخ کا سفر تو ایک مسلسل عمل ہے اور ہر شے اور ہر واقعہ گزشتہ سے پیوستہ ہے۔ مثال کے طور پر پہلی اور دوسری جنگِ عظیم دو ایسے سنگین واقعات ہیں جن سے بالترتیب جدیدیت اور مابعد جدیدیت کی تحریکوں کے نقطۂ آغاز کو منسوب کیا جاتا ہے، حالانکہ اوّل الذکر تحریک کے آثار انیسویں صدی کے اواخر سے واضح ہونا شروع ہو گئے تھے اور موخر الذکر تحریک کا اظہار ۱۹۴۰ء یا ۱۹۵۰ء کے لگ بھگ ہونا شروع ہوا اور یہ دونوں تحریکیں ابھی تک جاری و ساری ہیں۔

جدیدیت کے لیبل کے لیئے ضروری ہے کہ روایت سے واضح انحراف موجود ہو اور مسلمات کو توڑ دیا جائے، اور اس کے محرکات خواہ کچھ بھی ہوں، نقطۂ نظر میں کوئی انقلابی تبدیلی آئے۔ مرثیہ میں ان معنی میں تبدیلی عملاً ممکن نہیں کیونکہ جیسا کہ میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں مرثیہ ایک اعتقادی نظام کے تابع ہے اور اس کے مقاصد و رسومیات بڑی حد تک

طے شدہ ہیں۔

ایک اور مسئلہ جو مرثیہ سے متعلق متنازعہ رہا ہے اور شبلی کے عہد سے آج تک بار بار اٹھتا رہا ہے، وہ اس کی رزمیہ فارم کا ہے۔ اس سلسلہ میں دو ٹوک بات یہ ہے کہ مرثیہ رزمیہ کے معیار پر پورا نہیں اترتا۔ نقادانِ فن نے انگریزی ادب میں EPIC یا رزمیہ کی جو کم از کم شرائط مقرر کی ہیں، وہ یہ ہیں:

الف۔ ایک کثیر الجہت، طویل بیانیہ نظم جس کا موضوع سنجیدہ اور مستحکم بالشان ہو اور جس کی بافت اسطور، روایت، لوک کہانی اور تاریخ کے دھاگوں سے کی گئی ہو۔

ب۔ نظم کا اسلوب ارفع ہو۔

ج۔ کسی جنگجو یا فوق البشر شخصیت کے کارناموں سے متعلق ہو۔

د۔ نظم کے ہیرو کے اعمال یا کارناموں پر کسی قبیلہ، قوم یا نسلِ انسانی کے مقدر کا انحصار ہو۔

اس اقل معیار کی پہلی شرط ہی اس قدر کڑی ہے کہ مرثیہ کے متعلق رزمیہ کی بحث ہی بے معنی ہو جاتی ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ مرثیہ ایک طویل بیانیہ نظم نہیں بلکہ ایک کولاژ (COLLAGE) ہے، ایک غیر مربوط اور بے ترتیب منظوم ٹکڑوں کی زنجیر ہے جو گریز کے ذریعہ جڑی ہوئی ہے۔ اس بات کا اندازہ ڈاکٹر نیر مسعود کے اس بیان سے لگایا جا سکتا ہے جو سہ ماہی جریدہ رثائی ادب کراچی بابت جنوری فروری مارچ ۲۰۰۰ء میں نقل کیا گیا ہے:

"میر انیس یا مرزا دبیر اس طرح نہیں کہتے تھے کہ مثلاً ایک مرثیہ کہہ رہے ہوں حضرتِ حر کے حال کا تو شروع سے آخر تک کہا جائے۔ ان پر جب آمد ہوتی تو مثلاً گھوڑے کی تعریف میں وہ سو بند کہہ دیتے، رخصت کے پچاس بند کہہ دیتے، جنگ دکھا دی ڈیڑھ سو بند میں۔ اب وہ رکھ دیئے۔ بعد میں ان کو مختلف مرثیوں میں تقسیم کر دیا اور ربط کے بندوں کا اضافہ کر دیا"۔

مرثیہ کی صنف کی مقبولیت کے بارے میں یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ مرثیہ اردو ادب کی واحد نمائندہ اور سراسر مقامی صنف ہونے کے باوجود اور اپنے کل شعری امکانات کے ساتھ اپنے موضوع اور اپیل کے اعتبار سے ایک محدود صنف ہے۔ سانحۂ کربلا اپنی آفاقیت، اپنی مذہبی واخلاقی اہمیت اور عالم اسلام پر اپنے دوررس اثرات کے باوصف زمانی و مکانی اسکیل کے اعتبار سے اتنا مختصر واقعہ ہے کہ اس کی تمام تر تفصیل ایک رزمیہ کا مواد مہیا کرنے کے لیئے کافی نہیں، نہ تو ابتدائی یا قدیم نوع (PRIMARY OR PRIMITIVE) کے رزمیہ (مثلاً ہومر کی اوڈیسی) اور نہ ثانوی یا ادبی (SECONDARY OR LITERARY) رزمیہ ہی (مثلاً ورجل کی ای نی اڈ) کے اعتبار سے۔ اور اگر بالفرض کربلا کی داستان کو کھینچ تان کے کسی نوع کی رزمیہ کی شکل دے بھی دی جائی تو یہ مشکل پھر بھی باقی رہے گی کہ عہد بعہد مختلف شعرا کس طرح ایک ہی واقعہ کو تازہ کاری کے ساتھ بار بار رقم کریں۔ اس تناظر میں اگر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ میر انیس کی یہ دعا کہ "ایک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں" دراصل ان کی قادر الکلامی کے احساس کے اظہار سے زیادہ مرثیہ کے موضوع کی محدودیت کی غماز ہے۔

اپنی مذہبی یا فرقہ وارانہ زیرباری (RELIGIOUS OR SECTARIAN OVERLOAD) کی وجہ سے مرثیہ کی اپیل مزید محدود ہو گئی۔ اس کی ہردلعزیزی کے حق میں یہ شہادت کافی نہیں کہ دوسرے فرقوں اور مذاہب کے لوگوں نے بھی اس صنف میں طبع آزمائی کی۔ اس کا سبب تہذیبی رواداری یا شاعرانہ کمال کے اظہار کا جذبہ بھی ہو سکتا ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ یہ اشتباہ محض ازراہِ قیاس ہے اور اس کے رد و قبول کے لیئے بہت سے تاریخی، ثقافتی اور نفسیاتی عوامل کا تجزیہ کرنا پڑے گا۔

مرثیہ کی اپیل محدود ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یہ صنف ہمیشہ سے زبانی شاعری (ORAL POETRY) کی روایت کا حصہ رہی ہے۔ مرثیہ سننے اور سنانے کی چیز ہے، مجلسی چیز ہے نہ کہ دل جمعی سے علیحدگی میں بیٹھ کر پڑھے جانے کی۔ یہی سبب ہے کہ

مرثیہ کی مقبولیت محض مجلسِ عزا کے سامعین اور ایک مخصوص فرقہ کے افراد تک محدود رہی ہے۔ میرے نزدیک ایک اور وجہ مرثیہ کی مقبولیت میں کمی کی یہ بھی ہے کہ اپنے تاریخی، تہذیبی اور مذہبی پس منظر کے باعث مرثیہ کی لغت شروع ہی سے ادق اور عربی و فارسی زدہ رہی ہے جو بالخصوص موجودہ دور میں، علمی پس ماندگی اور عربی و فارسی سے عدم واقفیت کی بنا پر مرثیہ کے ابلاغ و تشہیر میں ایک عظیم رکاوٹ ہے۔

صنفِ مرثیہ کے تاریخی پس منظر اور اس کے شعری امکانات کے اس مجمل خاکہ کو پیش کرنے کے بعد اب ہم ساحر صاحب کے مذکورہ بالا مراثی کی طرف مراجعت کرتے ہیں۔ زیرِ طبع مجموعہ میں شامل چار مرثیوں کے عنوانات بالترتیب یہ ہیں:

(۱) سجدہ (۲) فیصلہ (۳) گواہی (۴) دعا اور صحیفۂ کاملہ

جناب ساحر صاحب مرثیہ نگاروں کی اس نسلِ جدید سے تعلق رکھتے ہیں جو تقسیمِ برِصغیر کے بھی ایک ربع صدی بعد منصۂ شہود پر نمودار ہوئی اور جو ایک ربع صدی کی مشقِ سخن کے بعد آج خود استادی کی سند پر فائز ہے۔ انھوں نے اپنا پہلا مرثیہ "قطب شاہ سے ساحر تک" ۱۹۷۵ء میں تصنیف کیا جس کو ۱۹۷۷ء میں پاکستان رائیٹرز گلڈ نے کراچی سے شائع کیا۔ ان کا دوسرا مرثیہ "علم اور علما" ۱۹۹۰ء میں ہندوستان سے شائع ہوا اور اس کی مکرر اشاعت ۱۹۹۲ء میں "قلم نشانِ پاکستان" نے کراچی سے کی۔ مرثیہ "فقہ و شمشیر" ۱۹۹۳ء میں دہلی سے اشاعت پذیر ہوا۔ اس کے بعد ان کا ایک مجموعہ "آیاتِ درر" کے نام سے جو سات مراثی بشمول "فقہ و شمشیر" پر مشتمل ہے، ۱۹۹۴ء میں "قلم نشانِ پاکستان" نے شائع کیا اور اب یہ درج بالا چار مراثی کا مجموعہ مع دیگر مراثی طباعت کے مرحلہ میں ہے۔

بظاہر یہ چاروں مرثیے علیحدہ علیحدہ موضوعات کے حامل ہیں لیکن اگر بنظرِ غائر دیکھا جائے تو ان کے مضامین میں ایک گہرا معنوی ربط موجود ہے۔ "گواہی" اور "فیصلہ" تو واضح طور پر باہم معاون موضوعات ہیں بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ معتبر شہادت کے بغیر انسانی معاملات میں عدل پر مبنی فیصلہ کرنے کا تصور بھی نہیں کیا

جا سکتا۔ خواہ وہ مصری قانون ہو یا فقہی یا رومی، فیصلہ کا انحصار ہمیشہ سے گواہی پر رہا ہے۔ اسلام میں تو شہادت کی مرکزی حیثیت ہے بلکہ یہ ایمان سے مشروط ہے۔ اللہ کی وحدانیت پر مومن اپنی جان کا نذرانہ پیش کر کے گواہی دیتا ہے۔ کربلا میں میان حق و باطل فیصلہ کے لیے جب عدالت لگی تو :

یہ وہ عدالت عظمیٰ تھی بین ارض و سما
تھا منصفوں میں جہاں وقت کا بس اک لمحا
مقدمہ جو سر کربلا یہ پیش ہوا
تھا اک فریق یزید اور اک فریق خدا
حسین مدعی منجانب اللہ ہوئے
بہتّر اہلِ شرف آپ کے گواہ ہوئے

اس کائنات میں انسان کی طبعی حیثیت انتہائی کمزور ہے، اس کا علم محدود ہے لہٰذا اس کے دل میں خوف کا پیدا ہونا ایک فطری امر ہے۔ موت کا خوف، بیماری کا خوف، غربت کا خوف، مستقبل کا خوف، غرض مختلف انواع کے خوف ہر آن اس کو ہراساں رکھتے ہیں۔ ہزاروں وسوسے اس کو ہر وقت گھیرے رہتے ہیں اور وہ ہمہ وقت بے یقینی اور عدم تحفظ کے احساس کا شکار رہتا ہے۔ خوف کی کوکھ سے طمع جنم لیتی ہے۔ چیزوں کے چھن جانے کے ڈر سے وہ حریص ہو جاتا ہے۔ جو کچھ اس کے پاس ہے وہ اسے کھونا نہیں چاہتا، کیونکہ ان چیزوں کی موجودگی اسے تحفظ کا احساس فراہم کرتی ہے۔ وہ ان چیزوں کو نہ صرف برقرار رکھنا چاہتا ہے بلکہ ان میں اضافہ کا آرزومند ہوتا ہے اور ایسا کرنے میں اسے ناگزیر طور پر جھوٹ کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ غرض خوف، طمع اور کذب کی یہ مثلث انسان کی زندگی کا احاطہ کر لیتی ہے اور دیگر سینکڑوں برائیوں کا سبب بنتی ہے، مثلاً تکبر، ظلم، بغض و عناد، خیانت، جھوٹی گواہی وغیرہ۔ ان تمام امراض کا علاج عقیدۂ توحید میں پنہاں ہے۔ 'توحید' اسلام کا بنیادی رکن ہے اور 'سجدہ' اس عقیدہ پر ایمان کا بیّن مظہر۔ خدا کے حضور سجدہ تکبر کی نفی کرتا ہے اور غیر اللہ

کے ڈر سے انسان کو آزاد کرتا ہے:

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

اور ساحر صاحب کی زبان میں:

یہ بندگی کا شرف بھی ہے اور شہادت بھی
یہ عبدیت کی سند بھی ہے اور ضمانت بھی

مومن کو اللہ کے وعدہ پر یقین ہوتا ہے۔ وہ انتہائی نامساعد حالات میں بھی اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہوتا:

لا تقنطوا من رحمت اللہ

اور جب کسی مصیبت میں گرفتار ہوتا ہے تو دعا مانگتا ہے اور اللہ ہی سے مدد کا طالب ہوتا ہے کیونکہ ادعونی استجب لکم اس نے ہی تو کہا۔ اور یہ کہ:

کہہ کر اُجیب دعوۃ الداع اذا دعان
اپنی ربوبیت کی بتائی ہے اس نے شان

اور یہ شہادت، سجدہ اور دعا کے نسخے آپ کو صحیفۂ کاملہ یعنی قرآن ہی نے تو مہیا کیے ہیں:

جتنے بھی نسخے آئے ہدایت کے باب میں
سب کا نچوڑ آگیا ام الکتاب میں

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ ساحر صاحب کے یہ چاروں مرثیے تصوراتی سطح پر کس طرح ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہیں۔ آیئے، اب ساحر صاحب کے ان مرثیوں کی چند دیگر ابعاد کا بھی ایک مختصر جائزہ لیں۔

ساحر صاحب ارتقاء و سرا جام مرثیہ کی کلاسیکی روایت کے پاس دار ہیں۔ وہ جدید محض ان معنی میں ہیں کہ ان کے مرثیے موضوعاتی ہیں جو جدید مرثیہ کی نہج ہے اور ساتھ ہی ساتھ ان میں جا بجا عصری حسیت کا اظہار بھی ملتا ہے۔ باقی ہر اعتبار سے ان کے مرثیے بشمول ہیئت و

اجزائے ترکیبی کلاسیکی روایت کے پابند ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ وہ اس کو غیر ضروری جانتے ہوئے بھی مرثیوں میں ساقی نامہ جیسی اضافی چیز کا اہتمام کرتے ہیں اور اس کا جواز اعتراف حقیقت کے طور پر اپنے مجموعہ "آیاتِ درد" میں یوں بیان کرتے ہیں:

"البتہ ساقی نامہ جو اب میرے تقریباً ہر مرثیہ میں شامل ہونے لگا ہے اس کو میں ہرگز ضروری نہیں سمجھتا ہوں۔ میں نے اپنے مرثیہ 'مداحی اور پیروی' سے پہلے کسی مرثیہ میں ساقی نامہ نہیں کہا تھا۔ اب مجبوری یہ ہو گئی ہے کہ میں ہر سال نیا مرثیہ جناب محترم سید محمد اخفاد صاحب ایڈوکیٹ کے دولت کدہ پر پیش کرتا ہوں جو اپنے وقت کے ایک معروف و معتبر شاعر حضرت شاد زید پوری کے صاحب زادے ہیں۔ ساقی نامہ ان کی اور ان کے برادرِ خورد جناب محترم محسن امام صاحب قبلہ کی خاص پسندیدہ چیز ہے۔ یہ ان کی پسند کا احترام ہے کہ مجھ کو دو تین بند ساقی نامہ کے کہنے پڑتے ہیں"۔

آپ نے دیکھا کہ یہ خیالِ خاطر احباب بھی ان کے روایتی اندازِ فکر کی چغلی کھا رہا ہے۔

ساحر صاحب کے زیرِ نظر مرثیوں میں سے دو میں یعنی "سجدہ" اور "دعا و صحیفۂ کاملہ" میں ساقی نامہ موجود ہے لیکن مرثیہ کے مزاج کی مناسبت سے بھی اور اپنی افتادِ طبع کے لحاظ سے بھی ساحر صاحب کا مے خانہ، مے کدۂ حق ہے جو شرابِ طہور اور شرابِ ولا سے عبارت ہے۔ ان کا ساغر جامِ دعا ہے اور بدمستی کے عالم میں بھی ان کی خواہش انتہائی مومنانہ ہے:

پیوں جو جھک کے، ترے نام پر کروں سجدہ
الست کے جام، اس جام پر کروں سجدہ

ساحر صاحب ہر شریف النفس انسان کی طرح رقیق القلب واقع ہوئے ہیں۔ صنفِ مرثیہ ان کے مزاج اور ان کی فطری دل برشتگی کی کیفیت سے ہم آہنگ ہے۔ ان کے بقول "مرثیہ میں المیہ میرے نزدیک مرثیہ کی اصل ہے۔ چنانچہ میرے مرثیوں میں مصائب

کے بعد بھی نسبتاً زیادہ ہوتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ اپنے اس ادعا اور اپنے میلانِ طبع کے اعتبار سے ان کے مرثیہ کا بکائیہ حصہ نہایت مؤثر اور رقت انگیز ہو جاتا ہے۔ اس حصہ میں وہ روتے بھی ہیں اور رلاتے بھی ہیں۔ سامعین کو رلانا کوئی آسان کام نہیں مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ۔ کہا جاتا ہے کہ انگریزی کے مشہور ناول UNCLE TOM'S CABIN کو امریکہ میں غلاموں کی آزادی کی تحریک میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے، کو لکھتے وقت اس کی مصنفہ ہیریٹ بیچر اسٹو (HARRIET BEECHER STOW) ہر باب اپنے خاندان کے افراد کو پڑھ کر سناتی اور اس وقت تک اس کو مکرر لکھتی رہتی تاآنکہ اس کے سامعین غم سے بے تاب ہو کر بلک بلک کر رونے لگتے۔ ساحر صاحب کے مرثیہ کے بکائیہ حصوں میں بھی اسی قسم کا ریاض ملتا ہے۔

ڈاکٹر نیر مسعود نے جدید مرثیہ کے حوالے سے اپنے ایک انٹرویو میں بجا طور پر یہ شکایت کی تھی کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں جگہ "بکائیہ عنصر مرثیہ میں کم ہو گیا ہے"۔ ساحر صاحب کے مرثیے ڈاکٹر نیر مسعود کی اس شکایت کا ازالہ کرتے ہیں۔

قیدِ یزید سے رہائی کے بعد قافلۂ حسینی کے باقیات جب میدانِ کربلا میں وارد ہوتے ہیں تو حزن و یاس کا عجب منظر درپیش ہے:

بانو صدائیں دیتی تھیں ۔ اصغر کہاں ہو تم
لیلیٰ پکارتی تھی ، کہ اکبر کہاں ہو تم
کلثوم کہہ رہی تھیں ۔ برادر کہاں ہو تم
عباس جانِ ساقیٔ کوثر کہاں ہو تم
زینب نہ ڈھونڈتی تھیں کسی نورِ عین کو
ان کی نگاہیں ڈھونڈ رہی تھیں حسین کو

حضرت حر داستانِ کربلا کا نہایت اہم کردار ہیں۔ انھوں نے حسینی قافلہ کا راستہ ضرور روکا تھا لیکن جب حقیقتِ حال ان پر آشکار ہوئی تو ایک شریف اور بہادر انسان کی طرح وہ

ندامت، توبہ اور کفارہ کے راستہ سے شہیدانِ کربلا میں شامل ہوئے۔ حر ہاشمی حسینی تھے لیکن ان کے ہم کفو یا عزیز نہیں، لہٰذا ان کی شہادت پر بین لکھنا مشکل کام ہے۔ اس سانحہ میں ذاتی غم کے اظہار کے وہ امکانات موجود ہیں جو قریبی اعزاء کے حوالے سے ممکن ہوتے ہیں، لہٰذا حضرتِ حر کی شہادت پر بکائیہ بند لکھنا ایک کٹھن مرحلہ ہے۔ اس مرحلہ کو ساحر صاحب نے بڑی خوبی سے اس طرح طے کیا ہے کہ بکائیہ بندوں کا رُخ بڑی چابک دستی سے آئندہ پیش آنے والے سنگین واقعات کو متصور کرنے کی طرف موڑ دیا ہے جس سے مرثیہ کے بیانیہ امکانات میں بے پناہ اضافہ ہو گیا ہے۔ دو بند ملاحظہ کیجیے:

ابھی تھیں نوحہ کناں حر پہ زینب غمگیں
کہ آئی کان میں قسمت کی یہ صدائے حزیں
ابھی ہیں اور بہت غم، ابھی تو کچھ بھی نہیں
ابھی ہلاک نہ رو رو کے اپنے تئیں
ابھی تو عون و محمد کے غم میں رونا ہے
ابھی تو لاشۂ اکبر پہ جان کھونا ہے

عجیب عالم تنہائی ہوگا سرور پہ
نہ ہوں گے بھائی، نہ بیٹے، نہ مونس و یاور
کریں گے رن میں یہ حسرت جو چاروں سمت نظر
کہے گی بے کسی و یاس شہ سے رو رو کر
نہ لشکرے، نہ سپاہے، نہ کثرت الناسے
نہ قاسمے، نہ علی اکبرے، نہ عباسے

ماہرینِ نفسیات نے ذہانت کی تعریف اور اس کی مختلف انواع کی درجہ بندی کرنے کی کوشش کی ہے۔ ماہرِ نفسیات ہاورڈ گارڈنر (HOWARD GARDNER) نے چھ اقسام کی ذہانتوں کی نشان دہی کی ہے۔ ان میں لسانی ذہانت سرِ فہرست ہے۔ لسانی استعداد کے اعصابی

مراکزِ دماغ کے بائیں نصف کرہ میں واقع ہوتے ہیں۔ تحقیقی مطالعوں کے نتیجہ میں اس بات کی قوی شہادت فراہم ہوئی ہے کہ عظیم شعراً اور مصنفین غیر معمولی لسانی استعداد کے مالک ہوتے ہیں اور ان کے یہ لسانی اعصابی مراکز نسبتاً وسیع اور زیادہ فعال ہوتے ہیں۔ گارڈنر کی اس تحقیق کے بارے میں کارنیگی میلن یونیورسٹی کے جون آر۔ اینڈرسن اپنی کتاب COGNI-TIVE PSYCHOLOGY AND ITS IMPLICATIONS میں لکھتے ہیں :

"CLEARLY THE STRONGEST CASE EXISTS FOR LINGUISTIC INTELLIGENCE. AS WE NOTED IN CHAPTERS 2,4, AND II, THERE IS GOOD EVIDENCE FOR SEPARATE NEURAL CENTRES. GARD-NER REGARDS THE GREAT POETS AND WRITERS AS PEOPLE WITH TRULY EXCEPTIONAL LINGUISTIC TALENT."

زبان کے حوالے سے اردو ادب میں مرثیہ ایسی صنف ہے کہ جس میں شعراً کی لسانی صلاحیت سب سے زیادہ بروئے کار آئی ہے۔ مرثیہ کے شعراً نے اردو زبان کا دامن وسیع کیا اور ایک ایسی کثیر اللسان لغت مہیا کی جس نے اردو نظم کے امکانات کو روشن کیا۔ اقبال اور جوش جیسے اردو نظم کے عظیم شعراً کی اعتبار سے، بالخصوص لسانی اعتبار سے مرثیہ کی صنف کے رہینِ منت نظر آتے ہیں۔

لسانی حوالے سے اگر ہم ساحر صاحب کے ان مرثیوں کو دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ انھیں زبان پر مکمل دسترس حاصل ہے اور وہ الفاظ کا موضوع، مضمون اور موقع و محل کے لحاظ سے انتہائی بلیغ استعمال کرنے پر قادر ہیں۔ زبان و شاعری ان کا جینیاتی ورثہ بھی ہے کہ وہ خاندانِ اجتہاد کے چشم و چراغ ہیں جس میں علم کے ساتھ ساتھ رثا کی روایت بھی موجود ہے، اور اس نسبی سلسلہ میں سید اصغر حسین صاحب فاخر، اللہ صاحب خورشید اور شاعر لکھنوی وغیرہ جیسے معروف مرثیہ نگاروں کے نام شامل ہیں۔ مندرجہ ذیل بند ان کی زبان و بیان پر قدرت کا منھ بولتا ثبوت ہیں :

ضیغمِ بحرِ شجاعت ، ہزبرِ دشتِ وغا
اسد جلالت و اژدر در و ابوالہیجا
امیرِ کشورِ دیں ، شہریارِ ارض و سما
خدیوِ خلد و نجف ، تاجدارِ ملکِ بقا
"شہے کہ بگذرد از نہ سپہر افسر او
اگر غلام علی نیست خاک بر سر او"
میں عاجز و حقیر ہوں ، تو قادر و عظیم
میں عاصی و ذلیل ہوں ، تو راحم و رحیم
میں لقمۂ جحیم ہوں ، تو خالقِ جحیم
میں بندۂ اثیم ہوں ، تو محسن و کریم
میری مجال تجھ سے بغاوت کیا کروں
افسوس ، نفس آئے جو غالب تو کیا کروں

ساحر صاحب کے ہاں زبان کا بڑا تنوع ہے۔ وہ حسبِ ضرورت اور مناسبِ محل عربی و فارسی الفاظ کے ساتھ ہندی الفاظ کا استعمال بھی بے دریغ کرتے ہیں:

عبث ہیں تیری یہ بے چینیاں ، یہ تیری تڑپ
فضول آنکھوں سے گرتے ہیں اشک جو ٹپ ٹپ
حسین بے کس و عاجز ہیں ، ان کا نام نہ جپ
ہے جان لیوا بہت یہ غمِ فراق کی تپ
یہاں تو تیر سے دام و درم برستے ہیں
وہ بوند بوند کو پانی کی خود ترستے ہیں

مرثیہ نگاری میں ایک مشکل مرحلہ ربط کے بعد یا گریز کا ہے، اور یہ مرحلہ ایک بار نہیں بلکہ ایک ہی مرثیہ کے دوران بار بار پیش آتا ہے:

مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

• مرزا غالب

مرثیہ کے مختلف اجزا کو ہم آمیز کرنے میں گریز کے اشعار ایک CATALYST کا کام کرتے ہیں یا یوں کہہ لیجیے کہ یہ ٹرین کے حوالہ سے کانٹا بدلنے کا عمل ہے۔ کانٹا اگر بروقت بدل دیا جائے تو ٹرین غیر محسوس طریقہ سے اپنی سمت تبدیل کر لیتی ہے اور اس کی رفتار میں کوئی تعطل پیدا نہیں ہوتا۔ ہم گریز کو کار چلانے کے دوران گیئر بدلنے کے عمل سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ ایک ماہر ڈرائیور اس خوبی سے مرحلہ وار اور بروقت گیئر تبدیل کرتا ہے کہ مسافروں کو احساس بھی نہیں ہوتا اور کار کی رفتار تدریجی طور پر حسب منشا کم یا زیادہ ہو جاتی ہے۔ مرثیہ میں گریز کا مرحلہ شاعر سے منطقی فکر اور فنی مہارت کا تقاضہ کرتا ہے۔ جناب ساحر صاحب اپنے مرثیوں میں گریز اس طرح کرتے ہیں کہ ایک جزو کے بعد دوسرے جزو میں تحلیل ہوتے چلے جاتے ہیں، تلازمات کے ذریعہ موضوع بدلتے جاتے ہیں لیکن سامعین کی توجہ میں کوئی انتشار پیدا نہیں ہوتا۔ یہاں نمونتاً ساقی نامہ سے تلوار کی تعریف کی طرف گریز کا ایک خوبصورت بند پیشِ خدمت ہے:

بس اب تو دے مجھے خم بھر کے بادۂ کوثر
پیوں کبھی سرِ منبر، کبھی مصلے پر
اگر سرور میں صفین مجھ کو آئے نظر
دکھاؤں بزم میں پھر تیری تیغ کے جوہر
نظر میں معرکے پھر جائیں بدر و خیبر کے
سنیں ملک بھی تو شہپر سمیٹ لیں ڈر کے

گریز میں یہ مہارت و پرکاری ساحر صاحب نے دراصل قصیدہ سے حاصل کی ہے۔ وہ بنیادی طور پر قصیدہ کے مردِ میدان ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ حیثیتِ مرثیہ گو اپنے کسی ہم عصر سے کم تر ہیں یا کسی طور ان کے مراثی زورِ کلام یا تاثیر میں کمزور ہیں، البتہ یہ حقیقت ہے کہ ساحر صاحب کے قصائد ان کے مراثی سے تعداد میں زیادہ اور فنی اعتبار سے بمنزلہ بحر ہیں۔ ان کی دقت پسند طبیعت نے ابتدا ہی میں قصیدہ جیسی مشکل صنف کو اپنے شوق

سخن آرائی کے لیئے منتخب کیا۔ وہ کہتے ہیں :

تھی میری فکر کو درکار جو اک بحر کی وسعت
قصیدہ کو ذریعہ ندرتِ اظہار کا پایا

اور اس کا سبب انھوں نے یہ بیان کیا ہے :

وہ تشبیب و گریز و مدح کی پر کاریاں اس میں
غزل سے بڑھ کے جن کو دل فریب و دل ربا پایا

اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ نہ صرف عصر حاضر میں قصیدہ کے سب سے باکمال شاعر ہیں بلکہ ان کے قصیدے متقدمین اساتذہ کے قصائد کے ہم پلہ ہیں۔ مولانا باقر شمس کی مندرجۂ ذیل رائے اس دعوے پر سند ہے :

"اردو میں تو کوئی بھی انوری و خاقانی جیسا قصیدہ نہ کہہ سکا۔ منشی اسماعیل حسین منیر نے مولوی فضل حق خیر آبادی کی فرمائش سے ایک قصیدہ کہا جو اردو میں شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے مگر یہ ایک ہی قصیدہ ہے۔ اس کے علاوہ سودا، ذوق اور غالب دہلی میں اور لکھنؤ میں منشی اسماعیل حسین منیر، مولانا صفی، عزیز اور محشر نے قصیدے کہے ہیں جو بہت بلند پایہ ہیں۔ میرے خیال میں ان سات شعرا نے اردو میں قصیدہ گوئی کا جو حق ادا کیا ہے، وہ کوئی نہ کر سکا۔ ان کے بعد اگر کسی نے قصیدے کہے ہیں تو جناب ساحر صاحب نے کہے ہیں لیکن ان کے بعد کا یہ مطلب نہیں کہ ان کے قصیدے ان شعرا سے کم تر ہیں بلکہ ان کی فکر کے ہیں۔ بعد کی لفظ میں نے زمانہ کے اعتبار سے استعمال کی ہے"۔

مرثیہ کی تشکیل میں قصیدہ اساسی حیثیت رکھتا ہے بلکہ اخلاقی اعتبار سے مرثیہ قصیدہ ہی کی صورت معکوس ہے کیونکہ قصیدہ میں بہ استثنائے نعتیہ و منقبتی غرض سے کسی زندہ صاحبِ حیثیت شخص کی تعریف کی جاتی ہے جبکہ مرثیہ میں بغرض ثواب و نجاتِ اخروی شہیدانِ کربلا کی مدح کی جاتی ہے۔ قصیدہ خواہ دنیاوی غرض سے لکھا جائے یا مذہبی، ایک

مشکل و متین صنف ہے۔ یہ قصیدہ نگار سے فنی پختگی اور جزالتِ الفاظ کا تقاضہ کرتا ہے۔ کیونکہ ساحر صاحب کی ابتدائی شاعرانہ تربیت قصیدہ کی صنف میں ہوئی لہٰذا ان کی اس مزاولت و مشق کا بھر پور انعکاس مرثیہ میں بھی زورِ بیاں، رفعتِ تخیل، مناسب محل انتخابِ الفاظ، خوب صورت گریز، معنوی ربط اور صنائع بدائع کی شکل میں ہوا ہے اور یہی وہ خصوصیات ہیں جو ان کا انفرادی لہجہ متعین کرتی ہیں اور ان کو اپنے ہم عصر مرثیہ نگاروں سے ممتاز کرتی ہیں۔ ان کے مراثی کا طول بھی غالباً قصیدہ کی دین ہے کہ وہ استادانہ کمال کے ساتھ جم کر سو سوا سو بندوں کا متوازن، متین، موثر اور مربوط مرثیہ لکھنے پر قادر ہیں۔

مسدس میں قصہ گوئی ایک مشکل امر ہے، لیکن یہ ساحر صاحب کی قادر الکلامی ہے کہ انھوں نے مرثیہ "دعا اور صحیفۂ کاملہ" میں یہ مرحلہ حضرت امام زین العابدین اور ہشام بن عبدالملک کا واقعہ، جو فرزدق کے مشہور عربی قصیدہ سے ماخوذ ہے، تفصیل و تسلسل سے بیان کر کے بطریقِ احسن طے کیا ہے۔ صرف اس مرثیہ پر ہی موقوف نہیں، چھوٹے متعدد واقعات تو انھوں نے اپنے دوسرے مرثیوں میں بھی جابجا بڑی صحت و صفائی کے ساتھ اور بڑے مربوط انداز میں نظم کیئے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر وہ مرثیہ کے علاوہ طویل بیانیہ نظموں (بشمول مثنوی) کی طرف رجوع کرتے تو ان کی شاعرانہ صلاحیتیں اور بھی زیادہ قوت و برنائی کے ساتھ بروئے کار آتیں اور بڑی شاعری کے امکانات اور بھی زیادہ روشن ہوتے۔

ساحر صاحب پر میر کا یہ مصرع صادق آتا ہے:

بات جو منھ سے نکلتی ہے وہ سنجیدہ ہے

ان کا فطری میلان طبع عالمانہ اور فلسفیانہ ہے، لہٰذا ان کے کلام میں تخیل کے ساتھ ساتھ تفکر کی بھی کارفرمائی ہے۔ انھوں نے اپنے مرثیوں کے لیئے جو موضوعات منتخب کیئے ہیں، وہ نہایت وقیع اور سنجیدہ ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان موضوعات کی تشریح و تصریح انھوں نے بڑی عالمانہ بصیرت اور انتہائی منطقیانہ انداز سے کی ہے۔ اپنے استدلال کے واسطے

قرآن و حدیث، تاریخ، فلسفہ و منطق اور علومِ حاضرہ کی روشنی میں انھوں نے جو مقدمات قائم کیئے ہیں، ان سے معقول نتائج بھی اخذ کیئے ہیں اور موضوعات کی ژولیدگی کے باوصف انھوں نے ایک شاعرانہ پرکاری کے ساتھ اپنے مرثیوں میں ربط و معنویت کو برقرار رکھا ہے۔ لیکن مرثیہ کیونکہ ایک اعتقادی نظام کا حصہ ہے، لہٰذا اس میں تخیل کو مہمیز کرنے کی بہت زیادہ گنجائش نہیں۔ یہاں فکر کی جولان گاہ کی حدود پہلے سے متعین ہیں اور یوں بھی انسانی ذہن، جو خیال کی آماج گاہ ہے، ایک ہٹ دھرم باغی کی طرح ہر نوع کی قدغن کے خلاف مزاحمت کرتا ہے۔ لہٰذا ایک روایتی معاشرہ میں انتشار کے خوف سے خیال کو کھل کھیلنے کی اجازت کیسے دی جا سکتی ہے۔ یہ دلچسپ بات ہے کہ عربی میں گھوڑے کو خیل کہتے اور لفظ خیال اسی مصدر سے مشتق ہے۔ مراکش کی ماہر سماجیات ڈاکٹر فاطمہ مرنیسی (FATIMA MERNISSI) اپنی حالیہ کتاب ISLAM AND DEMOCRACY میں خیل کے متعلق یوں رقم طراز ہیں:

> "THE LISANAL' ARAB REMINDS US THAT A HORSE IS CALLED KHAYL BEAUSE THERE IS DEFIANCE IN ITS GAIT; IT MOVES WITH ARROGANCE. IN ARABIC, WE SAY ' YATLI-QAL-ANAN' ('HE GIVES REIN TO') ABOUT SOMEONE WHO ACTS IN A COMPLETELY EGOTISTICAL AND NARCISSISTIC MANNER."

ساحر صاحب کی مجبوری ہے کہ مرثیہ کے تقاضے میں ان کا شاعرانہ تخیل محض مبالغہ اور حسنِ تعلیل کی حد تک پھیل سکتا ہے۔ روایت اور فقہ کی جکڑبند میں کسی بدعت کی گنجائش کیسے نکل سکتی ہے، نتیجتاً ان کا استدلال بعض عصری حوالوں کے باوصف زیادہ تر روایتی ہے۔ مثلاً:

ہے ذرہ ذرہ سے یکسر عیاں خدا کا وجود
ہے ظاہرا کوئی خالق بھی خلق کا موجود

وہ جس کے ہاتھ جس میں ہے اس جہاں کی بود و نمود
تمام خلقتِ عالم ہے عبد ، وہ معبود
ہنر تو اہلِ ہنر کا کمال ہوتا ہے
سبب کا ہونا مسبب پہ دال ہوتا ہے

یہ حمد حمد کی تو اچھی مثال ہو سکتا ہے لیکن اس کا طرزِ استدلال سر تا سر روایتی فکر پر مبنی ہے۔اس حمد میں انھوں نے خدا کے وجود کے واسطے توحید پرستوں کا جو کائناتی استدلال (COSMOLOGICAL ARGUMENT) پیش کیا ہے، اس کا انحصار سلسلۂ سبب و مسبب پر ہے لیکن منطقی اعتبار سے یہ ایک بودا استدلال ہے، کیونکہ کوئی بھی علت حتمی نہیں ہوتی اس کے لیے ہمیں پیچھے جانا پڑتا ہے ایک اور علت کی تلاش میں اور یہ ایک لامتناہی سلسلہ ہے حتیٰ کہ ہمیں ایک سببِ اولیٰ یا علت العلل کو قیاس کرنا پڑتا ہے کہ جو کائنات کے وجود کی علت ہے۔ لیکن اس استدلال میں سقم ہے جو اس کلاسیکی کہانی سے ظاہر ہے جس میں بچہ اپنی ماں سے پوچھتا ہے کہ یہ ستارے کس نے بنائے ہیں اور ماں کا روایتی جواب سن کر کہ یہ ستارے خدا نے بنائے ہیں، بچہ مزید سوال کرتا ہے کہ تو پھر خدا کو کس نے بنایا ہے۔ تو آپ نے دیکھا کہ سببِ اولیٰ کے مفروضہ سے مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ اگر اس علت العلل کی کوئی علت نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ علت ابدی ہے یعنی ہمیشہ سے موجود تھی اور اگر اس کی ابدیت کو تسلیم کر لیا جائے تو یہ کیوں ضروری ہے کہ علت العلل کوئی ذات یعنی خدا ہی ہو کوئی شے یعنی کائنات علت العلل کیوں نہیں ہو سکتی۔

اس بحث سے تصورِ ذاتِ باری پر اعتراض کرنا ہرگز نہیں بلکہ محض یہ واضح کرنا تھا کہ خدا کا تصور اعتقادی نظام کا حصہ ہے اور اس کا تعلق ایمان سے ہے نہ کہ فلسفیانہ توجیہ سے۔ اگر آپ اس نکتہ کو منطق کے اصول و قواعد سے طے کرنا چاہتے ہیں تو پھر اول تا آخر منطق کے اصول و قواعد کا اطلاق کرنا ہوگا اور منطقی اعتبار سے زیرِ بحث دلیل عرصہ ہوا مسترد ہو چکی ہے۔

روایتی طرزِ فکر اور کہنہ تصورات کے تصرف کی ایک اور دلچسپ مثال ہمیں مرثیہ "دعا اور صحیفۂ کاملہ" میں نظر آتی ہے۔ اس مرثیہ میں کئی مسلسل بندوں میں چہار عناصر کے غلط اور متروک قدیم یونانی تصور کے حوالے سے بڑے ہی خوب صورت شاعرانہ استدلال کے ساتھ انسانی فطرت کی تفسیر کی گئی ہے۔ ایک بند ملاحظہ ہو :

خلقت میں اس کی ہوگئے یکجا جو خاک و باد
ہے خاکسار ہو کے ہوا و ہوس نہاد
ہے آگ بھی جو عنصرِ طبعِ جنوں نژاد
آتش مزاجیوں سے طبیعت میں ہے فساد
پانی جو تین ثلث ہے اس کے وجود میں
کشتیِ جاں رواں ہے ہیمِ ہست و بود میں

اسی حقیقت کو ایک جدید شاعر باقر نقوی نے یوں بیان کیا ہے :

مٹی مٹی کرتا ہے اور بھول گیا پیارے!
ستر فی صد جسم ترا مقروض ہے پانی کا

("شب خون" بابت جولائی ۱۹۹۷ء)

یہ ایک ناقابلِ تردید تاریخی حقیقت ہے کہ عربوں کے فلسفہ کو اور اس حوالہ سے اسلامی فکر کو یونانی فلسفیوں کے نظریات نے بہت متاثر کیا۔ بالخصوص عباسی خلیفہ مامون الرشید کی سرپرستی میں معتزلین نے تراجم کے ذریعہ یونانی علوم و افکار کو اسلامی دنیا میں نہ صرف روشناس کرایا بلکہ ان کو عملاً اپنالیا۔ اسلامی فکر میں ان فلسفیانہ تصورات کے شامل ہونے سے کیا فرق پڑا اس سے یہاں بحث نہیں، لیکن یہ اثر و نفوذ اس قدر وسیع و عمیق تھا کہ اس کے اثرات آج تک ہماری سوچ پر سایہ کیئے ہوئے ہیں۔ درج بالا بند میں عناصر کا جو تصور استعمال ہوا ہے، وہ آج سے دو ہزار سال قبل یونانی فلسفی امپی ڈکلیس (EMPEDOCLES) نے پیش کیا تھا۔ اسلامی دنیا میں اس فلسفی کو یونان کے سات عظیم فلاسفہ میں اولیت کا شرف دیا

جاتا ہے۔اس کی تعلیم میں یہ شامل تھا کہ عناصر چار ہیں یعنی آتش و آب و خاک و باد۔ الکیمیا کی نام نہاد سائنس جو سینکڑوں برس تک فریب کاری کے لیئے استعمال کی گئی، عناصر کے اسی قدیم تصور کی زائیدہ ہے۔ یہاں اس نکتہ کی مزید تفصیل کی ضرورت نہیں۔ کہنے کا مقصد صرف اس قدر ہے کہ اب جبکہ عنصر کی تعریف بالکل منقلب ہو چکی ہے اور سائنس داں قدرتی طور پر پائے جانے والے بانوے عناصر دریافت کر چکے ہیں اور ان کے بنائے ہوئے چودہ مصنوعی عناصر اس کے علاوہ ہیں، ساحر صاحب امپیی دکلیس کے دو ہزار سال پرانے تصور کو اپنے مرثیہ میں استعمال کر رہے ہیں، اور یہ عناصر کے اس روایتی اور فرسودہ تصور کا محض شاعرانہ تصرف یا استعاراتی استعمال نہیں بلکہ یہ اس یونانی روایت کا تسلسل ہے جو ابھی تک مذہبی فکر کو اپنی گرفت میں لیئے ہوئے ہے۔ یقین نہ آئے تو ایک بند اور سن لیجئے:

لازم جو تھا کہ چاروں عناصر کا یہ قوام
اک اعتدال و حسنِ تناسب کا ہے جو نام
اس حسن سے ہو احسنِ تقویم لاکلام
جیسے شرابیں مل کے بڑھاتی ہیں کیفِ جام
لازم ہے اعتدال میں بیشی کمی نہ ہو
کیا لطف گر سلیقے سے محفل جمی نہ ہو

ایک دلچسپ امر یہ ہے کہ شروع میں پیش کیئے گئے بند میں چار عناصر کے قدیم اور غلط تصور کے ساتھ انتہائی جدید سائنسی حقیقت بھی قلم بند کی گئی ہے جو قدیم و جدید کا ایک عجیب گنگا جمنی امتزاج پیدا کر رہی ہے۔ اور وہ یہ ہے:

پانی جو تین ثلث ہے اس کے وجود میں

فزیالوجی کی جدید ترین معلومات کی روشنی میں انسانی جسم میں پانی کی مقدار ستر فی صد بیان کی جاتی ہے۔

ساحر صاحب کے کلام میں پارینہ روایات کے انعکاس کے ساتھ ان کی عصری آگہی بھی

جگہ جگہ جھلکتی ہے۔ مثلاً مرثیہ 'فیصلہ' میں امریکہ کے چیف جسٹس کا حوالہ ان کے حالاتِ حاضرہ سے باخبر ہونے کا مظہر ہے:

کیئے اصول عدالت کے جو علی نے رقم
وہی ہیں آج بھی معیار عدل ، حق کی قسم
مقر ہے اس کا ، سر ان کے حضور کر کے خم
ممالکِ متحدہ کا منصبِ اعظم
نظر میں اس کی عجب ان کی قدر و قیمت ہے
کہ ان سے حجرۂ منصف کی زیب و زینت ہے

میں یہاں ضمناً اس بات کا اضافہ کرنا چاہوں گا کہ حضرتِ علی نے مالک اشتر کے نام اپنے خط میں صرف عدل کے نکات ہی بیان نہیں کیئے بلکہ انتظام و انصرام کے بنیادی اصول بھی طے کر دیئے ہیں۔ ۱۹۷۰ء میں پاکستان انسٹیٹیوٹ آف مینجمنٹ کراچی کے ایک انتظامی کورس میں شرکت کے دوران مجھے یہ دیکھ کر خوش گوار حیرت ہوئی کہ حضرتِ علی کے اس خط کا انگریزی ترجمہ شرکا' میں نصابی جزو کے طور پر تقسیم کیا گیا۔

ساحر صاحب بلاشبہ ایک قادر الکلام مرثیہ نگار ہیں۔ زبان و بیان پر مکمل دسترس اور قابلِ رشک شعری صلاحیت کے ساتھ ساتھ وہ مذہب اور اسلامی تاریخ کی بھی گہری واقفیت رکھتے ہیں۔ ان کے یہ مرثیے قرآن و حدیث اور اسلامی تاریخ کے حوالوں سے معمور ہیں اور ان کے وسیع مطالعہ اور علمیت پر گواہ ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

کہہ کر اجیب دعوۃ الداع لذاں دعان
اپنی ربوبیت کی بتائی ہے اس نے شان

OOO

مری نظر میں ہے مشہور قول پیغمبر
کہ سب سے اچھے علی ہیں قضا کی مسند پر

وہ عدل کرنے میں تم سب سے ہیں بہت بہتر
یہ قولِ مخبرِ صادق رہے جو پیشِ نظر
کبھی کہیں گے عدالت کے واقعے سن کے
گواہ صدقِ نبیؐ پر ہیں فیصلے ان کے
جو منصفوں سے کہ تھے مدعا علیہ وہی
جب ایک مسئلہٗ ملکیت پہ بحث ہوئی
دلیل دی گئی جب قبضہ و تصرف کی
تو قابضوں سے شہادت ہبہ کی بھی مانگی
جو حقِ ارث پہ قرآن کی شہادت تھی
اسے بھی کر دیا رد ، یہ عجب عدالت تھی
کسی کو آرے سے چرا گیا بہ ظلم و ستم
کسی کے واسطے دار اور کسی کو قیدِ الم
کسی کو آگ میں پھینکا کہ ہو وہ جل کے بھسم
مگر انھوں نے نہ مٹنے دیا وفا کا بھرم
اِدھر جفا پہ حریفانِ حق تلے ہی رہے
اُدھر خدا پہ گواہی کو لب کھلے ہی رہے

ساحر صاحب اپنے کلام میں کلاسیکی شاعری کی جملہ رسومیات کو برتتے ہیں۔ان کے مرثیے دیگر شعری محاسن کے علاوہ صنائع وبدائع سے بھی آراستہ ہیں۔ان کے ہاں تلمیحات کا نہایت فیاضانہ استعمال ہوا ہے جو ان کی تاریخی اور مذہبی معلومات پر دال ہے۔چند مثالیں پہلے گزر چکی ہیں،چند یہاں حاضر ہیں:

کہہ اٹھیں جس کو حافظِ شیراز دیکھ کر
من وجہک المنیر لقد نور القمر

عیسیٰ نے گر طریقِ ہدایت بتا دیے
مردے بھی ایک نسخۂ قم سے جلا دیے

قلم کی تعریف کے سلسلہ میں حسن التعلیل کی ایک خوب صورت مثال پیشِ خدمت ہے:

اذاں کے ساتھ مصلے پہ جب یہ آتا ہے
خدا کے شکر کو سجدہ میں سر جھکاتا ہے

رعایتِ لفظی یا ایہامِ تضاد کی ایک پُر لطف مثال:

خوش آیتوں کے ترجمان ہیں گویا
خدائی میں یہ خدا کی زبان ہیں گویا

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں ساحر صاحب محض موضوعاتی مرثیہ لکھنے کے حوالہ سے اپنے عہد سے قریب ہیں، باقی ہر اعتبار سے وہ کلاسیکی روایت کے پابند ہیں۔ اب وہ عمر کی اس منزل میں ہیں جہاں ان کا لہجہ منفرد اور بڑی حد تک قابلِ شناخت ہے، لیکن مجموعی طور پر اگر دیکھا جائے تو وہ اپنے عہد کے مرثیہ گو شعرا کے مقابلہ میں سب سے زیادہ میر انیس سے قریب تر ہیں۔ یہ بات میں پہلے بھی اپنی ایک تحریر میں کہہ چکا ہوں جو طلوعِ افکار بابت مئی ۱۹۹۸ء میں شائع ہو چکی ہے۔ یہاں میں اپنے اس مضمون سے ایک مختصر اقتباس پیش کرنے کی جسارت کروں گا:

"ساحر صاحب کا انداز مرثیہ گوئی اور طریقِ خوانندگی میر انیس سے قریب ہے۔ مرثیہ خوانی میں وہ میر انیس کی طرح آنکھوں کی جنبش اور آواز کے زیروبم سے کام لیتے ہیں اور مفہوم کی وضاحت کے لیے حسبِ ضرورت ہاتھ کے اشاروں سے بھی بتاتے جاتے ہیں، البتہ ان کی آواز اور لہجہ میں ایک دھیما پن ہے جو ان کی نستعلیق اور مرنجان مرنج شخصیت کا غماز ہے۔ جدید مرثیہ گویوں میں وہ ایک قادر الکلام مرثیہ گو ہیں۔ ان کی زبان اور محاورہ پر مکمل گرفت ہے۔ مرثیہ کی زبان کے سلسلہ میں وہ میر انیس کے قائم کردہ معیار پر پورے

اترتے ہیں"۔

روزمرہ شرفاؑ کا ہو ، سلاست ہو وہی
لب و لہجہ وہی سارا ہو ، متانت ہو وہی
سامعین جلد سمجھ لیں جسے ، صنعت ہو وہی
یعنی موقع ہو جہاں جس کا ، عبارت ہو وہی
لفظ بھی چست ہوں ، مضمون بھی عالی ہووے
مرثیہ درد کی باتوں سے نہ خالی ہووے

ساحر صاحب کے مراثی میں کہیں کہیں اپنے عہد کے بعض بزرگ شعراء کی آواز کی گونج بھی سنائی دیتی ہے۔ ایسے شعراء میں جوش اور فیض دو نمایاں نام ہیں۔ جوش زبان کے شاعر تھے، وہ الفاظ سے کھیلتے تھے۔ جوش کے انداز میں لفظوں کی فسوں گری ساحر صاحب کے ہاں بھی جا بجا ملتی ہے۔ ۔۔۔نہ ملاحظہ کیجیے:

ہے اس میں جوشِ شجاعت بھی ، خوف و دہشت بھی
وفا بھی ، عشق بھی ، بغض و عناد و نفرت بھی
جفا بھی ، رحم بھی ہے ، عجز بھی ہے ، نخوت بھی
نظر میں علم کی عظمت بھی ہے ، جہالت بھی
جو کوئی جہل میں بوجہل کا مثیل ہوا
تو کوئی علم میں استادِ جبرئیل ہوا

وہ کہسار ، وہ جنگل ، وہ دشت ، وہ گلزار
وہ شط ، وہ جھیل ، وہ دریا ، وہ قلزمِ ذخار
وہ کہکشاں کے چراغوں کی دل فریب قطار
وہ آبشار ، وہ پانی کی خوش نما دیوار
کمال صنعتِ صانع دکھا رہے ہیں سبھی
پتہ کسی نہ کسی کا بتا رہے ہیں سبھی

کلام کی روانی اور الفاظ کی نشست و برخاست کے اعتبار سے مندرجۂ بالا بند کس قدر جوش کے رنگ سے قریب ہیں، اس بات کا اندازہ جوش کے مرثیہ " زندگی اور موت " کے اس بند سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے :

خدمتِ احباب و ملک و دودمان و اقربا
جود و خلق و رحم و عشق و نفرت و بیم و رجا
شفقت و قربانی و اخلاص و ایثار و سخا
حبِ دنیا ۔ عقبیٰ ، حبِ حق ، حبِ خدا
جزر و مد یہ سب کے سب ہیں جوئے احساسات کے
کتنے لاتعداد رخ ہیں ایک حبِ ذات کے

یہ مماثلت اس قدر قوی ہے کہ اگر ان بندوں کو باہم آمیز کر دیا جائے تو بجز اختلافِ بحر کوئی امتیاز باقی نہ رہے۔

مندرجہ ذیل بند میں انھوں نے فیض کے ایک مصرع کو ہی تضمیناً استعمال نہیں کیا بلکہ پورا بند فیض کے رنگ ہی میں ہے۔ اگر اس بند کو مرثیہ سے علیحدہ کر کے پڑھا جائے تو وہ کسی جدید نظم کا بند لگے گا کہ جس میں عصری حسیت بھی نمایاں ہے، گزارشِ احوالِ واقعی بھی اور بیانِ حسنِ طبیعت بھی :

جہاں نہ رسمِ ستم روز اک نئی ایجاد
جہاں پہ سی دیئے جاتے ہوں لب دمِ فریاد
قفس بدست ہوں بلبل کی گھات میں صیاد
گلوئے عدل پہ چلتا ہو خنجرِ بیداد
وہاں پہ کس سے بھلا داد عدل کی چاہیں
بنے وکیل کریں ، کس سے منصفی چاہیں"

ذرا اس بند کی مکرر قرأت فیض کے درج ذیل بند کے تناظر میں کیجئے:

نثار میں تری گلیوں پہ ، اے وطن کہ جہاں
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اٹھا کے چلے
جو کوئی چاہنے والا طواف کو نکلے
نظر چرا کے چلے ، جسم و جاں بچا کے چلے
ہے اہلِ دل کے لیئے اب یہ نظمِ بست و کشاد
کہ سنگ و خشت مقید ہیں اور سگ آزاد

جب بات مماثلت کی نکلی ہے تو ایک دو مثالیں متقدمین شعراء کے مضامین سے مماثلت کی بھی سن لیجئے۔ غالب کا مشہور شعر ہے:

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

ساحر صاحب کے ہاں غالب کے اس مضمون کی بازگشت ملاحظہ ہو:

بروزِ حشر جو وقتِ حساب آئے گا
فرشتے لائیں گے اعمال نامہ اک اک کا
کریں گے عذر جو ہم اس کا اعتبار ہی کیا
کہ آدمی دمِ تحریر اپنا کوئی نہ تھا

اب میر انیس کا ایک زبان زدِ عام شعر سنئے:

انکار آسماں کو ہے ، راضی زمیں نہیں
اصغر ، تمہارے خوں کا ٹھکانہ کہیں نہیں

ساحر صاحب اسی مضمون کو یوں ادا کرتے ہیں:

لہو صغیر کا شہ نے جو اپنے منھ پہ ملا
زمیں لرزنے لگی ، آسمان تھرایا

زیرِ نظر مرائی میں فنی اعتبار سے ساحر صاحب کی شاعری کا معیار عمومی طور پر بلند ہے۔ میں نے اس مضمون میں یہ بات باتکرار کہی ہے کہ ساحر صاحب ایک قادر الکلام شاعر ہیں، زبان وبیان کی فطری استعداد ان میں موجود ہے اور وہ زبان وبیان اور محاورہ کی صحت کا خاص خیال رکھتے ہیں لیکن اظہارِ مدعا میں اس قدر اہتمام کے باوجود کہیں کہیں ان سے لغزش بھی ہوئی ہے۔ عام قاری کی حیثیت سے بہ اعتبار زبان وبیان جو چند کمزور مقامات مجھے نظر آئے، ان کی نشان دہی کرنے کی جسارت کر رہا ہوں اور یہ جسارت بنظر اصلاح ہے نہ کہ بغرض اعتراض۔ سب جانتے ہیں کہ پابند شاعری میں اور بالخصوص طویل منظومات میں کلام کو مکمل طور پر حشو وزوائد سے پاک رکھنا ایک مشکل امر ہے۔ بعض مرتبہ ضرورتِ شعری کے تحت اور کبھی کبھی سہل انگاری کے سبب بھرتی کے الفاظ اشعار میں در آتے ہیں۔ ان الفاظ کی حیثیت ترازو کے پاسنگ یا پتنگ کے لنگر کی سی ہے کہ اگر چہ اضافی ہیں لیکن توازن برقرار رکھنے کے لیئے ضروری ہیں۔ لیکن جس طرح پاسنگ ترازو کے لیئے اور لنگر پتنگ کے لیئے بدنمائی کا باعث ہوتا ہے، اسی طرح حشو وزوائد شعر کے حسن کو متاثر کرتے ہیں اور ذوقِ سلیم پر گراں گزرتے ہیں۔ ساحر صاحب کے ہاں زوائد کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

تھا ایک اونٹ پہ قاضی کو فیصلہ کرنا
وہ جس کا اونٹ تھا، وہ تو گواہ لانہ سکا

ooo

وہ جب بھی صورتِ حال اس طرح کی پیش آئی
خدا کے حق میں شہادت کی آگئی باری

ان دونوں اشعار میں خط کشیدہ ضمائر بھرتی کی ہیں اور محض ضرورتِ شعری کے تحت وزن پورا کرنے کے لیئے لائی گئی ہیں۔ اب ایک مثال اور ملاحظہ ہو:

دیکھیے یہ مرتبے جو حرم میں امام کے
اب سانپ لوٹنے لگے دل پر ہشام کے

اس شعر میں نہ صرف یہ کہ "اب" کا لفظ زائد ہے بلکہ محاورہ میں بھی غلط تصرف ہوا ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ محاورتاً سانپ چھاتی یا سینہ پر لوٹتا ہے، دل پر نہیں۔ دوسرے یہ کہ محاورہ میں سانپ اسمِ واحد ہے اسمِ جمع نہیں، یعنی ہم کسی کو رشک کی حالت میں دیکھ کر یہ کہتے ہیں کہ اس کی چھاتی پر سانپ لوٹنے لگا نہ کہ سانپ لوٹنے لگے۔

ایک اور مصرع یوں ہے:

علی و فاطمہ کے گھر کی زیب و زینت و زین

اس مصرع میں زیب و زینت و زین، تینوں الفاظ متبادلات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ زیب و زینت کے مرکب الفاظ اگرچہ کلیشے کے ذیل میں آتے ہیں تاہم قابلِ برداشت ہیں، لیکن ان میں لفظِ زین قطعاً بھرتی کا ہے اور اس کا کوئی جواز نہیں بجز یہ کہ یہ مستزاد لفظ وزن و قافیہ کی مجبوری کی وجہ سے لایا گیا ہے۔ ان تینوں الفاظ میں صنعتِ سرحرفی تو یقیناً موجود ہے جس سے مصرع کی ادائیگی میں حرف "ز" کی تکرار سے موسیقیت پیدا ہو گئی ہے لیکن ان ہم معنی الفاظ کے اجماع سے شعر کے مفہوم میں کوئی اضافہ نہیں ہوا ہے۔ ایک آدھ شعر میں ردیف کی مجبوری نے مصرع کو خلافِ محاورہ کر دیا ہے۔ ایک مثال حاضر ہے:

جب وہ زور آئی تھی وہ دور اور ہے
اب یہ زور آلِ محمد کا دور ہے

یہاں پہلا مصرع یوں تو صرفی و نحوی اعتبار سے درست ہے لیکن روزمرہ کے لحاظ سے سماعت پر گراں گزرتا ہے، کیونکہ عموماً جب دو مختلف زمانوں کے واقعات میں تقابل مقصود ہو تو زمانۂ ماضی کے لیئے ماضی کا اور زمانۂ حال کے لیئے حال کا صیغہ استعمال کرتے ہیں۔ ایک اور شعر:

تھا کون سانپ کے پھن پر جو ہاتھ رکھ دیتا
سر اپنا خنجر قاتل کے ساتھ رکھ دیتا

اس شعر میں قافیہ کی مجبوری آڑے آئی اور شعر بے معنی ہو گیا۔ سر خنجر قاتل کے نیچے رکھنا تو خطرہ مول لینے یا جرأت مندی کی بات ہے، لیکن خنجر کے ساتھ سر رکھنے سے یہ معنی ہرگز

نہیں نکلتے کہ جس کا قرینہ پہلے مصرع میں موجود ہے۔

ایک شعر تلوار کی توصیف میں یوں ہے:

کبھی حلول کیا کل کفر کے سر میں
کبھی لگا دیا قط جبرئیل کے پر میں

مجھے نہیں معلوم کہ میں اس شعر کی تعریف کروں یا تنقیص، کیونکہ یہاں تلوار کی ضربت کے حوالہ سے "حلول" کا لفظ غیر مناسب ہی نہیں بلکہ غلط معلوم ہوتا ہے۔ تلوار کا وار تشدد و تصادم سے عبارت ہے۔ ضرب کے نتیجہ میں تلوار سر میں دخول تو کر سکتی ہے، حلول ہرگز نہیں کر سکتی۔ یہ خلافِ واقعہ بھی ہے اور عقلاً و عادتاً بھی محال ہے۔ لیکن اگر ہم اس شعر کو مبالغہ کے حوالہ سے دیکھیں کہ اس صنعت کا استعمال قصیدہ اور مرثیہ میں بہت عام ہے تو ہمیں یہ شعر غلو کی ایک نادر مثال لگتا ہے۔ جیسا کہ ہمیں معلوم ہے غلو صنعتِ مبالغہ کی سب سے زیادہ مستعمل اور تعمیمی شکل ہے، لہٰذا اس کے پسندیدہ ہونے کے لیئے لازم ہے کہ شعر میں کوئی ایسا قرینہ موجود ہو جس سے شعر کا مفہوم واقعیت سے قریب آجائے اور یا پھر ندرتِ خیال ایسی ہو کہ قاری یا سامع کے لیئے ذہنی اہتزاز کا باعث ہو۔ اس زاویئے سے نظر ڈالیں تو ساحر صاحب کا مندرجہ بالا شعر غلو کی ایک منفرد و مستحسن مثال ٹھہرتا ہے۔ اس شعر میں تلوار کے حوالہ سے لفظ حلول کا استعمال اردو شاعری میں شاید پہلی مرتبہ ہوا ہے اور یہ استعمال یقیناً غیر معمولی ہے، یعنی تلوار غنیم کے سر میں اس طرح سما جائے کہ سر اور تلوار میں کوئی تمیز باقی نہ رہے۔ اب آپ اس کو صاحب سیف کا کمال سمجھیئے یا تلوار کی خوبی کہ وہ خاموشی سے اپنا کام کر گئی اور کشتۂ تیغ کو خبر تک نہ ہوئی۔ اس میں نزاکتِ خیال یہ ہے کہ تلوار جو جارحیت کی علامت ہے، وہ ضربت کے نتیجہ میں سر شگافتہ کرنے کے بجائے غیر محسوس طریقہ سے مدِ مقابل کے سر میں دراٰئی۔

غرض یہ تھے ساحر صاحب کے زیرِ نظر مراثی کے وہ چیدہ چیدہ پہلو جو ایک سرسری اور غیر منضبط مطالعہ کے دوران میرے سامنے آئے اور جن پر مجھے رائے قائم کرنے کا موقع

ملا۔ مندرجہ بالا مباحث سے جو نتائج بر آمد ہوئے، وہ مختصراً یہ ہیں:

o یہ مرثیے بہ لحاظ موضوع نہ صرف بجائے خود علیحدہ علیحدہ مربوط شعری اکائیاں ہیں بلکہ ان چاروں مرثیوں کے موضوعات میں ایک معنوی علاقہ ہے جس نے ان کو من حیث المجموع ایک شعری وحدت بنادیا ہے۔

o ساحر صاحب مرثیہ نگاروں کی جدید نسل سے تعلق رکھتے ہیں لیکن جدیدیت سے ان کا تعلق واجبی سا ہے۔ وہ دراصل بنیادی طور پر کلاسیکی روایت کے مرثیہ نگار ہیں اور اپنے مرثیوں میں کلاسیکی رسومیات ولوازم کا مکمل لحاظ رکھتے ہیں۔

o ساحر صاحب ایک پڑھے لکھے باخبر اور قادر الکلام شاعر ہیں۔ وہ بڑے ادق علمی و اخلاقی مضامین کو بھی منطقی استدلال اور معنوی ربط کے ساتھ نہایت چابک دستی سے بڑے شاعرانہ، مربوط اور واضح انداز میں پیش کرتے ہیں۔

o وہ زبان اور علمی و تاریخی حقائق کے سلسلہ میں انتہائی محتاط رویہ رکھتے ہیں اور ان دونوں کے انتخاب میں بڑے شعور اور قوتِ تمیز کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

o مرثیہ کے متقدمین شعرا میں وہ سب سے زیادہ میر انیس سے متاثر نظر آتے ہیں۔ اگرچہ اپنے عہد سے قریب تر بزرگ شعرا مثلاً جوش و فیض سے بھی انھوں نے تتبع کیا ہے۔

o ربط کے بند اور بکائیہ بند ساحر صاحب کے مرثیوں کا وہ نمایاں پہلو ہیں جو ساحر صاحب کی انفرادیت کے ضامن ہیں اور مرثیہ کے میدان میں انھیں اپنے ہم عصر شعرا سے ممتاز کرتے ہیں۔ ان کے مرثیوں میں ربط کے بند تلازماتی رعایت سے اور بکائیہ بند PATHOS یا رقت انگیزی کے اعتبار سے اعلیٰ درجہ کی شاعری کا نمونہ ہیں۔

آخر میں مجھے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ ساحر صاحب کی شاعرانہ تگ و تاز محض مرثیہ اور قصیدہ تک محدود نہیں۔ انھوں نے اردو شاعری کی تقریباً تمام قابلِ ذکر اصناف میں بقدر شوق طبع آزمائی کی ہے، لیکن اپنی انفرادیت کے اظہار کے واسطے انھوں نے مشکل ترین

اصنافِ سخن کو اپنے لیئے منتخب کیا یعنی قصیدہ، مرثیہ اور تاریخ گوئی، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ان تینوں اصناف میں انھوں نے استادانہ کمال پیدا کیا اور شاعری میں یہی ان کی شناخت ہیں۔ جہاں تک ان کے زیرِ بحث مراثی کا سوال ہے تو مجھے یقین ہے کہ ساحر صاحب کے یہ مرثیے پہلے ہی بارہا سامعین سے داد و تحسین وصول کر چکے ہوں گے اور آئندہ بھی بڑے ذوق و شوق کے ساتھ پڑھے اور سنے جاتے رہیں گے۔

کتابیات

۱۔ مرثیہ نگاری اور میر انیس : محمد احسن فاروقی

۲۔ تاریخِ ادبِ اردو : رام بابو سکسینہ

۳۔ اردو مرثیہ : ڈاکٹر شارب ردولوی

۴۔ پنج آہنگ : محمد باقر شمس

۵۔ آیاتِ درد : ساحر لکھنوی

۶۔ صحیفۂ مدحت : ساحر لکھنوی

۷۔ سہ ماہی رثائی ادب کراچی، بابت جنوری فروری مارچ ۲۰۰۰ء

۸۔ ماہنامہ طلوعِ افکار بابت مئی ۱۹۹۸ء

۹۔ ماہنامہ شب خون بابت جولائی ۱۹۹۷ء

۱۰۔ HUNTER MEAD : TYPES AND PROBLEMS OF PHILOSOPHY

۱۱۔ JOHN R. ANDERSON : CONGNITIVE PSYCHOLOGY AND ITS IMPLICATIONS

۱۲۔ RUTH WOOD GAVIAN : UNITED STATES HISTORY

۱۳۔ WILLIAM H. MATHEWS III AND OTHERS: INVESTIGATING THE EARTH

۱۴۔ FATIMA MERNISSI: ISLAM AND DEMOCRACY

۱۵۔ J.A. CUDDON: DICTIONARY OF LITERARY TERMS

۱۶۔ M.H. ABRAMS: GLOSSARY OF LITERARY TERMS

رباعی

دامن دل صد چاک کا سیتے نہ بنے
تلخابہ زندگی بھی پیتے نہ بنے
جیتے ہیں غم شہ کے سہارے ساحر
یہ غم نہ میسر ہو تو جیتے نہ بنے

ساحر لکھنوی

اردو مرثیہ..... روایت سے جدیدیت تک

اردو مرثیہ کی روایت اردو زبان کے آغاز کی تاریخ سے وابستہ ہے۔اس کا تعلق واقعۂ کربلا سے ہے جس نے مذہب اور عقیدہ سے بالاتر ہو کر پوری تاریخ انسانیت پر بڑے گہرے نقوش چھوڑے، ہر مذہب وار ہر عقیدہ کے انسان کی فکر کا رخ موڑ کے ظلم سے نفرت اور مظلومیت سے ہمدردی کے جذبات کو ابھارا اور اعلیٰ انسانی قدروں سے دنیا کو روشناس کیا۔

کربلا کوئی شیعہ سنی جھگڑا، ہندو مسلم فساد یا سرب یہودی اور عیسائیوں کی طرف سے بوسنیائی مسلمانوں کا قتل عام نہ تھا۔یہ دو نظریات کی جنگ تھی۔اس میں دونوں فریق بظاہر ایک ہی مذہب سے تعلق رکھتے تھے مگر ایک فریق اپنے اقتدار کی بقا اور دوام کے لیئے ملوکیت کے پورے جاہ و جلال کے ساتھ، جبر و استبداد کے سارے ہتھیاروں سے لیس ہو کر میدان جنگ میں آیا تھا تو دوسرا اعلیٰ انسانی قدروں کے تحفظ کے لیئے اپنی بے سروسامانی کے باوجود سربکف تھا جن پر انسانیت کی بقا کا دارومدار ہے:

یہ صرصر و سموم سے پھولوں کی جنگ تھی
نیکی میں اور بدی میں اصولوں کی جنگ تھی

(مرثیہ "قطب شاہ سے ساحر تک"، از ساحر لکھنوی)

کربلا خیر و شر کی وہ جنگ تھی جس کی ابتدا آدم و ابلیس سے ہو چکی تھی۔یہ فکر کے دو

مختلف دھاروں کی آویزش تھی ۔ ظلم اور مظلومی ، جبر و صبر اور جارحیت و دفاع ایک دوسرے کے مدِ مقابل تھے:

ظلم کے طوفان میں عزم بشر کی ناؤ تھی
کربلا کردار سے کردار کا ٹکراؤ تھی

(مرثیہ "کردارِ حسینؑ کی تشکیل اور اسلاف" ، از ساحر لکھنوی)

اسی لیئے کربلا عقیدہ اور مذہب اور زمان و مکان کی حدود سے آزاد ایک آفاقی پیغام ہے ۔ یہ ابلیسیت ، طاغوتیت اور ملوکیت کے خلاف پورے عالمِ انسانیت کی نمائندگی کرتی ہے ۔

کربلا نے تاریخ انسانی ہی کو متاثر نہیں کیا، تاریخ ادب کو بھی متاثر کیا خصوصیت کے ساتھ اردو شعر و ادب کو جس کی ابتدا ہی نام حسینؑ سے ہوئی ہے ۔ اس زبان میں نوحے ، سوز و سلام اور مرثیہ کی اصناف کربلا ہی کے حوالہ سے متعارف ہوئیں ۔ یوں تو ان میں سے ہر صنفِ سخن نے زمانہ کے ساتھ ساتھ ترقی کی منزلیں طے کیں لیکن مرثیہ خاص طور سے اپنے تجرباتی دور سے گزرنے کے بعد اپنے حسن و جمال سے اردو کے سر کا تاج ہو گیا اور عظمتوں کی انتہا پر پہنچ کر دنیائے شعر و ادب میں صاحبِ معراج ہو گیا ۔ ابتدا میں جس مرثیہ کی ادبی حیثیت انتہائی غیر معتبر اور اپنے پرائے سب کی تنقید کا نشانہ تھی ، اس مرثیہ نے میر و سودا اور خلیق و ضمیر کے ہاتھوں تراش خراش کے بعد وہ رنگ روپ نکالا کہ ایک عالم اس کا شیدائی ہو گیا اور پھر انیس و دبیر کے ہنر مند ہاتھوں نے آرائش و زیبائش سے نکھار کر اس یوسفِ کنعانِ ادب کو مصرِ سخن کے بازار میں یوں لا کر کھڑا کر دیا کہ زلیخائے شاعری اس پر مر مٹی اور رقیبانِ رثا اس کے جلووں میں یوں کھو گئے کہ عالمِ محویت میں اپنی انگلیاں قلم کر لیں ۔

اردو مرثیہ کی ابتدا نظم یا مثنوی کی ہیئت میں ہوئی تھی اور اس کا انداز نوحہ کا تھا دکنی شاعروں میں قلی قطب شاہ ، فضلی ، وجہی ، اشرف ، ہاشم علی ہاشم مرزا اور درگاہ قلی خاں وغیرہ نے اسی ہیئت میں مرثیے کہے اور ان کے مضامین بیشتر بین و بکا پر مشتمل تھے

اس عہد کے مرثیے، خواہ وہ کہیں بھی لکھے جا رہے ہوں، فکری، فنی اور ادبی حیثیت سے درجۂ اعتبار نہیں رکھتے تھے۔ "بگڑا شاعر مرثیہ گو" کا مقولہ عام تھا، چنانچہ قدرت اللہ شوق نے "غلطیٔ الفاظ بسیار" کہہ کر مرثیہ کی صنف کو اپنے تذکرہ میں شامل کرنے کے قابل بھی نہ سمجھا۔ مصحفی نے بھی مرثیہ کے اس انداز کو مطلقاً ناپسندیدہ قرار دیا۔ سودا نے مرثیہ میں بین وبکا کے اس انداز کو جو کربلا کے عظیم کرداروں کے شایانِ شان نہ تھا ناپسند کرتے ہوئے یہ کہا تھا:

"لازم ہے مرتبہ در نظر رکھ کر مرثیہ کہے نہ برائے گریہ عوام اپنے تئیں ماخوذ کرے"۔

خلیق و ضمیر تک پہنچتے پہنچتے مرثیہ کی ہیئت میں تو انقلابی تبدیلیاں آئیں اور بالآخر اس نے مسدس کی ہیئت اختیار کر لی لیکن اس کی ساخت یعنی اجزائے ترکیبی میں بہت زیادہ تبدیلیاں نہیں ہوئیں۔ سودا قصیدہ کے شاعر تھے، قصیدہ کی تشبیب میں اپنے فکر وفن کے خوب خوب جوہر دکھاتے تھے۔ غالباً اسی وجہ سے انھوں نے مرثیہ میں تمہید کا اضافہ کیا اور اس طرح مرثیہ چہرہ سے روشناس ہوا یا ہم کو مرثیہ کے چہرہ سے شناسائی ہوئی۔ چہرہ کے علاوہ مرثیہ اس وقت تک فضائل، شہادت اور بیانِ مصائب ہی تک محدود رہا۔ یہ کارنامہ ضمیر کا ہے جنھوں نے سراپا، رخصت، آمد، رجز، تلوار اور گھوڑے کی تعریف اور جنگ وغیرہ کا اضافہ کر کے مرثیہ کے کینوس کو اتنا وسیع کر دیا کہ کربلا اپنی پوری معرکہ آرائی اور بھرپور رعنائی کے ساتھ اس میں سمٹ آئی۔ آگے چل کر تعشق اور پیارے صاحب رشید نے ساقی نامہ اور بہاریہ مضامین کو ترقی دے کر مرثیہ میں تغزل کے امکانات کو وسیع تر کر دیا۔ بہار میں تعشق کا ایک بند ملاحظہ ہو:

بلبلیں لاتی ہیں سر کو قدمِ گل کے جو پاس
مسکراتے ہیں یہ غنچے کہ خدا لائے راس
تازگی دیکھے جو سبزے کی تو جاتی رہے پیاس
اوس کھائے ہوئے سبزے کی وہ ٹھنڈی بو باس

کہیں پژمردہ نہ ہو جائے ، یہ ڈر رکھتی تھی
پاؤں سبزے پہ تکلف سے نظر رکھتی تھی

بہاریہ میں پیارے صاحب رشید کی ایک بیت بہت مشہور ہے جو حسن تعلیل کی بڑی حسین مثال ہے:

چار سو پھیلنے کی جا جو نہیں پاتی ہیں
بیلیں گھبرا کے درختوں پہ چڑھی جاتی ہیں

رشید خود اپنے بہاریہ مضامین کی تعریف کرتے ہوئے ایک قطعہ میں کہتے ہیں:

کیوں رشید ، اب تو نہیں فصل بہاری کی ہوس
کثرتِ گل سے ہوا بند عنادل کا نفس
ایک گلچیں جو اٹھاتا ہے تو اٹھتے ہیں دس
انتہا ہو گئی پھولوں کے بیاں سے ، بس بس

حال اب رونقِ گلشن کا ہے بے جا کہنا
پھول جھڑنے لگے ہیں منھ سے ترے ، کیا کہنا

اختصار کے سبب ساقی نامہ سے ان کی بس ایک بیت پیش کروں گا:

نہرِ فردوس ہے کیا مے کا خزینہ ساقی
تیرے ماتھے کی شکن میں ہے پسینہ ساقی

مرثیہ میں ان سب اضافوں کے بعد اس میں اتنی وسعت پیدا ہو گئی کہ اس نے سارے اصنافِ سخن کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا اور اب یہ کہنا بالکل درست ہوا کہ

میدان اس کا اتنا وسیع و بسیط ہے
اصنافِ کُل سخن پہ یہ تنہا محیط ہے
اس میں غزل کا حسن ، قصیدے کی دل کشی
مدحت کی آن بان ، عقیدت کی چاشنی

حمد خدا کا لطف بھی ، نعتِ رسولؐ بھی

پھیلاؤ میں ہے نظم ، تسلسل میں مثنوی
غم بھی ہے ، بزم و رزم بھی ہے ، ہمہمہ بھی ہے
یہ داستانِ درد بھی ہے ، زمزمہ بھی ہے
(مرثیہ "قطب شاہ سے ساحر تک" ، از ساحر لکھنوی)

یوں تو مرثیہ کو وسعت دینے اور اس کی ساخت میں اہم تبدیلیوں کا سہرا ضمیر کے سر ہے لیکن ابتدائی دور کے شعرأ میں ایک نام ایسا بھی ملتا ہے جس نے ضمیر سے تین سو سال پہلے مرثیہ میں سراپا، رخصت، آمد، رجز اور جنگ وغیرہ سب کچھ نظم کیا تھا یہ تھے احمد گجراتی ۔ محمود خاں محمود نے "تاریخ جنوبی ہند" میں صفحہ ۴۷۳ پر ان کے ایک مرثیہ بعنوان "قصۂ حضرتِ علی اکبرؑ" کا ذکر کیا ہے جو کتب خانۂ سالار جنگ کی ایک قلمی بیاض میں محفوظ رہ گیا ہے۔

ڈاکٹر سیدہ جعفر اپنے مقالہ "دکنی مرثیہ اور اس کا پس منظر" میں لکھتی ہیں:

"احمد گجراتی کے اس مرثیہ کے مطالعہ سے اس خیال کی بھی تردید ہوتی ہے کہ چہرہ، سراپا، رخصت، آمد، رجز، جنگ، شہادت اور بین جو مرثیہ کے اجزائے ترکیبی سمجھے جاتے ہیں، دورِ مابعد میں شمالی ہند کے شعرأ کے اضافے ہیں ۔ ان سے پہلے تین سو سال قبل ایک دکنی مرثیہ نگار نے اپنے محدود لفظی خزانہ اور اظہار کے ناتراشیدہ پیکروں کی مدد سے مرثیہ کے ان تمام اجزائے ترکیبی کو بڑے سلیقے اور اعتماد کے ساتھ پیش کیا ہے"۔

ڈاکٹر سیدہ جعفر کے اس انکشاف کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ دوسرے دکنی شعرأ احمد گجراتی کی اس روش کو نہ اپنا سکے ۔ بعد کے آنے والے شعرأ کو یہ راہ ضمیر ہی نے دکھائی اور انھیں کی پیروی میں ان کے بعد کے سب شعرأ حتیٰ کہ انیس و دبیر نے بھی مرثیہ کی اس ساخت کو اپنایا اور اپنی ہنرمندی سے اس میں چار چاند لگادیئے ۔ اس طرح مرثیہ کی وہ روایت جو آغاز میں فنی، فکری اور ادبی حیثیت سے ہدفِ تنقید تھی، ترقی کے سارے

منازل طے کر کے اپنے نقطۂ تکمیل پر معراجِ کمال تک پہنچ گئی اور اردو زبان کو اس قابل کر دیا کہ وہ دنیا کی ہر زبان سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مرثیہ نے جب بیسویں صدی میں داخل ہو کر اپنے سفر کو آگے بڑھایا تو کچھ بدلتے ہوئے حالات اور عصری تقاضوں کے پیش نظر اور کچھ ایسے نقادوں کے زیر اثر جنھوں نے انیس و دبیر کے ہاتھوں معراج پائے ہوئے مرثیہ کو بھی محض رونے رلانے کی چیز اور ایک گروہ کی مذہبی شاعری قرار دے کر مسترد کر دیا اور بظاہر اصلاح کے نام پر ایسی تجویز لے کر آئے کہ مرثیہ میں بیان مصائب وغیرہ کو ترک کر کے صرف مقاصدِ کربلا کو پیش کیا جائے۔ جدید مرثیہ نگاروں نے مرثیہ میں تبدیلیاں لانے کی کوششیں شروع کر دیں۔ تیغبازرزمیہ کو کلیتاً مرثیہ سے خارج کر دیا گیا، کردار نگاری اور مرقع نگاری سے مرثیہ کو پاک کرنے کا عزم کیا گیا، حتیٰ کہ رثا کو بھی مرثیہ کے لیئے بڑی حد تک غیر ضروری قرار دے دیا گیا۔ کسی نے مظلومیت کو امام حسینؑ کی شان کے خلاف سمجھا اور کہا کہ وہ مظلوم نہیں تھے، مجاہد تھے۔ کسی نے مرثیوں میں مصائب پر امام حسینؑ کے گریہ کو قابل اعتراض جانا وار اسے بزدلی کی علامت قرار دے کر یہ کہا کہ ہمارا ہیرو بزدل نہ تھا، بہادر تھا۔ کسی نے کہا کہ مرثیہ رلانے کے لیئے نہیں، صرف گداز پیدا کرنے کے لیئے ہے۔ اب یہ سوال کہ مرثیہ سے کردار نگاری، مرقع نگاری، رزمیہ اور رثا وغیرہ نکال دینے کے بعد مرثیہ میں کیا رہ جاتا ہے، اس کا فیصلہ تو ہر شخص اپنی اپنی سوچ اور اپنے اپنے نقطۂ نظر کے مطابق کرے گا لیکن اس تحریک کے نتیجہ میں مرثیہ میں اہم اور بنیادی تبدیلیاں آئیں۔ ہیئت کے اعتبار سے تو ہر مرثیہ مستثنیات کو چھوڑ کر مسدس ہی میں کہا جا رہا ہے اس لیئے کہ صدیوں کے تجربات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اس صنفِ سخن میں اظہار کے لیئے اس سے زیادہ مناسب ہیئت اور کوئی ہے ہی نہیں۔

فکری اعتبار سے ایک مثبت تبدیلی یہ آئی کہ مرثیہ کے چہرہ میں مناظرِ فطرت کے بجائے اصلاحی مضامین اور عصری اہمیت کے مسائل کو موضوع بنایا جانے لگا جس

کا آغاز مرزا دبیر کے نامور فرزند مرزا محمد جعفر اوج کر چکے تھے جس کی مثالیں معراج الکلام میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ اس طرح جدید مرثیہ نگاروں کے لیئے نئی راہیں کھل گئیں اور نئے نئے موضوعات پر اپنی فکر کے جوہر دکھانے کا موقع مل گیا۔ دوسری مثبت تبدیلی یہ آئی کہ مقصدِ شہادت کی ترجمانی پر زیادہ زور دیا جانے لگا جس کی وجہ سے امام حسینؑ اور ان کے عظیم رفقاؑ کے کردار کی عظمتوں کے بعض ایسے رخ زیادہ نمایاں ہونے لگے جن پر کلاسیکی مرثیوں میں بہت کم توجہ دی گئی تھی۔

اس صورتِ حال کے پیش نظر اگر ہم دیکھیں تو جدید مرثیہ میں موضوع اور فکر کے اعتبار سے تو مثبت تبدیلیاں آئیں مگر رزمیہ، کردار نگاری، مرقع نگاری، جذبات نگاری اور بڑی حد تک رثا سے بھی اس کا دامن خالی ہو گیا جس کی وجہ سے یہ اس وسعت فنی عظمت اور شعری حسن و جمال سے محروم ہو گیا جس نے نہ صرف اس کو دیگر تمام اصنافِ سخن سے ممتاز کر دیا تھا بلکہ اردو شاعری کو دوسری زبانوں کی بڑی شاعری کے مقابل سر بلند کر دیا تھا۔

مرثیہ کے ان عناصرِ ترکیبی کی اہمیت پر جس سے جدید مرثیہ محروم ہو گیا ہے، یہاں گفتگو کرنے کا محل نہیں مگر میں رزمیہ اور رثا سے متعلق اختصار کے ساتھ عرض کرنا چاہوں گا۔

رزمیہ کی اہمیت کے کئی پہلو ہیں، میں صرف ایک کی طرف توجہ دلاؤں گا۔ کربلا کوئی عقیدہ اور افسانہ نہیں ہے، تاریخ اور حقیقت ہے اور یہ ایک بہت روشن تاریخی حقیقت ہے کہ کربلا کا جہاد صرف جہاد باللسان نہ تھا، جہاد بالسیف بھی تھا۔ یہ صرف کردار کی جنگ نہ تھی، تلوار کی جنگ بھی تھی جس میں مٹھی بھر جاں بازوں نے تین دن کی بھوک پیاس میں ہزاروں اور بروایتے لاکھوں کے مقابلہ میں ایسے ہمہمہ اور طنطنہ کے ساتھ ایسی یادگار جنگ کی اور شجاعت اور استقامت کا ایسا فقید المثال مظاہرہ کیا کہ یقیناً اس کی نظیر تاریخ عالم و آدم میں نہیں مل سکتی۔ شجاعت کے یہ عظیم الشان کارنامے آبرومندی کے ساتھ حق کے لیئے جینے اور عزت کے ساتھ حق کے

لیئے مرنے کا حوصلہ دیتے ہیں اور امام حسینؑ کے اس مشہور قول کی عملی تفسیر ہیں کہ ذلت کی زندگی سے عزت کی موت بہتر ہے۔ یہ کربلا والوں کی عظمتِ کردار کا ایک بہت نمایاں رخ ہے جس کو مرثیوں میں جگہ دے کر متقدمین نے تاریخ کی اس تاب ناک حقیقت کو ہمیشہ کے لیئے محفوظ کر دیا کہ امام حسینؑ اور ان کے جاں بازوں نے ظلم کے خلاف ہتھیار ڈال کر اپنے گلے تلواروں کے نیچے نہیں رکھ دیئے تھے کہ سرِ تسلیم خم ہے بلکہ امکانی حد میں پوری قوت کے ساتھ آخری سانس تک جنگ کر کے یہ بتا دیا تھا کہ ظلم کی طاقت کتنی ہی زبردست کیوں نہ ہو۔ کسی بھی منزل پر اس کے خلاف ہتھیار نہیں ڈالنا چاہیئے اور اپنی پوری امکانی قوتوں کے ساتھ اس سے نبرد آزما ہونا چاہیئے یہاں تک کہ یا دشمن کو شکستِ فاش ہو یا اپنے دست و بازو قلم ہو جائیں اور سر کٹ جائیں۔ یہی حقیقی فتح اور سربلندی کی دلیل ہے۔

آج رزمیہ کے خلاف یہ دلیل دی جاتی ہے کہ اب تلوار اور گھوڑے کا زمانہ نہیں ہے مگر کیا کیا جائے کہ کربلا کی جنگ گھوڑوں کی پیٹھ پر تلواروں اور نیزوں ہی سے لڑی گئی تھی۔ اب اگر زمانہ بدل گیا ہے تو تاریخ تو نہیں بدلی جا سکتی۔ تلوار اور گھوڑے کا زمانہ نہ ہونا اس کا جواز نہیں ہے کہ شجاعت کی ان عظیم داستانوں اور بلندیٔ کردار کے اس رخ کو نظر انداز کر دیا جائے۔ رزمیہ کو جدید مرثیہ سے نکال کر ایک طرف تو ہم نے کربلا کی ایک اہم تاریخی حقیقت کو نظر انداز کیا ہے اور دوسری طرف مرثیہ کی وسعتوں کو محدود کر دیا اور اس بحرِ بےکراں کو ایک جوئے آب بنا دیا ہے۔ اس طرح مرثیہ کی فنی عظمت کو یقیناً نقصان پہنچا ہے۔

ہندوستان کے معروف اہلِ قلم جناب شریف الحسن نقوی عصری تقاضوں کے پیشِ نظر جدید مرثیہ کی بھرپور تائید کرنے کے باوجود اپنی متوازن فکر کی بدولت اس نتیجہ پر پہنچے جس کا اظہار انھوں نے اپنے مقالہ "اردو مرثیہ، آج اور کل" میں کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

"جہاں تک رزمیہ عناصر کا تعلق ہے، ان میں کمی آجانے سے

مرثیہ کے فنی مرتبہ کو ضعف پہنچا ہے ۔اسی طرح محاکات کی جو فضا
اور جذبات نگاری کا جو انداز قدیم مرثیہ گویوں کے یہاں ملتا ہے،
جدید رنگ کے مرثیہ نگار اس کے کچھ زیادہ کامیاب نمونے پیش نہیں
کرسکے اور اس ضمن خاص میں وہ اپنے پیش رو مرثیہ نگاری سے بہت
پیچھے ہیں ۔جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں، جدید مرثیہ میں ان عناصر کی
کمی فنی تقاضہ اور اصلاحی جذبہ کا نتیجہ نہیں، اسے جدید مرثیہ نگاروں کی
تن آسانی اور عجز شاعرانہ ہی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے ۔مجموعی طور پر کہا
جاسکتا ہے کہ جدید مرثیہ اپنی بعض خوبیوں کے باوجود خالص فنی
نقطۂ نظر سے قدیم مرثیہ کے مرتبہ کو نہیں پہنچتا۔

جہاں تک رثائی یا بیان مصائب کا تعلق ہے، یہ خود ایک مستقل موضوع ہے۔ میں اختصار کے ساتھ یہ عرض کروں گا کہ رونے کو بزدلی یا خلافِ صبر سمجھنے والے حضرات نے اس بات پر توجہ نہیں فرمائی کہ نہ ہر قسم کا رونا بزدلی ہے اور نہ خلافِ صبر۔ مثلاً آنے والی مصیبت کے خیال سے رونا تو یقیناً بزدلی ہے مگر بچہ کا بھوک سے رونا جو غذائی طلب کا اشارہ ہے یا عارفانِ خدا کا خوفِ خدا سے رونا جو معرفت کی دلیل ہے اور اسی طرح چاہے جانے والوں کے عارضی یا دائمی جدائی کے غم میں چاہنے والوں کا رونا جو محبت کا تقاضہ ہے، یہ نہ بزدلی ہے نہ خلافِ صبر ہے ۔انبیائے مرسلین اور ائمہ و معصومین کے گریہ کرنے کے واقعات صرف تاریخ ہی میں نہیں، قرآن مجید تک میں مذکور ہیں ۔جنابِ آدمؑ کا فراقِ حوا اور قتلِ ہابیل پر گریہ، جنابِ یعقوبؑ کا جنابِ یوسفؑ کی عارضی جدائی میں رو رو کر آنکھوں کی بینائی زائل کر لینا، خود رسالت مآب کا اپنے بیٹے جنابِ ابراہیمؑ کی وفات پر گریہ، حضرتِ علیؑ کا قبرِ فاطمہؑ پر گریہ اور جنابِ فاطمہؑ کا اپنے پدر بزرگوار کی رحلت اور ان کے بعد نازل ہونے والے مصائب پر اتنا گریہ کہ اہل مدینہ شاکی ہوگئے.... اس کو بزدلی اور توہینِ صبر کون کہے گا؟ یہ سب کی سب ہستیاں امام حسینؑ ہی کی طرح انسانیت کے بلند ترین درجات پر فائز تھیں ۔خود امام حسینؑ کے

متعلق ایسے واقعات کربلا کی تاریخ میں محفوظ ہیں۔ مثلاً جنابِ قاسم کی رخصت کے وقت امام حسینؑ نے ان کو گلے لگایا تو دونوں روئے اور اتنا روئے کہ بے ہوش ہو گئے دراصل گریہ اور صبر کے مفہوم کو سمجھنے میں غلطی جو غیر ارادی طور پر سرزد ہوئی یا بالوجوہ ارادی طور پر پیدا کی گئی، اس اعتراض کا سبب بنی۔ گریہ تو انسانی فطرت ہے۔ یہ احساس کرب کے فطری اور بے ساختہ اظہار کا نام ہے۔ یہ انسان کی فطرت میں اس محبت، گداز اور تڑپ کی دلیل ہے جو اس کو جمادات سے ممیز کرتی ہے۔ جو دل احساس درد سے خالی ہو، وہ دل نہیں پتھر ہے۔ امام حسینؑ اور ان کے سارے رفقاء پورے انسانی احساسات کے ساتھ کربلا میں آئے تھے۔ ان کے دل احساسِ درد سے خالی نہیں تھے۔ وہ انسان تھے، مشینی روبوٹ نہیں۔

غم تو آفاقی حقیقت ہے اور اظہارِ غم اثر انگیزی میں ہر جذبہ سے زیادہ توانائی رکھتا ہے۔ احساسِ درد کا تعلق انسان کے جذبات سے ہے جو مختلف رشتوں کے حوالہ سے اور مختلف حالات میں مختلف شدتِ اظہار رکھتے ہیں، اسی لیئے جذبات نگاری مرثیہ کا ایک اہم جزو رہی ہے۔ یہ جذبات نگاری ہی کا کمال ہے کہ انسان دوسرے کے احساسات کو اپنے اندر سمو لیتا ہے اور اس کے کرب کی ٹیس اپنے دل میں محسوس کرنے لگتا ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ظلم کے مقابلہ میں مظلومیت اور حق و انصاف کے لیئے اپنے دل میں ایک تڑپ سی محسوس کرنے لگتا ہے۔ یہی عزائے حسینؑ کا مقصد ہے کہ لوگوں کے دلوں میں ظلم سے نفرت اور مظلومیت کے لیئے ہمدردی کے جذبات پیدا کیئے جائیں اور یہی ہمارا کربلا کے شہیدوں کو خراجِ عقیدت ہے۔

بقول حسرت موہانی:

غم نہیں ممکن تو چند آنسو ندامت کے ہی\
کچھ تو آخر خونِ شہیداں چاہیئے

عہدِ حاضر کے ایک معروف نقاد پروفیسر محمد زماں آزردہ مرزا دبیر کی جذبات نگاری پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مرثیہ میں اس وقت تک تاثیر پیدا ہو ہی نہیں سکتی جب تک اس کی تہہ میں انسانی جذبات نہ ہوں"۔

غمِ حسینؑ کی اشاعت خود ظلم و ستم اور جور و جبر کے خلاف ایک مؤثر جہاد کی حیثیت رکھتی ہے۔ جب ظلم اور مظلومیت کی حدیں اور جبر و صبر کی انتہا کے واقعات لوگوں کے سامنے آتے ہیں تو ظلم سے نفرت اور مظلومیت سے ہمدردی فطری طور پر پیدا ہوتی ہے۔ رئیس امروہوی مرحوم جیسے بالغ نظر اور جدیدیت پسند شاعر بھی اس نقطۂ نظر کی تائید میں کہتے ہیں:

غمِ شبیر نے ہر عہد کو بخشا ہے شعور
جس کے آگے کبھی چلتا نہیں باطل کا غرور
چشمِ بینا سے نہیں ہے یہ حقیقت مستور
خود ہے تاریخ کو اس غم کی اشاعت منظور
جب بھی رنگِ ستم و جور بکھر جاتا ہے
ایسے عالم میں یہ غم اور نکھر جاتا ہے

تحمل کے ساتھ گریہ ہرگز صبر کے خلاف نہیں اور نہ بزدلی ہے۔ جوان بیٹا آنکھوں کے سامنے دم توڑے اور ضعیف باپ غم کی شدت سے رو نہ دے، یہ خلافِ فطرت ہے۔ اس حد کا ضبط بے حسی یا قساوتِ قلبی کے زمرہ میں شمار کیا جائے گا۔ اس لیئے اس عہد کے ایک جلیل القدر عالم دین، خطیب اور اہل قلم سید العلماء مولانا علی نقی صاحب مرحوم نے ایک تقریر میں یہ کہا تھا کہ ہمارے ایک شاعر نے یہ کہہ تو دیا کہ

جو جواں بیٹے کی میت پر نہ رویا ، وہ حسینؑ

لیکن کیا یہ حقیقت ہے کہ امام حسینؑ جواں بیٹے کی میت پر نہ روئے ہوں گے۔ میں یہ ضرور عرض کروں گا کہ البتہ گریہ کا بیان اگر اضطرار و اضطراب کی اس حد کو ظاہر کرے جو انسانیت کے ان بلند درجات کے شایانِ شان نہ ہو جس پر امام حسین فائز تھے یا حد سے بڑھے ہوئے اضطرار سے شکوہ زبان پر آجائے جو عظمتِ انسانی کے خلاف ہے تو

بے شک ایسا بیان قابلِ ستائش نہیں ہو سکتا۔

اب اس بارے میں عہدِ موجود کے ہندوستان کے ایک معتبر محقق و نقاد ڈاکٹر صادق نقوی کی رائے بھی سن لیجیئے۔ وہ "باقر امانت خانی کی مرثیہ گوئی" پر گفتگو کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"مرثیہ اپنی ساری وسعتوں کے باوجود بہر حال شہیدانِ کربلا کی عظمتوں کے اظہار کے اور ان کے مصائب پر غم والم کو ابھارنے کی نیت سے لکھا جاتا ہے، اس لیئے مرثیہ میں دونوں اجزاء نہ ہوں تو اسے مرثیہ کہنا میرے اپنے خیال میں مناسب نہیں"۔

میں محترم ڈاکٹر صادق نقوی سے پوری طرح متفق ہوں، مگر اس ساری گفتگو کا ماحصل یہ ہرگز نہیں ہے کہ امام حسینؑ کی زبان سے بین وبکا کو جائز سمجھتا ہوں۔ اس باب میں گزشتہ مرثیہ نگاروں سے خاص حالات کے مخصوص تقاضوں کی بناٗ پر کچھ زیادتیاں ہوئی ہیں۔ شدتِ غم سے آنکھوں سے آنسوؤں کا بہہ نکلنا اور بات ہے اور بین وبکا اور۔ خواتین کا معاملہ بہر حال الگ ہے مگر اس میں بھی حفظِ مراتب کا خیال ضروری ہے مگر مرثیہ بیانِ مصائب اور رثا سے خالی ہو تو اس کو مرثیہ نہیں کہا جا سکتا۔ اس ضمن میں کلاسیکی اور جدید دونوں مرثیہ نگار افراط و تفریط کا شکار ہوئے ہیں۔

آخر میں مرثیہ میں جدیدیت کے موجودہ انداز پر حضرتِ نسیم امروہوی مرحوم کی رائے بھی ملاحظہ فرمائیے۔ وہ نہ صرف اس عہد کے بہت بڑے مرثیہ نگار تھے بلکہ ایک قول کے مطابق جدید مرثیہ کے اولین معمار بھی تھے۔ انھوں نے جدید مرثیہ میں جذب و اثر کی کمی کو محسوس کیا جو مرثیہ کا خاصہ ہے۔ چنانچہ باقر امانت خانی کے مجموعۂ مراثی "امانتِ غم" کے صفحہ ۵۹ پر تبصرہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

"باقر کا حسن اعتدال ہے۔ وہ مرثیہ میں نہ تو یکسر قدیم ہیں اور نہ سراسر رو بھی قسم کی جدیدیت کے علم بردار"۔

میں بھی عرض کروں گا کہ دراصل اعتدال ہی وہ چیز ہے جو ہر شے کو حسن عطا کرتی ہے

بعض جدید مرثیہ نگار حضرات کے یہاں اس اعتدال کی کمی نے جدید مرثیہ کی فنی اور ادبی حیثیت کو مجروح کیا ہے اور اس صنفِ سخن کے اس نقطۂ عروج سے بہت نیچے گرادیا ہے جس پر یہ سیکڑوں سال کی تدریجی ترقی کے بعد فائز ہوا تھا۔ اگر جدید مرثیہ میں اعتدال کے ساتھ ان عناصرِ ترکیبی کو برتا جائے جو اس صنفِ سخن کے مزاج کا تقاضہ اور اس کی شناخت اور اس میں اور عام موضوعاتی یا غیر کربلائی نظموں میں حدِ فاصل قائم کرتے ہیں تو جدید مرثیہ کی ترقی کے امکانات بہت روشن ہوں گے اور اس کا مستقبل تابناک ہوگا۔

مرثیہ

دعا اور صحیفۂ کاملہ

تعدادِ بند...... ۱۰۵

رباعی

دنیا کے الم خوشی سے سہنے والے
مصروف غمِ شاہ میں رہنے والے
دیتی ہیں دعا دل سے یہ زہرا ان کو
جیتے رہیں یاحسین کہنے والے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دعا اور صحیفۂ کاملہ

(۱)

خلقت کا ایک رازِ پُراسرار ہے بشر
شبنم مزاج ہے تو شرربار ہے بشر
گل ہے خزف، گہے درِ شہوار ہے بشر
ہے شاخِ گل کہیں، کہیں تلوار ہے بشر
مجبوریوں کی حد میں جو مختار ہوگیا
اپنی انا میں آپ گرفتار ہوگیا

(۲)

خلقت میں اس کی ہو گئے یکجا جو خاک و باد
ہے خاکسار ہو کے ہوا و ہوس نہاد
ہے آگ بھی جو عنصرِ طبعِ جنوں نژاد
آتش مزاجیوں سے طبیعت میں ہے فساد
پانی جو تین ثلث ہے اس کے وجود میں
کشتیٔ جاں رواں ہے یمِ ہست و بود میں

(۳)

یہ شعلہ و شرر بھی ہے، آب و حباب بھی
خو میں صبا مزاج بھی صرصر رکاب بھی
اک مشتِ خاک و ذرۂ بے آب و تاب بھی
برجِ شرف میں آئے تو ہے آفتاب بھی
چاہے تو دیوِ نفس کو دم میں پچھاڑ دے
گر سرکشی پہ آئے تو دنیا اجاڑ دے

(۴)

لازم جو تھا کہ چاروں عناصر کا یہ قوام
اک اعتدال و حسنِ تناسب کا ہے جو نام
اس حسن سے ہو احسنِ تقویم لا کلام
جیسے شرابیں مل کے بڑھاتی ہیں کیفِ جام
لازم ہے اعتدال میں بیشی کمی نہ ہو
کیا لطف گر سلیقہ سے محفل جمی نہ ہو

(۵)

رکھنا تھا جو درست عناصر کا یہ قوام
خلاقِ جز و کل نے کیا اس کا انتظام
بھیجے طبیبِ حاذق و شافی و نیک نام
وہ جن کے آستاں تھے شفاخانۂ عوام
لائے تھے اپنے ساتھ جو نسخے علاج کے
حکمت میں فرد تھے وہ معالج سماج کے

(۶)

نسخے علاجِ روح کے تھے اتنے کامیاب
ہونے نہ دیں قوامِ عناصر کو جو خراب
مٹی کا ہو جمود کہ پانی کا اضطراب
شہ زوریاں ہوا کی کہ آتش کا التہاب
آئے نہ فرق ان کے جلال و جمال میں
اپنی جگہ رہیں یہ حدِ اعتدال میں

(۷)

عنصر ہوا کا مائلِ حرص و ہوا نہ ہو
پانی حیات بخش ہو، سیلِ بلا نہ ہو
مٹی سے انکسار کا جوہر جدا نہ ہو
انساں غرور و کبر سے خود کبریا نہ ہو
آتش بھڑک کے لائے نہ راہِ فساد پہ
مائل کرے یہ نفس سے اس کو جہاد پہ

(۸)

اس کے لیئے طبیب خدا نے جو چن لیئے
آدم سے تا بہ ختمِ رسل سب نبی ہوئے
واقف انھوں نے کرکے گناہ و ثواب سے
انسان کو فلاح کے رستے دکھا دیئے
یہ تاکہ باخبر ہو عمل کے مآل سے
اس کے قدم ہٹیں نہ رہِ اعتدال سے

(۹)

آئے صحیفے لے کے جو دنیا میں انبیا
نسخہ علاجِ روح کا اک اک تھا بے بہا
لیکن بدلتے دور میں جوں جوں مرض بڑھا
تو اک کے بعد دوسرا نسخہ عطا ہوا
توریت سے جو معصیتوں کی دوا ملی
انجیل سے ہر ایک طرح کی شفا ملی

(۱۰)

عیسیٰ نے گر طریقِ ہدایت بتا دیئے
مردے بھی ایک نسخہ قم سے جلا دیئے
لوگوں نے جب یہ سارے طریقے بھلا دیئے
قرآن نے نجات کے رستے دکھا دیئے
گو ہر کتاب اپنی جگہ لاجواب ہے
قرآن ان کتابوں میں ام الکتاب ہے

(۱۱)

ذہنِ بشر سے شر کو مٹاتی ہے یہ کتاب
آتش مزاجیوں کو بجھاتی ہے یہ کتاب
انساں کو خاکسار بناتی ہے یہ کتاب
حرص و ہوا کے قصر کو ڈھاتی ہے یہ کتاب
جتنے بھی نسخے آئے ہدایت کے باب میں
سب کا نچوڑ آگیا ام الکتاب میں

(۱۲)

اب بھی جو معصیت پہ ہو مائل کوئی بشر
اب بھی اگر لذائذِ دنیا پہ ہو نظر
اب بھی بشر میں کروٹیں لیتا رہے جو شر
اب بھی جو عنصر آگ کا حاوی ہو خاک پر
مجبور ہو کے اس سے بشر جو خطا کرے
پھر بہرِ مغفرت وہ کہاں جائے؟ کیا کرے؟

(۱۳)

ہے خالقِ بشر تو مگر رحمتِ تمام
وہ جانتا تھا ہے جو عناصر کا یہ قوام
اس کو بگاڑنا ہی ہے ابلیسیت کا کام
اس واسطے خدا نے کیا یہ بھی انتظام
خود عفو کی طلب کا طریقہ سکھا دیا
انسان کو دعاؤں کا نسخہ بتا دیا

(۱۴)

خالق نے دی جو حضرتِ داؤد کو زبور
اس میں فقط دعائیں تھیں اللہ کے حضور
جس سے کھلا یہ راز کہ ہر بندہ غفور
دل سے کرے دعا تو ضرر سے بچے ضرور
جب وہ زبور آئی تھی وہ دور اور ہے
اب یہ زبورِ آلِ محمدؑ کا دور ہے

(۱۵)

اے دل ، جو فکرِ عفوِ گناہ و قصور ہو
ذکرِ زبورِ آلِ محمدؐ ضرور ہو
جاری سبیلِ رحمتِ ربِ غفور ہو
سب کو حصول لذتِ کیف و سرور ہو
ہر سطر ہو جو موجِ شرابِ ولا مجھے
اک اک ورق صحیفہ کا ہو میکدا مجھے

(۱۶)

صلِّ علیٰ وہ میکدہ حق کا در کھلا
اللہ کے کرم کی اٹھی جھوم کر گھٹا
بس اب خدا کے نام سے ہو دور ساقیا
جامِ دعا میں مجھ کو مئے مغفرت پلا
چھینٹوں سے جس کے سرد شرارِ عذاب ہو
منبر پہ جو پیوں تو زیادہ ثواب ہو

(۱۷)

ساقی ، خدا کے نام پہ جامِ ولا پلا
نشہ اتر رہا ہے ، بس اب جلد لا ، پلا
جب تک ہے معصیت کا مری سلسلہ ، پلا
رحمت بھی کہہ رہی ہے کہ ہاں ہاں پلا پلا
ساغر مئے کرم کے بصد اہتمام دے
اک اک گناہ پہ اسے ایک ایک جام دے

(۱۸)

ساقی ، یہ میکدہ ، یہ صحیفہ دعاؤں کا
ایک ایک حرف جس کا ہے جامِ مئے ولا
ہر سطر موج بادۂ عرفانِ کبریا
پی کر جسے معاف ہو رندوں کی ہر خطا
کیوں صرف ساغرِ مئے عرفاں کہیں اسے
جائز ہے گر دعاوں کا قرآں کہیں اسے

(۱۹)

واللہ ، کیا صحیفۂ کامل ہے یہ کتاب
حق کے نصابِ عفو میں داخل ہے یہ کتاب
سوز و گدازِ قلب کا حاصل ہے یہ کتاب
دل ہے شکستہ ناؤ تو ساحل ہے یہ کتاب
قرآں کا حاشیہ ہے ، ہدایت شعار ہے
یہ منزلِ تقربِ پروردگار ہے

(۲۰)

اس کی دعاؤں میں مئے عرفاں کا ہے مزا
اک جاودانہ کیف یہ کردیتی ہے عطا
دیتی ہے یہ خدا سے تکلم حوصلا
کوئی بھی اس وسیلے سے مانگے اگر دعا
خالق زباں کو اس کی وہ حسنِ مقال دے
لفظوں میں جو نزاکتِ احساس ڈھال دے

(۲۱)

اس میں بھی ہے یہ حکم کہ انساں دعا کرے
اور بدگمان ہو نہ دعا کے مآل سے
دستک جو بار بار کوئی در پہ آ کے دے
دروازہ کھل ہی جاتا ہے سائل کے واسطے
ہاں، شرط ہے دعا میں خضوع و خشوع ہو
پوری طرح خدا کی طرف دل رجوع ہو

(۲۲)

قرآں میں بھی خدا نے یہ ارشاد کر دیا
کرتا ہوں میں قبول جو مانگے کوئی دعا
ہے کون بےنواؤں کی سنتا ہے جو نوا
اُدعونی استجب لکم اس نے ہی تو کہا
جب تو دعا عبادتِ ربِ غفور ہے
اس سے نہ مانگنا بھی دلیلِ غرور ہے

(۲۳)

حمدِ خدا بھی ایک وسیلہ دعا کا ہے
نعتِ نبیؐ بھی ایک وظیفہ دعا کا ہے
مدحِ علیؑ بھی ایک طریقہ دعا کا ہے
مدحت نبیؐ کی آلؑ کی نسخہ دعا کا ہے
ہو مدح گر خدا و نبیؐ و وزیر کی
بھر جائے ایک آن میں جھولی فقیر کی

(۲۴)

ہم سے گناہ گاروں کا تو اس میں ذکر کیا
خاصانِ کبریا کا بھی دستور ہے دعا
شیوہ اسے بناتے ہیں اپنا سب اولیا
کرتے ہیں اپنے رب سے دعا سارے انبیا
مستغنی اس سے کوئی نہیں شش جہات میں
سب مانگتے ہیں اس سے دعا کائنات میں

(۲۵)

تعلیم کی گئی ہمیں ہر کام میں دعا
عفوِ گناہ و رحمت و اکرام کی دعا
آلام میں دفیعۂ آلام کی دعا
اک اک نفس کی ہر سحر و شام کی دعا
حرفِ دعا قرارِ دلِ بے قرار ہے
وجہِ نزولِ رحمتِ پروردگار ہے

(۲۶)

کہہ کر "اجیب دعوۃ الداع اذا دعان"[1]
اپنی ربوبیت کی بتائی ہے اس نے شان
اب جو قبولیت کی طرف سے ہو بدگمان
دستِ دعا ہیں اس کے کہ ٹوٹی ہوئی کمان
یا تو یہ ہے دعا کا سلیقہ نہیں اسے
یا یوں کہوں خدا پہ بھروسہ نہیں اسے

---

(۱) "پکارنے والے کی دعا سنتا ہوں جب وہ پکارتا ہے۔" (قرآن مجید)

(۲۷)

میں بھی گناہ گار ہوں اے ربِ ذوالجلال
جکڑا ہوا ہے میرا گناہوں میں بال بال
تڑپائے کیوں نہ دل کو ترے قہر کا خیال
ظاہر بظاہر ان کا جہنم ہی ہے مآل
لائق تو عفو کے مری کوئی خطا نہیں
میرے گناہ تیرے کرم سے سوا نہیں

(۲۸)

میں عاجز و حقیر ہوں ۔ تو قادر و عظیم
میں عاصی و ذلیل ۔ ہوں تو راحم و رحیم
میں لقمہ جحیم ہوں تو خالقِ نعیم
میں بندۂ اثیم ہوں ۔ تو محسن و کریم
میری مجال ! تجھ سے بغاوت کیا کروں
افسوس نفس آئے جو غالب تو کیا کروں

(۲۹)

تو پردہ پوشِ عیب ہے ۔ میرے گنہ چھپا
عصیاں پہ میرے ڈال دے رحمت کی تو ردا
مائل بہ عدل ہو تو مجھے آگ میں جلا
لیکن مرے رحیم ۔ یہ تو رحم کی ہے جا
پروردگار ۔ تو نہ اگر رحم کھائے گا
مجھ کو ترے عذاب سے کون اب بچائے گا ؟

(۳۰)

تو میری آرزوؤں کا مرکز ہے اے خدا
قرآن میں یہ تیری ضمانت ہے جا بجا
میں مانگوں تو قبول کرے گا مری دعا
جب تو مجھے ہوا یہ دعاؤں کا حوصلا
اعمال پہ نظر ہو تو بخشش محال ہے
تو بخش دے تو یہ کرم بے مثال ہے

(۳۱)

یا رب ، مرے گناہوں کی زنجیر توڑ دے
حسن عمل سے فکر کے رشتے کو جوڑ دے
ساغر میں دل کے زمزم و کوثر نچوڑ دے
سوئے ہوئے مذاق سخن کو جھنجھوڑ دے
ہے فکر ذکر حضرت زین العباؑ مجھے
وہ جن کی اک عطا ہے یہ ذوق دعا مجھے

(۳۲)

حضرت کا ذکر میں کروں ، مجھکو کہاں یہ تاب
ذرہ کہاں زمیں کا ، کہاں حق کا آفتاب
بے علم و بے ہنر ہوں میں ، وہ صاحب کتاب
وہ مالک بہشت ہے ، میں خانماں خراب
منزل کو رہروان رہ حق سے پوچھیئے
ان کی فضیلتیں تو فرزدق سے پوچھیئے

(۳۳)

وہ خانۂ اللہ ، وہ حجاج کا ہجوم
محوِ طوافِ کعبہ وہ حاجی علی العموم
شامی ولیِ عہد ہشامِ ذلیل و شوم
جس کے حشم خدم کی عرب میں تھی ایک دھوم
وہ چاہتا ہے ہو نہ طواف اس کا سب کے ساتھ
ہٹ جائیں اس کو دیکھ کے حاجی ادب کے ساتھ

(۳۴)

لیکن یہاں اسے کوئی گردانتا نہیں
پہچانتا بھی گر ہے تو پہچانتا نہیں
رعب و جلال اس کا کوئی مانتا نہیں
اس گھر میں کوئی اس کو بڑا جانتا نہیں
گھر میں خدا کے ایک غریب و امیر ہیں
ہوں بادشاہ بھی تو یہاں وہ فقیر ہیں

(۳۵)

رکن و حطیم تک نہ ہوا اس کا جب گزر
منبر پہ چڑھ کے بیٹھ گیا وہ زبوں سیرؔ
کچھ تھا یہ انتظار کہ ہوں لوگ ادھر ادھر
پھر جائے وہ طوافِ حرم کو بکرّ و فر
کچھ یوں بھی اس کا اوجِ عرب دیکھتے رہیں
شاہی کا رعب و داب بھی سب دیکھتے رہیں

(۳۶)

ایسے میں آیا جانبِ رکنِ حطیم اب
اک باوقار مردِ خدا ہاشمی نسب
شاہِ حجاز ، خسروِ دیں ، سید العرب
کون و مکاں میں فرد ، زمانے میں منتخب
شانوں پہ اپنے بارِ امامت لیئے ہوئے
پشتی پہ اعتبارِ رسالت لیئے ہوئے

(۳۷)

یعنی امامِ وقت ، شہنشاہِ بحر و بر
اک نور ایسا جس کی جبیں میں ہے جلوہ گر
کہہ اٹھیں جس کو حافظِ شیراز دیکھ کر
من وجھک المنیر لقد نورالقمر
سجدہ کا ہے نشان وہ جبینِ حضورؑ پر
جیسے چراغِ نور فروزاں ہو طور پر

(۳۸)

عمامہ سر پہ ، بر میں قبا ، ہاتھ میں عصا
لب پہ تبسمِ لبِ سردارِ انبیا
رخ پہ جلال و دبدبۂ ضیغمِ خدا
ریحانِ فاطمہ گلِ گلزارِ مصطفیٰ
سجدے کا نقش رکن جب چومنے لگے
موجِ نفس سے بادِ حرم جھومنے لگے

(۳۹)

کعبہ میں جب طلوع یہ مہر کرم ہوا
روشن تمام جلوۂ حق سے حرم ہوا
ظاہر امامِ وقت کا جب یوں حشم ہوا
ہر اک ادب سے صورتِ محراب خم ہوا
کعبہ کھل اٹھا قلبِ تولائی کی طرح
مجمع تمام چھٹنے لگا کائی کی طرح

(۴۰)

رستہ دیا ہر ایک نے ہٹ کر امامؑ کو
مولاؑ گئے بہ رکنِ حطیم استلام کو
میزاب نے بھی سر کو جھکایا سلام کو
آنے لگے پسینے ولی عہدِ شام کو
دیکھے یہ مرتبے جو حرم میں امامؑ کے
اب سانپ لوٹنے لگے دل پر ہشام کے

(۴۱)

گھبرا کے ایک شامیؑ بے دیں نے یہ کہا
یہ کون ہے کہ جس کا ہے ایسا یہ مرتبا
دیتا جواب اس کا ہشام اس کو کیا بھلا
تھا مصلحت شناس تو انجان بن گیا
بس یہ دیا جواب کہ میں جانتا نہیں
ہوگا کوئی بھی شخص، میں پہچانتا نہیں

(۴۲)

سن کر ابونواس فرزدق نے یہ جواب
محسوس اپنے دل میں کیا ایک پیچ و تاب
وہ افصح عرب وہ ثناخوانِ بوتراب
کرنے لگا ہشام سے اس طرح سے خطاب
تو جانتا نہیں کہ یہ ، آقائے جونؑ ہے
آ میں تجھے بتاؤں کہ یہ شخص کون ہے

(۴۳)

یہ وہ ہے جس کے نقشِ کفِ پا کو دیکھ کے
بطحا کی سرزمین اسے چومنے لگے
تو جانتا نہیں اگر اس کو تو جان لے
پہچانتے ہیں کعبہ و حل و حرم اسے
اس کا پسر ہے آج یہ کل کبریائی میں
تھا بہترینِ خلق جو ساری خدائی میں

(۴۴)

ایک پیکرِ طہارتِ کردار ہیں یہی
تطہیر کے شرف کے سزاوار ہیں یہی
ہر متقی کے سید و سردار ہیں یہی
نورِ نگاہِ احمدِ مختار ہیں یہی
جب تک قلم رواں سرِ لوحِ دوام ہے
اس ذات پہ خدا کا درود و سلام ہے

(۳۵)

نام ان کا ہے علی ، یہ ہیں بیٹے رسولؐ کے
پاتے ہیں سب امامِ ہدایت حضور سے
ان کے چچا تھے جعفر و حمزہ جو شیر تھے
یہ بات سچ ہے ، ان کی ولا کی قسم مجھے
یہ ابنِ فاطمہ ہیں جو بنتِ رسولؐ ہیں
نسواں میں سیدہ ہیں لقب میں بتولؑ ہیں

(۳۶)

بیٹے ہیں یہ علی کے جو تھے اشجعِ عرب
تھی ان کی تیغِ تیغِ قضا ، جانتے ہیں سب
تو نے کہا جو اس نے برا قول ہی ہے کب
ہے کون ان کی مدح میں جس کے کھلیں نہ لب
اس کی طرف جو آپ بڑھیں جھومنے لگے
خود رکن بڑھ کے ان کے قدم چومنے لگے

(۳۷)

آتا ہے جب حطیم پہ یہ فخرِ روزگار
مَس ہو کے ان سے کرتا ہے وہ آپ افتخار
ان کی جبیں سے نورِ ہدایت ہے جلوہ بار
مشرق میں جیسے مہرِ سحر تیرگی شکار
شجرہ کی زیب ہے جو رسولِ انام سے
سیرت کا حسن خود ہے عیاں ان کے نام سے

(۴۸)

تو ان کو جانتا نہیں حیرت تو ہے یہی
ہے روح و جانِ فاطمہؑ یہ دلبرِ علیؑ
نانا پہ ان کے ختم رسالت خدا نے کی
سیرت بھی جن کی مثل عناصر کے پاک تھی
اس قول سے قریش کے کون آشنا نہیں
ان کے کرم کی کوئی حد و انتہا نہیں

(۴۹)

ہوتے ہیں مبتلائے مصیبت جو نامراد
بوجھ ان کا یہ اٹھاتے ہیں، کرتے ہیں ان کو شاد
شیریں شمائل ان کے ہیں، بخشش میں یہ جواد
سنتے ہیں گوشِ دل سے کلام ان کا حق نہاد
حسنِ کلامِ حق سے گہر رولتے ہیں یہ
جھڑتے ہیں پھول منھ سے اگر بولتے ہیں یہ

(۵۰)

روزِ ازل سے حق نے شرف کر دیئے عطا
جن کو قلم نے لوح پہ بہرِ سند لکھا
یہ ان کے دستِ جود و کرم میں جو ہے عصا
خوشبو اسی کی پھیلی ہے ہر سمت جا بجا
یہ وہ بلند بینی و عظمت نشان ہیں
اسلاف کا ہیں فخر، بزرگی کی شان ہیں

(۵۱)

حلم و کرم کا حسن بھی ، زینت بھی ہیں یہی
غیظ آئے گر تو شیر ہے یہ ضیغمِ علی
قہر و غضب سے ان کے قضا بھی ہے کانپتی
ایسا ہے پھر بھی خلق خدا میں کہیں کوئی
گردن پہ جس کی آپ کا بارِ کرم نہیں
احسان میں یہ اپنے بزرگوں سے کم نہیں

(۵۲)

عالی ہے طینت آپ کی ، اعلیٰ ہے مرتبا
وعدہ خلافی آپ کا شیوہ کہاں بھلا
دستِ عطا ہے آپ کا مصداقِ ہل اتیٰ
ان کے ہر اک ارادہ کی دانش پہ ہے بِنا
عز و شرف نے ان کے بلندی وہ پائی ہے
جس تک کسی عرب نہ عجم کی رسائی ہے

(۵۳)

یہ دین ہے کہ مرکزِ الفت ہو ان کا گھر
یہ کفر ہے کہ ان سے عداوت کرے بشر
دامن سے آپ کے ہو تمسک نصیب اگر
وجہِ نجات ہو یہ سرِ حشر سر بسر
ابرِ کرم ہیں قحط میں ، رن میں دلیر ہیں
خوف آئے سامنے تو یہ صحرا کے شیر ہیں

(۵۴)

یہ اہل زہد و صاحب تقویٰ کے ہیں امام
آتا ہے جب تجسس و تحقیق کا مقام
جب بہترین خلق کے بارے میں ہو کلام
لیتے ہیں سارے لوگ فقط آپ ہی کا نام
لازم ہے ذکر آپ کا ذکر خدا کے بعد
افضل یہی ہے تذکرۂ کبریا کے بعد

(۵۵)

ان کی ولا منافی ہے رنج و الم تمام
ہیں نعمتیں کنیز تو احسان ہے غلام
کوئی ہزار جود و کرم میں ہو نیک نام
وہ اس صفت میں خاک نشیں، یہ فلک مقام
فخرِ جہاں ہو ان کا جسے در نصیب ہو
جس پر کرم کریں وہ سکندر نصیب ہو

(۵۶)

زر ان کے پاس ہو کہ نہ ہو، فرق کچھ نہیں
دھارا کرم کا آپ کے رکتا نہیں کہیں
ان کے مکاں قریش میں ہیں نور آفریں
جیسے خزف کے ڈھیر میں ترشے ہوئے نگیں
آفت میں جو پناہ دیں، وہ مستقر ہیں یہ
در پیش مسئلے ہوں تو حکمت کے گھر ہیں یہ

(۵۷)

آئیں مصیبتیں جو صحابہ پہ بھی کبھی
ان کی مدد بھی بے شک و بے ریب انھوں نے کی
رہتی ہیں آنکھیں ان کی حیا سے جھکی ہوئی
اوروں کی آنکھیں جھکتی ہیں ہیبت سے آپ کی
موجِ تبسم ان کے لبوں • پہ اگر نہ ہو
ان سے کسی کو تابِ سخن عمر بھر نہ ہو

(۵۸)

کہتے ہیں لا فقط یہ تشہد کے باب میں
لفظ • نہیں • کو دخل نہیں اس جناب میں
غیر از تشہد ان کے کلام و خطاب میں
• لا • بھی نعم ہے ان کی سخا کے نصاب میں
دستِ کرم سے آپ کے دریا وہ بہہ گیا
اک اک کو شکوہ تنگیٔ دامن کا رہ گیا

(۵۹)

جد آپ کے محمدؐ خیر الانام ہیں
سارے قریش میں جو ذوی الاحترام ہیں
اور دوسرے علیؑ ہیں جو اعلیٰ مقام ہیں
جو نائبِ رسولؐ ہیں ، پہلے امام ہیں
عظمت پہ فتحِ مکہ کا محضر گواہ ہے
بدر و حنین و خندق و خیبر گواہ ہے

(۶۰)

حاصل جسے بھی معرفت اللہ کی ہوئی
ان کی ولا بھی حق کی طرف سے اسے ملی
گھر سے انہی کے ملتی ہے دنیا کو روشنی
جاگیر دیں کی ، دولتِ ایمان و آگہی
یوں مدح کی فرزدقِ شیریں کلام نے
تو شرم سے جھکا لیا سر اب ہشام نے

(۶۱)

یہ گفتگو ادھر تھی ، ادھر شاہِ ذی حشم
مصروف تھے طواف میں کعبہ کے دم بدم
کرتے رہے دعائیں بہ میزاب و ملتزم
مسرور و شاد ان کی زیارت سے تھا حرم
ہوتی رہیں ہوائیں فدا جھوم جھوم کے
خود رکن کھل اٹھا لبِ جاں بخش چوم کے

(۶۲)

خود یہ خدا کے گھر میں سراپا نیاز ہیں
مصروفِ ذکر صورتِ شاہِ حجاز ہیں
قدموں کے یہ نشان جو گلشن طراز ہیں
حجاج کو یہ نقشِ قدم جانماز ہیں
سجدے انھیں پہ کرتے ہیں سب کردگار کے
ہیں نقشِ پا کہ پھول کھلے ہیں بہار کے

(۶۳)

کعبہ میں آ کے زائر و حجاجِ نیک نام
کرتے ہی ملتزم پہ دعاؤں کا التزام
لیکن حطیم اِن کی دعاؤں کا ہے مقام
کرتے ہیں آپ آ کے خدا سے جہاں کلام
پردہ حرم کا تھام کے جب گڑگڑاتے ہیں
سوزِ دعا سے ارض و سماؑ تھرتھراتے ہیں

(۶۴)

یہ خود امامِ وقت ہیں ، عصمت مآب ہیں
اقوال ان کے معنیٔ ام الکتاب ہیں
سجدوں کی کائنات ہیں یہ انتخاب ہیں
یہ خود شفیعِ منزلِ یومِ حساب ہیں
زہد و ورع میں ان کا وہ اعلیٰ مقام ہے
اولیٰ کے ترک کا بھی تصور حرام ہے

(۶۵)

لیکن بلند کرتے ہیں دستِ دعا یہ جب
کرتے ہیں ایسی گریہ و زاری بصد تعب
حاضر ہو جیسے کوئی گنہ گار پیشِ رب
اور کر رہا ہے اپنے لیئے مغفرت طلب
ہوتا ہے اب وہ لطف کا در باز دیکھیئے
معصومؑ کی دعاؤں کا انداز دیکھیئے

(۶۶)

ہیں لفظ میرے ، آپ کا ہے مافی الضمیر
ہو عفو گر خطا ہو کہ عاجز ہے یہ فقیر
مفہوم ہے دعا کا کہ اے سامع و بصیر
قائم ، قدیم و قادر و حی ، عالم و خبیر
جس کا شریک جس کا کوئی دوسرا نہیں
تو وہ خدا ہے اور تو کوئی خدا نہیں

(۶۷)

یا رب ، ترے حضور ہے یہ میری التجا
تا درجۂ کمال ہو ایماں مجھے عطا
میرے عمل کو حسنِ عمل کی حدوں پہ لا
نیت بھی بہترین مجھے دے بہ انتہا
اخلاق کی بلندیاں کر دے عطا مجھے
عزت بھی دے غرور سے لیکن بچا مجھے

(۶۸)

میری خطائیں بڑھ گئی ہیں طولِ عمر سے
میں مستحق نہیں کہ معافی مجھے ملے
کچھ بھی تو میرے پاس نہیں ہے ترے لیئے
واجب جو تیرے فضل کو میرے لیئے کرے
خود میرا فیصلہ ہی جو میرے خلاف ہے
پھر تیرے فیصلے سے کسے اختلاف ہے

(۶۹)

سچ تو یہ ہے گناہوں نے دھوکہ دیا مجھے
اب کون ہے چھڑائے جو تیرے عذاب سے
تیرے حقوق مجھ پہ جو واجب ہیں، بخش دے
مشکل ہے کیا ترے لیئے گر رحم تو کرے
محروم مغفرت سے تری گر رہوں گا میں
تیرے غضب کی آگ کو کیسے سہوں گا میں

(۷۰)

ہاتھوں کو جب یہ کرتے تھے پیشِ خدا بلند
اشکوں سے بھیگ جاتے تھے رخسارِ ارجمند
خوفِ خدا سے کانپتا تھا ان کا بند بند
جیسے بس اب حیات میں باقی نفس ہوں چند
جملے دعا کے اور جو دو چار ختم ہیں
بس اس کے بعد زیست کے آثار ختم ہیں

(۷۱)

دربار میں خدا کے ہو جو یوں بحالِ زار
کمزور و ناتوان و دل افگار و اشکبار
ناکردہ معصیت سے خجل اور شرمسار
خوف خدا سے لرزہ براندام و بے قرار
وہ آئے ہو کے قید جو دربارِ شام میں
پھر دیکھیئے جلال یہ اس کے کلام میں

(۷۲)

دربار وہ یزید کا ، وہ اک ہجومِ عام
تھے سات سو تو کرسی نشیں سینکڑوں غلام
بد ہیبت و مہیب و جفاخو سیاہ فام
تیغ و سناں سنبھالے ہوئے صف بہ صف تمام
ہیبت ملوکیت کی دکھانے کے واسطے
شاہی کا رعب و داب جمانے کے واسطے

(۷۳)

قیدی بھی ایک گوشے میں کچھ تھے بحالِ زار
مغموم ، اشکبار ، رسن بستہ ، بے قرار
یعنی جناب زینب و کلثوم دل فگار
پھر اور اہلِ بیتِ رسولِ فلک وقار
سجادِ زار بارِ قیادت لیئے ہوئے
گردن کو وزنِ طوقِ گراں خم کیئے ہوئے

(۷۴)

ایسے میں جب یزید کا نشہ سوا ہوا
چاہا کہ قیدیوں پہ زباں سے ہو اب جفا
اس طرح اک تو رعب بڑھے اقتدار کا
پھر اور یہ اسیر ہوں دہشت میں مبتلا
ہیبت سے جس کی یہ نہ زباں تک ہلا سکیں
رسوا ہوں اس طرح کہ نہ سر بھی اٹھا سکیں

(۷۵)

یہ سوچ کے یزید نے عابدؑ سے یہ کہا
دیکھا تمھارے ساتھ خدا نے یہ کیا کیا
بیعت نہ کی حسینؑ نے میری تو کیا ملا
شکر اس خدا کا جس نے انھیں قتل کر دیا
کہتا تھا وہ یہ دیکھ کے حالت امام کی
دہشت سے ان کو تاب نہ ہوگی کلام کی

(۷۶)

اس کو خبر نہ تھی کہ یہ نسلاً دلیر ہیں
بچوں سے جس کے ازرق و اژدر بھی زیر ہیں
یہ کیا ڈریں گے ، آپ یہ جینے سے سیر ہیں
جد ان کے شیر حق تھے ، یہ شیروں کے شیر ہیں
سر جس نے حق پہ دے دیا ، یہ اس کے لال ہیں
یہ شیرِ بیشۂ اسدِ ذوالجلال ہیں

(۷۷)

آتے ہی گفتگو یہ زبانِ یزید پر
بپھرا وفورِ غیظ میں حیدرؑ کا شیرِ نر
بولے ڈپٹ کے ، بکتا ہے کیا ، او زبوں سیر
الزام اپنے جرم کا اللہ پہ نہ دھر
مارا ہے کب خدا نے شہِ مشرقین کو
فوجوں نے تیری قتل کیا ہے حسینؑ کو

(۷۸)

میرے پدر نے تیرا کوئی حق نہیں لیا
فتنہ کوئی حسین نے برپا نہیں کیا
تو نے کیا شہید جو بے جرم و بے خطا
ہاں ، تو ہی ذمہ دار ہے قتلِ حسین کا
لعنت خدا کی ان پہ ہو جو نابکار ہیں
میرے پدر کے قتل کے جو ذمہ دار ہیں

(۷۹)

جو ہو اسیر طوق و سلاسل ، نحیف و زار
تلوار جس کے سر پہ کھنچی ہو ، وہ حق شعار
یوں سامنے یزید سے جابر کے باربار
کرتا تھا جھوٹ اہلِ حکومت کا آشکار
لہجہ علی کا تھا جو لبِ حق شعار میں
اک شیر تھا کہ گونج رہا تھا کچھار میں

(۸۰)

دربار میں یزیدِ ستم گر کے سامنے
عابد نے یوں جو اس کے مظالم بیاں کیئے
اب تک جو قیدیوں ہی کو مجرم سمجھتے تھے
نفرت سے وہ یزید کو اب دیکھنے لگے
الزام قتلِ شہ کا جو ظالم کے سر گیا
چہرے کا رنگ اڑا جو ملمع اتر گیا

(۸۱)

وحشت سے تھا یزید کے چہرے کا رنگ زرد
رعب و جلال و دبدبہ سب ہو گئے تھے گرد
لرزہ تھا سارے جسم میں ، تھے ہاتھ پاؤں سرد
کہتا تھا اضطراب کہ دل میں اٹھا ہے درد
عابد نے ضرب تیغِ زباں کی لگائی تھی
یا ذوالفقار شیرِ خدا نے چلائی تھی

(۸۲)

دربار میں ہوا جو یزید اب ذلیل و خوار
عابد کے قتل کا دیا حکم اس نے ایک بار
یہ سن کے بولے عابدِ مضطر بصد وقار
کیا قتل سے ڈراتا ہے تو او جفا شعار
ہم تو ہوئے ہیں خلق شہادت کے واسطے
تیار رہ تو حشر کی ذلت کی واسطے

(۸۳)

تقدیر میں جو اس کی تھیں رسوائیاں مزید
اب مسجدِ دمشق میں لایا انھیں یزید
منبر پہ آیا ایک خطیب اس کا زرخرید
کرنے لگا وہ طعن علی پر بہت شدید
یہ سن کے اس دلیر کے تیور بدل گئے
گویا خدا کے شیر کے تیور بدل گئے

(۸۴)

فرمایا اس سے ، بس ہو خموش او جفا شعار
او بد نصیب ، کندۂ دوزخ ، ذلیل و خوار
مخلوق کی خوشی کے لیئے تو نے نابکار
اللہ کے غضب کو خریدا ہے ، ہوشیار
او نامراد ، تیری زباں رنگ لائے گی
اب جلد تجھ کو آتشِ دوزخ جلائے گی

(۸۵)

یہ سن کے ڈر گیا وہ خطیبِ خبیث رو
منبر پہ اب گیا یہ امامِ رسول خو
نطق و بیاں کا فخر ، فصاحت کی آبرو
حمد خدا سے ہوگئی آغاز گفتگو
برسے گہر زبانِ فصاحت نشان سے
قرآں کے حرف کھِل رہے تھے زبان سے

(۸۶)

فرمایا پھر کہ لوگو ، خدائے قدیر نے
سخت امتحاں لیا ہے ہمارا بلاؤں سے
مخصوص ہیں ہمیں سے ہدایت کے سلسلے
ساری فضیلتیں ہیں ہمارے ہی واسطے
دشمن ہمارے قہرِ خدا سے قریب ہیں
لاریب سب کے سب یہ ہلاکت نصیب ہیں

(۸۷)

خلاق کائنات نے یہ چھ خصوصیات
ہم میں بہم کیئے ہیں بطورِ مسلمات
ہیں علم و حلم و جود و سخاوت کے یہ صفات
پھر ہیں شجاعت اور فصاحت کے معجزات
پھر یہ کہ مومنین کو الفت ہمیں سے ہے
ایمان ہے اگر تو مودت ہمیں سے ہے

(۸۸)

ہم میں ہی سے تھا فخرِ نبوت تھا جو نبیؐ
صدیق تھے ہمیں میں ابو طالبؑ ولی
جعفرؑ کہ جن کو کہتے ہو ' طیار ' تم سبھی
حمزہؑ ہیں سید الشہدأ اور پھر علیؑ
شیرِ خدا ہیں ، فاتحِ بدر و حنین ہیں
بیٹے انھیں علیؑ کے حسنؑ اور حسینؑ ہیں

(۸۹)

سن لو کہ اس قتیلِ جفا کا ہوں میں پسر
باطل کے آگے جس نے جھکایا نہ اپنا سر
آغشتہ اپنے خوں میں پڑا ہے جو خاک پر
جس کے حرم پھرائے گئے ہیں یہ در بدر
وہ فاطمہ کی جاں ، دلِ احمد کا چین ہے
سبطِ نبی ہے ، اسمِ گرامی حسین ہے

(۹۰)

اس شان سے جری نے جو اعلانِ حق کیا
دکھلا دی ایک ایک کو آنکھوں سے کربلا
مسجد میں اب یہ سنتے ہی شورِ بکا ہوا
گھبرا گیا یزید ، دیا حکم اذان کا
رسوائی سے جو بچنے کی نیت اس آن تھی
ظاہر ہے یہ اذان سیاسی اذان تھی

(۹۱)

آیا اذاں میں جیسے ہی ختمِ رسل کا نام
بولے خموش کرکے مؤذن کو یہ امام
ہاں اے یزید، جن کو دیا حق نے یہ مقام
یہ تیرے جد تھے یا کہ میرے جد تھے لا کلام
بس اب صفیں نماز کی جو ٹوٹنے لگیں
نبضیں یزیدِ نحس کی خود چھوٹنے لگیں

(۹۲)

اب اس کے بعد قید کی ایذا تھی اور یہ شیر
زنداں تھا اور اہلِ حرم اور یہ دلیر
تھیں وہ مصیبتیں کہ تھے سب زندگی سے سیر
لیکن یزید کر نہ سکا حوصلوں کو زیر
آخر کو قید ہی میں سکینہ گزر گئی
منھ رکھ کے سر پہ باپ کے مظلوم مر گئی

(۹۳)

دیکھا یزیدِ نحس نے یہ خواب ایک شب
روتے ہیں زار زار تڑپ کر رسولؐ رب
چونک اٹھا سوتے سوتے لرز کر وہ بدنسب
فوراً دیا یہ حکم کہ قیدی رہا ہوں سب
تا دور بےکسوں کی رہائی کا غل گیا
تقدیر کی طرح درِ زنداں بھی کھل گیا

(۹۴)

ہو کر رہا دمشق ہی میں لے کے ایک گھر
کی مجلسِ حسینؑ بپا سب نے بےخطر
ملنے کو آئیں ساری زنانِ وفا سیرؑ
پرسہ دیا حسینؑ کا سر اپنے پیٹ کر
کچھ اور مجلسوں کا یونہی سلسلا چلا
پھر کاروانِ غم یہ سوئے کربلا چلا

(۹۵)

زنداں سے چھوٹ کے جو حرمِ کربلا میں آئے
قیدِ ستم سے وادیٔ جور و جفا میں آئے
پھر بے نوا یہ نالہ بلب نینوا میں آئے
جس میں لٹے تھے، پھر اسی دشتِ بلا میں آئے
نظروں میں جو قیامتِ عاشور پھر گئی
ایک ایک غم نصیب پہ بجلی سی گر گئی

(۹۶)

نظروں میں پھر گیا وہ قیامت کا پھر سماں
جب چھوڑ کر مدینہ کو آئے تھے سب یہاں
دیکھا نظر اٹھا کے جو سب نے یہاں وہاں
چشمِ خیال میں تھا لہو آگ اور دھواں
خیمے کبھی جدھر تھے ادھر دیکھتے رہے
کچھ بھی وہاں نہیں تھا مگر دیکھتے رہے

(۹۷)

بانو صدائیں دیتی تھیں ، اصغر کہاں ہو تم ؟
لیلیٰ پکارتی تھیں کہ اکبر کہاں ہو تم ؟
کلثوم کہہ رہی تھیں ، برادر کہاں ہو تم ؟
عباس جانِ ساقیٔ کوثر ، کہاں ہو تم ؟
زینب نہ ڈھونڈتی تھیں کسی نورِ عین کو
ان کی نگاہیں ڈھونڈ رہی تھیں حسین کو

(۹۸)

چونکے جو اب تصورِ ماضی سے نوحہ گر
آئیں نظر شہیدوں کی قبریں ادھر ادھر
زینب گرا کے خود کو مزارِ حسین پر
کرنے لگیں یہ نوحہ تڑپ کر بچشمِ تر
قیدِ ستم سے چھٹ کے یہ غم خوار آئی ہے
بھیا ، اٹھو کہ زینب ناچار آئی ہے

(۹۹)

کنجِ لحد میں چین سے سوتے ہو کیا ، اٹھو
تم پر جو بعد قتل کے گزری ہے وہ کہو
ہم پر بھی جو قیامتیں ٹوٹی ہیں وہ سنو
سب غم نصیب آئے ہیں ملنے ، اٹھو ، ملو
فرقت کے ایک سال جو صدمے اٹھائے ہیں
سب اشتیاقِ دید میں ملنے کو آئے ہیں

(۱۰۰)

بھیا ، تمھارے بعد وہ ہم پر ستم ہوئے
اہلِ جفا نے لوٹ کے خیمے جلا دیئے
سر سے ردائیں چھین لیں افواج شام نے
بے پردہ ہم کو کوچہ و بازار لے گئے
ہو کر اسیر شام کے دربار میں گئیں
بہنیں تمھاری مجلسِ میخوار میں گئیں

(۱۰۱)

چہرے ہم اپنے بالوں سے اپنے چھپائے تھے
اور مجرموں کی طرح وہاں تھے کھڑے ہوئے
رکھا تھا سر جو آپ کا ظالم کے سامنے
مس کرتا تھا چھڑی لب و دنداں سے آپ کے
پھینکی شراب آپ کے سر پر پلید نے
کیا کیا ہمیں ذلیل کیا ہے یزید نے

(۱۰۲)

بھیا، سب آئے چھوٹ کے قیدِ یزید سے
کلثوم اور رباب ہوئیں یا کہ ہم ہوئے
لیکن تمھاری ایک امانت نہ لا سکے
ہم چھوڑ آئے شام کے زندان میں اسے
صدمے اٹھا سکی نہ دلاری وہ باپ کی
بھیا، سکینہ مر گئی فرقت میں آپ کی

(۱۰۳)

زینب کے بین سن کے قیامت ہوئی بپا
ہلنے لگا مزارِ شہنشاہِ کربلا
زین العبا نے بڑھ کے پھوپھی سے یہ اب کہا
بس اب نہ بین کیجیئے بابا کا واسطا
یہ حشر ہو نہ آہِ دلِ بےقرار سے
زہرا تڑپ کے خود نکل آئیں مزار سے

(۱۰۴)

ہے تو بہت طویل الم کی یہ داستاں
بس مختصر یہ ہے کہ ٹھہر کر ذرا یہاں
پہنچا مدینۂ نبوی پھر یہ کارواں
مدت تک اک قیامتِ کبریٰ رہی جہاں
سجادِ زار دہر میں اس ابتلا کے بعد
پینتیس سال زندہ رہے کربلا کے بعد

(۱۰۵)

ساحر ، ہوا جو دہر سے رخصت یہ بےنوا
باقرؔ نے وقتِ غسل تڑپ کر یہ دی صدا
پینتیس سال پہلے جو ان پر ہوئی جفا
اب تک نشان پشت پہ اس کے ہیں جا بجا
ماما کو زخم زخم بدن اب دکھائیں گے
دُرّوں کے نیل لے کے یہ جنت میں جائیں گے

تمت بالخیر

مرثیہ

سجدہ

تعدادِ بند......۸۸

رباعی

گھبرائیں گے دنیا میں جو بہتے بہتے
اٹھ جائیں گے یا حسین کہتے کہتے
ڈوبیں گے جو بحرِ غمِ شبیرؑ میں ہم
کوثر پہ پہنچ جائیں گے بہتے بہتے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سجدہ

(۱)

میں تاجدارِ سخن ہوں ، مرا نشاں ہے قلم
حدودِ مملکتِ فن کا پاسباں ہے قلم
مری زباں ہے سبھی گرچہ بے زباں ہے قلم
مرا رفیق ہے ، میرا مزاج داں ہے قلم
جہادِ فکر و ہنر میں یہ تیغِ تیز بھی ہے
عروسِ نظم کے دامن پہ سجدہ ریز بھی ہے

(۲)

پھر آج جادۂ حق میں رواں دواں ہے قلم
مرے کمالِ ہنر کی طرح جواں ہے قلم
بوقتِ مدح فرشتوں کا ہم زباں ہے قلم
بہ جانمازِ ورق مائلِ اذاں ہے قلم
اذان کے ساتھ مصلے پہ جب یہ آتا ہے
خدا کے شکر کو سجدہ میں سر جھکاتا ہے

(۳)

یہ سجدہ فضلِ خدا سے قلم کی فطرت ہے
مقامِ شکر میں شکرانہ اس کی طینت ہے
یہ ذوقِ بندگی اس بات کی علامت ہے
کہ اس کو خالقِ لوح و قلم سے نسبت ہے
جو نسبت ایسی ہو پھر کیوں نہ اس پہ ناز کرے
خدا قلم کی طرح سب کو سرفراز کرے

(۴)

بشر کی سجدہ گزاری میں بھی کلام نہیں
اگرچہ جستجوئے حق کا ذوق عام نہیں
ہے کون قابلِ سجدہ ، کچھ اس سے کام نہیں
کسی بھی چیز کو سجدہ یہاں حرام نہیں
جو سب کو لائقِ سجدہ شمار کرتا ہے
جبینِ شوق کو وہ بے وقار کرتا ہے

(۵)

عجیب طرح کی طینت بشر نے پائی ہے
عبودیت بشری طبع میں سمائی ہے
ہمیشہ سجدوں میں اس نے جبیں جھکائی ہے
بشر کی فطرتِ ثانی یہ جبہ سائی ہے
یہ سرکشی سے بہت گرچہ سر اٹھاتا ہے
جو مصلحت ہو تو سجدہ میں سر جھکاتا ہے

(۶)

خدا نے فطرتِ انساں میں رکھ دیئے وہ تضاد
کہ دیکھ دیکھ کے حیراں ہے عقلِ علم نہاد
سخا و بخل و خلوص و ریا و صلح و فساد
مزاجِ آب و تراب و غرورِ آتش و باد
یہ سب تضاد نمایاں ہیں اس کی طینت میں
ہیں دورخی کے عجب رنگ اس کی فطرت میں

(۷)

اسی کا ننگ ہیں چنگیز و بربر و تاتار
اسی کی شان ہیں سلمان و بوذر و عمار
اس کے نام پہ دھبہ یزیدِ بداطوار
اس کو باعثِ عظمت حسین کا کردار
بتانِ وہم و گمان کا کوئی پجاری ہے
کسی کے دل پہ نزولِ کلامِ باری ہے

(۸)

ہے اس میں جوشِ شجاعت بھی، خوف و دہشت بھی
وفا بھی، عشق بھی، بغض و عناد و نفرت بھی
جفا بھی رحم بھی ہے، عجز بھی ہے نخوت بھی
نظر میں علم کی عظمت بھی ہے، جہالت بھی
جو کوئی جہل میں بوجہل کا مثیل ہوا
تو کوئی علم میں استادِ جبرئیل ہوا

(۹)

ہے مال و زر کی پرستش بھی فطرتِ انساں
ہے اقتدار کی چوکھٹ پہ بھی یہ سجدہ کناں
شجر حجر پہ بھی کرتا ہے یہ خدا کا گماں
بتوں کو بھی یہ سمجھتا ہے خالقِ دوجہاں
خود اپنے ہاتھ سے یہ ان کو خلق کرتا ہے
پھر آپ ان کی خدائی کا دم بھی بھرتا ہے

(۱۰)

کبھی زمانہ کا فرعون اس کا ہے مسجود
کبھی ہے وقت کا نمرود بھی اسے معبود
جو اقتدار میں ہو وہ ہے مثلِ ربِ ودود
وہی خدا ہے جو دے دے اسے دُرِ مقصود
مٹا کے عزتِ نفس ان سے زر یہ لیتا ہے
یہ سجدہ ریز جبینوں کو بیچ دیتا ہے

(۱۱)

ہیں جب تو ان کے خریدار آج کے نمرود
جبینیں سجدہ کناں میں جو پیشِ ربِ ودود
ہے سب فراعنہ عصر کا بھی مقصود
کہ بندگانِ خدا ان کو مان لیں معبود
جو حق کو سجدوں کے ہیں سلسلے، وہ اب رک جائیں
انھیں کے در پہ جبینیں عوام کی جھک جائیں

(۱۲)

دو رنگیِ فکرِ بشر بھی ہے ، اس کا حاصل بھی
الٰہیات میں شامل ہے جب تو باطل بھی
سماجیات میں داخل ہے حفظِ قاتل بھی
جمالیات میں شامل ہے رقصِ بسمل بھی
یہ جتنے رنگ رچے ہیں بشر کی فطرت میں
یہ سب تضاد میں روزِ ازل سے خلقت میں

(۱۳)

جو آگ دیکھی تو اس کو سمجھ لیا یزداں
ستارہ دیکھ کے تابش سے رہ گیا حیراں
جو چاند نکلا تو اس پر کیا خدا کا گماں
پھر آفتاب کو سمجھا کہ یہ ہے ربِ جہاں
عدوئے حق کو تو ان پر گماں ہوا رب کا
مگر خلیل نے انکار کر دیا سب کا

(۱۴)

بتایا پھر یہ انھیں اب کہ بندگانِ خدا
خدا ہے بس وہی اک ذاتِ واحد و یکتا
وہی خدا جو ہے لاریب خالقِ دنیا
نہیں ہے زیب کبھی اس کے غیر کو سجدا
یہ مہر و ماہ تو کچھ دیر جگمگاتے ہیں
خدا وہ ہو نہیں سکتے جو ڈوب جاتے ہیں

(۱۵)

بس اک خدا ہے کہ جس کو ہے معتبر سجدہ
وہ جس کو کرتے ہیں سب سبزہ و شجر سجدہ
اسی کو کرتے ہیں خود انجم و قمر سجدہ
ہے لازمی کہ اسی کو کریں بشر سجدہ
یہ سجدہ عزتِ نفسِ بشر بڑھاتا ہے
ہر ایک در پہ جبیں سائی سے بچاتا ہے

مطلعِ ثانی

عبادتوں کے چمن کی بہار ہے سجدہ
جبینِ شوق کی جائے قرار ہے سجدہ
ہر اک ولی و نبی کا شعار ہے سجدہ
عبودیت کے لیئے افتخار ہے سجدہ
یہ بندگی کا شرف بھی ہے اور شہادت بھی
یہ عبدیت کی سند بھی ہے اور ضمانت بھی

(۱۶)

نشانِ سجدہ جو ماتھے پہ جگمگاتا ہے
طرح طرح سے جمال اپنا یہ دکھاتا ہے
کبھی چراغِ سرِ طور یاد آتا ہے
فلک کے چاند سے آنکھیں کبھی ملاتا ہے
نقوشِ سجدہ جو اپنی پھبن دکھاتے ہیں
تو مجھ کو سیدِ سجادؑ یاد آتے ہیں

(۱۸)

خدا کا شکر ، زباں پہ جو ان کا نام آیا
کبھی درود ، کبھی بزم میں سلام آیا
نگاہِ شوق میں جب جلوۂ امام آیا
نظر جبیں پہ دمکتا مہِ تمام آیا
کہ جیسے نورِ یقیں سے دماغ روشن ہو
حرم کے طاق میں جیسے چراغ روشن ہو

(۱۹)

جبینِ پاک پہ سجدہ کے نقش کی تنویر
کہ جیسے لوح پہ ہو مُہرِ کاتبِ تقدیر
یہ نقش ہے کہ ہے طغرائے آیۂ تطہیر
اسی سے آیۂ والشمس کی ہوئی تفسیر
اسی سے روشنی سجدوں کی کائنات میں ہے
اسی سے شانِ عبادت کی شش جہات میں ہے

(۲۰)

وہ ان کا ذوقِ عبادت ، وہ ان کا شوقِ سجود
وہ روز و شب کے عبادات میں قیام و قعود
طویل سجدے وہ ان کے حضورِ ربِ ودود
کہ عبد رہ گئے حیران ، خوش ہوا معبود
اسی سے نازشِ اجداد ہوگئے مولا
لقب سے سیدِ سجاد ہوگئے مولا

(۲۱)

جبیں پہ میری جو چھوٹی سی اک علامت ہے
مرے لیئے یہ بہت باعثِ ندامت ہے
کہ گویا یہ بھی دکھاوے کی ایک صورت ہے
بس ایک بات مجھے باعثِ مسرت ہے
کسی کے در پہ مرا سر کبھی جھکا ہی نہیں
جبینِ شوق کا سودا کبھی کیا ہی نہیں

(۲۲)

ہوا ہے غیرِ خدا کو بس ایک ہی سجدا
وہ سجدہ جس کے لیئے خود خدا نے حکم دیا
بنایا پہلے تو مٹی سے اس نے اک پُتلا
پھر اس میں خالقِ ہستی نے روح کو پھونکا
دیا یہ حکم، ملک اس کو سب کریں سجدہ
خدا کے غیر کو از حکمِ رب کریں سجدہ

(۲۳)

ملک تو نور تھے، پھر بھی بغیرِ چوں و چرا
خدا کے حکم پہ آدم کو کر لیا سجدا
مگر تھا ایک جو ابلیس آگ کا پُتلا
یہ حکم سنتے ہی آتش صفت بھڑک اٹھا
میں آتشیں ہوں، کروں خاک کو میں کیوں سجدہ
میں اپنے آپ سے کم تر کو کیوں کروں سجدہ

(۲۴)

یہ رنگ و نسل میں انساں کی برتری کا جنوں
بشر کو دی ہے اسی نے یہ فکرِ زشت و زبوں
یہ اس نے ذہن بشر پر وہ کر دیا ہے فسوں
کہ اس بناء پہ بہاتا ہے بھائی بھائی کا خوں
جو لوگ اس رہِ ابلیسیت کے رہرو ہیں
خدا کے تو نہیں، ابلیس کے وہ پیرو ہیں

(۲۵)

تھا بدسرشت جو ابلیسِ آتشیں پیکر
ہزاروں سال کیئے صحبتِ ملک میں بسر
ہوا نہ فائدہ کچھ اس سے اس کو ذرہ بھر
کروڑوں سجدے کیئے تھے جبیں میں جذب، مگر
جو ایک سجدہ سے انکار کر دیا اس نے
تمام سجدوں کو بےکار کر دیا اس نے

(۲۶)

یہ جو بھی فکر تھی ابلیس کی، تھی عین خطا
خدا کا حکم نہ سمجھا نہ رتبہ آدمؑ کا
خدا نے خود یدِ قدرت سے ان کو خلق کیا
وہ اس لیئے کہ خلیفہ بنانا تھا اپنا
یہ مرتبے نہ کچھ ابلیسِ بدگہر سمجھا
خود اپنے عیب کو بےعقل نے ہنر سمجھا

(۲۷)

یہ کیوں سمجھ لیا مٹی سے آگ ہے برتر
یہ فلسفہ ہے زبوں، فکر ہے غلط یکسر
جو دیکھیں دونوں کی طینت تو صاف آئے نظر
کہ خاک آگ سے بہتر ہے اور کہیں بہتر
ہے آگ شعلۂ نارِ جحیم کی صورت
تو خاک ارضِ بہشتِ نعیم کی صورت

(۲۸)

سدا سے آگ تباہی کی اک علامت ہے
ازل سے سرکشی و کبر اس کی طینت ہے
امانتوں میں خیانت بھی اس کی فطرت ہے
ہر ایک شے کو جلا دینا اس کی عادت ہے
امانت اس کو جو دیں، یہ اسے نگل جائے
جو چیز اس کے حوالے کریں، وہ جل جائے

(۲۹)

مقابل آگ کے مٹی کی ہے یہ کیفیت
ہے انکسار و تواضع ازل سے اس کی صفت
جو روندتے ہیں اسے پاؤں سے بصد ذلت
انھیں بھی لیتی ہے آغوش میں یہ بے حجت
وہ نخل سوز، یہ نخل آفرین ہوتی ہے
جو خائن آگ تو مٹی امین ہوتی ہے

(۳۰)

اگرچہ ظاہرا بےقدر ہے بہت مٹی
مگر یہ اس کا شرف تو ہے کل جہاں پہ جلی
اسی سے خلق ہوئی ہے زمین یہ ساری
اسی سے پیدا ہوئے آدمی بھی ، حیواں بھی
وہ لوگ بندگیٔ رب کا دم جو بھرتے ہیں
یہ خاک ہی ہے جسے سجدہ گاہ کرتے ہیں

(۳۱)

ہے ایک سجدہ جو تاریخ میں بہت ہی اہم
مثال جس کی نہیں کوئی بھی ، خدا کی قسم
ہیں مسجدِ نبوی میں رسولؐ عرش حشم
خدا کے سجدہ میں ان کا سرِ نیاز ہے خم
وہ ربط ساجد و مسجود کا ہے سجدہ میں
زباں پہ ذکر ہے اور دل جھکا ہے سجدہ میں

(۳۲)

یہی وہ وقت تھا مسجد میں آگئے جو حسینؑ
تھا بچپنے کا جو عالم تو سب کے دل کے تھے چین
علیؑ و فاطمہؑ کے گھر کی زیب و زینت و زین
سوارِ دوشِ محمدؐ پیمبرِ کونین
یہ کھیل میں کس جا پہ آکے بیٹھ گئے
نبیؐ کی پشت کو مسند بنا کے بیٹھ گئے

(۳۳)

حضورؐ سجدہ سے اب سر اٹھائیں تو کیسے؟
پسر کو پشت سے اپنی ہٹائیں تو کیسے؟
نماز سجدہ سے آگے بڑھائیں تو کیسے؟
صلوٰۃ کا یہ وقار اب بچائیں تو کیسے؟
نماز کی انھیں تکمیل بھی تو کرنا ہے
خدا کے حکم کی تعمیل بھی تو کرنا ہے

(۳۴)

حسینؑ پشت پہ، سجدے میں ہیں رسولؐ خدا
زباں پہ جاری ہے "سبحان ربی الاعلیٰ"
جہاں پہ سجدہ یہ تھا، ہے ابھی وہیں پہ رکا
حسینؑ کا یہ عمل ہے عروج سجدہ کا
یہ اپنے کھیل کی عظمت دکھا رہے ہیں حسینؑ
نبیؐ کا طول عبادت بڑھا رہے ہیں حسینؑ

(۳۵)

یہاں سے سجدہ کی تاریخ جو بڑھی آگے
نگاہ لڑ گئی صفین کی لڑائی سے
وہ واقعات جو تاریخ کی کتب میں پڑھے
وہ سب کے سب میری چشمِ خیال نے دیکھے
جو شامیوں کے لیئے وجہِ ننگ و شرم ہوا
یہاں وہ معرکۂ کارزار گرم ہوا

(۳۶)

نظر میں پھر گیا صفین کا جو اب نقشا
تو گونجنے لگی نقارہ و دہل کی صدا
وہ زخمیوں کی کراہیں ، وہ شور قرنا کا
غضب کی جنگ ، قیامت کا رن ، بلا کی وغا
علیؑ کی کفر سے جب بھی ستیز ہوتی تھی
تو نبضِ عالمِ امکان بھی تیز ہوتی تھی

(۳۷)

کہاں ہے اے مرے ساقی ، امیرِ میخانہ
بس اب تو بھر دے شرابِ ولا سے پیمانہ
سبھی تو کہتے ہیں اب مجھ کو تیرا دیوانہ
پلا کے اور مجھے اور کر دے مستانہ
پیئوں جو چھک کے ، ترے نام پر کروں سجدہ
الٹ کے جام اسی جام پر کروں سجدہ

(۳۸)

بس اب مجھے وہ شرابِ طہور دے ساقی
جو ایک جام میں خُم کا سرور دے ساقی
سخن وری کا جو مجھ کو شعور دے ساقی
انھیں نگاہ سے پردے وہ نور دے ساقی
وغا کا رنگ تھے جس سے ، اب وہ دَور چلے
جو روزِ بدر سے چلتا رہا ہے ، اور چلے

(۳۹)

بس اب تو دے مجھے خم بھر کے بادہ کوثر
پیئوں کبھی سرِ منبر، کبھی مصلے پہ
اگر سرور میں صفین مجھ کو آئے نظر
دکھاؤں بزم میں پھر تیری تیغ کے جوہر
نظر میں معرکے پھر جائیں بدر و خیبر کے
سنیں ملک بھی تو شہپر سمیٹ لیں ڈر کے

(۴۰)

چمک رہی ہے جو تیغِ علیؑ کی برقِ تپاں
جہاں پہ گرتی ہے، اٹھتا ہے اس جگہ سے دھواں
عدو کی فوج پہ چھائی ہوئی ہے وحشتِ جاں
ہیں آشیانوں میں طائر بھی خوف سے لرزاں
جو ذوالفقار کی ضو تا بہ چرخ جاتی ہے
تو برق ابر کے پردے میں منھ چھپاتی ہے

(۴۱)

علیؑ کے ہاتھ میں تھی یہ وہ تیغِ جوہردار
کہ جس کے نام سے لرزاں تھے مشرک و کفار
جو قدرداں تھے، وہ کرتے تھے اس پہ جان نثار
غضب کی کاٹ، بلا کی برش تھی، قہر کے وار
نیام اس کے لیئے منزلِ عبادت تھی
وہاں سے جب یہ نکلتی تو پھر قیامت تھی

(۴۲)

یہ جب بھی میان سے باہر نکل کے آتی ہے
تو ساتھ میں ملک الموت کو بھی لاتی ہے
لہو سے دشمنِ ایماں کے یہ نہاتی ہے
عدو کے خون سے یہ تشنگی بجھاتی ہے
نہ جانے کتنا لہو اہلِ کیں کا چاٹ چکی
نہ جانے عمر کے کتنے برس یہ کاٹ چکی

(۴۳)

جدھر بھی حکمِ قضا و قدر سے یہ گزری
پھڑک کے رہ گئے سب ۔ اس ہنر سے یہ گزری
جو سر پہ آئی یہ سر سے تو سر سے یہ گزری
نظر کے تار کٹے جب نظر سے یہ گزری
سمائی آنکھ میں ۔ پتلی کی ڈھال کاٹ گئی
جہاں سے رشتۂ ماضی و حال کاٹ گئی

(۴۴)

نصیرِ دیں ہیں علیؑ اور علیؑ کی یہ تلوار
انھیں نے سر کیئے غزواتِ احمدِؐ مختار
انھیں پہ دیں کے تحفظ کا سب ہے دار و مدار
فلک پہ جب تو ہے لاسیف و لافتیٰ کی پکار
یہ ذوالفقار خدا کے ولی کے ہاتھ میں ہے
کہ دینِ حق کی یہ شہ رگ علیؑ کے ہاتھ میں ہے

(۴۵)

عدو سے کہتی تھی ، تم مائلِ فرار رہو
ہو بے وقار زمانے میں ، بے وقار رہو
ہر ایک رن میں نہ تیغِ آبدار رہو
جو آؤ میرے مقابل تو ہوشیار رہو
ذرا جو صلب میں ایمان کی بہار نہیں
میں قطعِ نسل نہ کردوں تو ذوالفقار نہیں

(۴۶)

ادھر یہ تیزیاں تلوار کی ، ادھر رہوار
براق سی تھی اڑان اس کی ، برق سی رفتار
تھی سر پہ اس کے وہ کلغی کہ فخر کی دستار
ستارہ تھا نہ جبیں پر کہ اسپ تھا سیار
کسی جگہ بھی اسے دشت میں قرار نہ تھا
یہ راہوار کی چھپتی تھی ، اضطرار نہ تھا

(۴۷)

عدو سے جنگ میں یہ تھا نہ ذوالفقار سے کم
نسیم رو و صبا اعتبار و صرصر دم
سفر پہ ہوتے جو آمادہ رہ روانِ عدم
پہنچتے وہ سرِ منزل پکڑ کے اس کے قدم
وہ ان کو لے کے جو اب اس سفر پہ جاتا تھا
عدم کی منزلِ آخر پہ چھوڑ آتا تھا

(۴۸)

یہ اپنے نعل سے لیتا تھا کارِ گرز و تبر
کسی کو روند کے چھوڑا ۔ کسی کو دی ٹھوکر
کسی کے سینہ کو کچلا ۔ کسی کا توڑا سر
خود آگیا کوئی ٹاپوں میں اس کی گھبرا کر
یہ رن میں لشکرِ اعدا پہ جب لپکتا تھا
ہر ایک نعل سے دشمن کا خوں ٹپکتا تھا

(۴۹)

ابھی تھا رن میں یہ ہنگامۂ وغا برپا
غضب کی جنگ ۔ قیامت کی ہو رہی تھی وغا
علیؑ پہ جانیں فدا کر رہے تھے اہلِ وفا
یہی تھا وقت کہ وقتِ نماز آ پہنچا
علیؑ نے بہرِ نماز اپنی روک لی تلوار
جو ڈھا رہی تھی قیامت ۔ وہ رک گئی تلوار

(۵۰)

یہ حال دیکھ کے گھبرا گئی سپاہِ وفا
کسی نے بڑھ کے یہ مولا علیؑ سے عرض کیا
یہ اس عروج پہ جنگ اور ایسی سخت وغا
غضب ہے آپ کی تلوار کا یہ رک جانا
وغا سے ایسے میں جو آپ ہاتھ اٹھائیں گے
خدا نخواستہ ہم جنگ ہار جائیں گے

(۵۱)

برستے تیروں میں یہ جانماز ، حیرت ہے
یہاں تو جان کو ہر لحظہ خوف و دہشت ہے
کہا علیؑ نے کہ یہ لازمی عبادت ہے
قیام اس کا تو اسلام کی ضرورت ہے
اسی نماز کی خاطر یہ جنگ ساری ہے
یہ حفظِ حکمِ خدا میری ذمہ داری ہے

(۵۲)

بس اب علی نے مصلے پہ جو قدم رکھا
برستے تیروں میں کی آپؑ نے نماز ادا
نماز ختم ہوئی تو خدا کا شکر کیا
بصد خضوع و خشوع آخری کیا سجدا
عدو پہ اب یہ کھلا حق کے یہ ولی کیا ہیں
نماز کیا ہے ، یہ سجدہ ہے کیا ، علیؑ کیا ہیں

(۵۳)

نبیؐ کے بعد زمانہ میں بےعدیل علیؑ
جہانِ علم میں استادِ جبرئیلؑ علیؑ
وجودِ خالقِ کونین کی دلیل علیؑ
بتوں کے دور میں اللہ کے وکیل علیؑ
خموش آیتوں کے ترجمان ہیں گویا
خدائی میں یہ خدا کی زبان ہیں گویا

(۵۴)

خدا کے گھر میں جو پیدا ہوئے تو صرف علیؑ
نبیؐ کے ہاتھوں پہ گویا ہوئے تو صرف علیؑ
انھیں کی طرح سے مولاؑ ہوئے تو صرف علیؑ
جو کفوِ حضرتِ زہراؑ ہوئے تو صرف علیؑ
شرف یہ خاص ہوئے حق کے اس ولی کے لیئے
فضیلتیں ہیں یہ مخصوص بس علیؑ کے لیئے

(۵۵)

خدا صفات ، امامت حشم ، رسولؐ نظیر
نظیر جن کی نہ ہجرت کی شب نہ روزِ غدیر
غدیر میں ہوئے مولائے ہر غریب و امیر
امیر وہ کہ لقب ہو گیا جنابِ امیرؑ
امیر ہو کے زمیں پر جو محوِ خواب ہوئے
ہوئے جو خواب سے بیدار ابو تراب ہوئے

(۵۶)

رسولؐ ہر دوسرا نے لڑے ہیں جو غزوات
تھے شامل ان میں بنفسِ نفیس وہ دن رات
تھی ان لڑائیوں میں فتحیاب کس کی ذات
بس ایک نام لیں جس نے عدو کو دی ہو مات
یہ چاکِ دامنِ تاریخ سِل ہنیں سکتا
بجز علیؑ کے کوئی نام مل ہنیں سکتا

(۵۷)

سوا علیؑ کے کسی نے بھی فتح کی کوئی جنگ،
دکھائی بعض نے خیبر میں گو بظاہر امنگ
مگر عدو کے مقابل جما نہ ایک کا رنگ
ظفر تو دور رہی ان سے سیکڑوں فرسنگ
یہاں بھی فتح و ظفر مرتضیٰ کے ہاتھ رہی
نبیؐ کی آبرو دستِ خدا کے ہاتھ رہی

(۵۸)

علیؑ کے اوج سے واقف نہیں ہیں، ہم ہوں کہ تم
وہ جن کے ہاتھ سے ہم کو ملا ہے بادۂ خُم
انھیں کی شان میں ہے " انما ولیکم"
ہیں اتنے وصف کے پہلو کہ عقل ہے گم صم
ہیں وہ بھی، بغض جو ان سے روا سمجھتے ہیں
وہ لوگ بھی ہیں جو ان کو خدا سمجھتے ہیں

(۵۹)

نہنگِ بحرِ شجاعت ، ہزبرِ دشتِ وغا
اسد جلالت و اژدر در و ابوالہیجا
امیرِ کشورِ دیں ، شہریارِ ارض و سما
خدیوِ خلد و نجف ، تاجدارِ ملکِ بقا
" شہے کہ بگزرد از نہ سپہر افسرِ او
اگر غلامِ علیؑ نیست ، خاک بر سرِ او "
(بیرم خان خاناں)

(۶۰)

علیؑ کو عشق جو تھا کبریا کی طاعت سے
تو کوئی سانس بھی خالی نہ تھی عبادت سے
شرف حرم کو ملا آپؑ کی ولادت سے
تو نام ہو گیا مسجد کا بھی شہادت سے
نماز ، مسجدِ کوفہ ، خدا ، علیؑ ، سجدہ
وہ پہلا سجدہ جو ٹھہرا اب آخری سجدہ

(۶۱)

وہ اک سحر ، وہ غمِ بےکراں میں غرق سحر
نمازِ فجر کو آئے علیؑ خدا کے گھر
وہاں تو گھات میں تھا ابنِ ملجمِ خودسر
لگائی سجدہ میں تلوار آپ کے سر پر
تھا سہل چونکہ یہ قاتل کا کام سجدہ میں
علیؑ کی زیست کا تھا اختتام سجدہ میں

(۶۲)

سجودِ حق میں شہادت عجب روایت تھی
جو اہلِ بیتِ محمدؐ میں اب علیؑ سے چلی
یہ اب جو مسجدِ کوفہ سے اور آگے بڑھی
عروج دے گئے اس کو حسینؑ ابنِ علیؑ
نہ کر سکا کوئی اس شان سے کبھی سجدہ
وہ کربلا ، وہ حسینؑ اور وہ آخری سجدہ

(۶۳)

وہ قتل گاہِ وفا میں حسین کا سجدہ
نبیؐ کے راحتِ جاں ، نورِ عین کا سجدہ
وہ جانِ فاتحِ بدر و حنین کا سجدہ
امامِ وقت ، شہِ مشرقین کا سجدہ
جبیں کو نازِ عبادت بنا دیا جس نے
اجاڑ دشت کو جنت بنا دیا جس نے

(۶۴)

حسینؑ کون ، وہ نورِ نگاہِ پیغمبرؐ
علیؑ کا نورِ نظر ، فاطمہؑ کا لختِ جگر
وہ تشنہ لب کہ پدر جس کا ساقیٔ کوثر
وہ جس نے آخری سجدہ کیا تہِ خنجر
لہو سے اس کے عبادات نے نمو پائی
اس کے سجدہ سے سجدوں نے آبرو پائی

(۶۵)

امیر کون و مکاں ، شاہ مشرقین حسینؑ
جہانِ صبر و شہادت کی زیب و زین حسینؑ
حق آشنا ، بشریت کے دل کا چین حسینؑ
کوئی بھی مذہب و ملت ہو ، بس حسینؑ حسینؑ
عقیدت ان سے دلوں میں جو یوں سمائی ہے
حسینؑ ہی کی زمانہ میں اب خدائی ہے

(۶۶)

حسینؑ بندۂ معبود ، اعتبارِ خدا
شہِ شہانِ جہاں ، تاجدارِ ارض و سما
وصیِّ احمدِؐ مرسل ، امامِ اہلِ ہدیٰ
رسولِ دینِ شہادت ، خدائے صبر و رضا
جہانِ عزم و شجاعت میں بے مثال ہیں یہ
زوال جس کو نہیں ، وہ مہِ کمال ہیں یہ

(۶۷)

امینِ عظمتِ انساں ، محافظِ اسلام
ملوکیت سے بچایا ہے جس نے حق کا نظام
سکھایا جس نے یہ ، کیسے ہو جابروں سے کلام
بتایا جس نے یہ ، ظالم سے دوستی ہے حرام
حرام کام تو اہلِ ہدیٰ نہیں کرتے
جو یہ کریں ، وہ خدا سے وفا نہیں کرتے

(۶۸)

عمل سے اپنے بتایا ہے یہ شہِ دیں نے
جو پیشِ حاکمِ جابر کلامِ حق نہ کہے
جو سجدۂ تہِ خنجر میں شکرِ حق نہ کرے
اسے یہ حق ہی نہیں ہے کہ آبرو سے مرے
ضرورتاً جو لہو سے وضو نہیں کرتا
وہ خود کو پیشِ خدا سرخرو نہیں کرتا

(۶۹)

وہ یادگار جو سجدہ ہے ، وہ حسینؑ کا ہے
جبیں وقار جو سجدہ ہے ، وہ حسینؑ کا ہے
حق اعتبار جو سجدہ ہے ، وہ حسینؑ کا ہے
ابد قرار جو سجدہ ہے ، وہ حسینؑ کا ہے
عروسِ ذکر کا سرتاج ہے یہی سجدہ
جبینِ شوق کی معراج ہے یہی سجدہ

(۷۰)

وہ قتل گاہ جہاں شہؑ نے رکھ دی اپنی جبیں
منیٰ کی دوسری تصویر بن گئی وہ زمیں
بنی زمین ہوئی کعبۂ بہشتِ یقیں
اس زمین پہ ہے سجدہ ریز چرخِ بریں
یہاں فلک کی جبیں بھی جھکا گئے ہیں حسینؑ
زمین کو عرشِ معلیٰ بنا گئے ہیں حسینؑ

(۷۱)

وہ صبحِ صادقِ روزِ دہم وہ کرب و بلا
وہ وقتِ فجر ، وہ نورِ سحر کی رن میں ضیا
اذانِ اکبر مہرو کا حسن ، صلِ علیٰ
فضا میں گونج رہا تھا رسولؐ کا لہجا
اب اہلِ حق جو صف آرا پئے نماز ہوئے
تو اقتدائے شہِ دیں سے سرفراز ہوئے

(۷۲)

بہ اقتدائے امامؑ اب ہوا قیام و قعود
وہ سب کی زینتِ لب ذکر و حمدِ ربِ ودود
بصد خضوع و خشوع ان کے وہ رکوع و سجود
وہ قبلِ ختم سلام اور بعدِ ختم درود
وہ بعدِ ختم نماز ان کے شکر کے سجدے
خدا نے ناز کیا اس طرح کیئے سجدے

(۷۳)

پھر اس کے بعد جو وقتِ نمازِ ظہر آیا
شہید ہو چکے تھے شاہِ دیں کے کچھ رفقا
جو اب بچے تھے رفیق و عزیزِ شاہ ہدیٰ
بڑھے نماز کو ہمراہِ سیدِ والا
اگرچہ جنگ کا یہ موقع و مقام نہ تھا
مگر نماز کا اعداً کو احترام نہ تھا

(۷۴)

نمازیوں پہ ہزاروں جو تیر آنے لگے
گئے سعید و زہیرؑ اب امامؑ کے آگے
لیئے وہ سینوں پہ ، آئے جو تیر اعداً کے
ہوئی جو ختم نماز اور شکر کے سجدے
تمام وقت یہ سینہ سپر رہے دونوں
نماز ختم ہوئی جب تو گر گئے دونوں

(۷۵)

اب اس کے بعد شہادت کا سلسلہ جو چلا
شہید ہو گئے شاہِ ہدیٰ کے سب رفقا
کی ان کے بعد عزیزوں نے اپنی جان فدا
بس اب حسینؑ ہیں اور بس حسینؑ ہیں تنہا
ہر اک شہید کو مقتل سے لا چکے ہیں حسینؑ
سبھی کے دشت سے لاشے اٹھا چکے ہیں حسینؑ

(۷۶)

بس اب حسینؑ کو گھیرے ہوئے ہے لشکرِ کیں
ہر ایک سمت سے کرتے ہیں وار دشمنِ دیں
لہو کی دھاروں سے سیراب ہو رہی ہے زمیں
ہے اب وہ ضعف کہ مشکل ہے ٹھہرنا سرِ زیں
مگر جہاد میں بڑھتے ہی جا رہے ہیں حسینؑ
عجیب جرأت و ہمت دکھا رہے ہیں حسینؑ

(۷۷)

زوال پہ ہے ادھر آفتابِ عاشورا
نماز عصر کا ہے وقت اور دشتِ وغا
اذاں کی عرشِ الٰہیٰ سے آ رہی ہے صدا
نماز کے لیئے تیار ہیں امامِ ہدیٰ
حسینؑ آتے ہیں اب مرکزِ عبادت میں
نیا کھلے گا در اب کعبۂ شہادت میں

(۷۸)

وہ اک نشیب جو ٹیلے کی آڑ میں ہے چھپا
وہ خیمہ گاہ سے بالکل نظر نہیں آتا
نمازِ عصر کریں گے وہیں حسینؑ ادا
پسند اس لیئے کرتے ہیں وہ جگہ مولاؑ
جو قتل شمر کرے شاہِ کربلائی کو
نہ ذبح ہوتے بہن دیکھے اپنے بھائی کو

(۷۹)

ادھر نشیب کی جانب رواں ہیں شاہِ ہدا
ادھر سے چلتے ہیں سنگ و سنان و تیر جفا
نمازِ عصر کا ایسے میں وقت آپہنچا
وضو بھی بہتے ہوئے خوں سے ہوگیا تازا
بس اب مصلّٔے صبر و رضا پہ آنا ہے
نمازِ عصرِ شہادت میں سر جھکانا ہے

(۸۰)

ہر اک طرف سے قیامت کے چل رہے ہیں وار
سنبھلنا اسپ پہ مولاؑ کو اب ہوا دشوار
تو باہیں گردنِ مرکب میں ڈال دیں یکبار
اسی طرح سے جو لایا نشیب تک رہوار
مقام سجدۂ آخر کا پا گئے مولاؑ
زمیں پہ زیں کی بلندی سے آگئے مولاؑ

(۸۱)

زمیں پر آئے جو پشتِ فرس سے شاہِ عرب
سنبھالا جسم میں پیوست ناوکوں نے غضب
نماز کو تھا قیام و قعود ممکن کب
بس ایک سجدۂ آخر ہے اور حسینؑ ہیں اب
حسینؑ سجدۂ آخر میں سر جھکاتے ہیں
زمیں لرزتی ہے ، افلاک تھرتھراتے ہیں

(۸۲)

یہ سجدہ اک تہِ محرابِ خنجرِ قاتل
یہی ہے ساری عباداتِ خلق کا حاصل
یہی ہے روحِ عبادت کی آخری منزل
اسی نے آج عبادت کو کر دیا کامل
اسی سے روحِ عبادات کو دوام ملا
بشر کو اوج ملا ، بندگی کو نام ملا

(۸۳)

مصلّا کرتے ہیں مقتل کو بس جو اب سرورؑ
ہے کائنات کو سکتہ ، زمانہ ہے ششدر
یہ سجدہ جس میں ہوا ربطِ گردن و خنجر
اسی پہ ختم ہے سجدوں کے ارتقاٗ کا سفر
اب اس کے آگے عبادات کے حدود نہیں
اب اس کے آگے کوئی منزلِ سجود نہیں

(۸۴)

ابھی خدا سے لگائے تھے لَو شہؑ والا
نیاز و ناز کی باتیں تھیں بینِ عبد و خدا
تھا لب پر آپ کے "سبحان ربی الاعلیٰ"
یہ لمحہ وہ تھا کہ معراج پا گیا سجدا
عجب یہ سجدہ ہے جو ناوکوں کے فرش پہ ہے
زمین پر یہ نہیں، جانمازِ عرش پہ ہے

(۸۵)

ادھر حسینؑ تھے اور سجدۂ خدا میں جبیں
چلا ادھر سے وہ خنجر اٹھائے شمر لعیں
پہنچ گیا وہ سرِ سجدہ گاہِ عصرِ یقیں
وہ اس کے پائے نجس اور پشتِ سرورؑ دیں
لعیں نے شہؑ کا تن چاک چاک روند دیا
کہ پائے نحس سے قرآنِ پاک روند دیا

(۸۶)

وہ دستِ شمر کو جنبش ہوئی، وہ حشر ہوا
زمیں لرزنے لگی، آسماں سے خوں برسا
حسینؑ قتل ہوئے، یہ فلک سے آئی ندا
لرز کے رہ گئیں خیمہ میں زینبؑ کبرا
اٹھیں تڑپ کے تو چلنے میں لڑکھڑانے لگیں
تھے غش میں عابدؑ بیمار، انھیں اٹھانے لگیں

(۸۷)

اٹھا کے غش سے یہ عابدؑ سے بولیں گھبرا کر
یہ کیسا حشر ہے دیکھو تو اٹھ کے اے دلبر
خدا ہی جانے ہے کس حال میں تمھارا پدر
مجھے تو کچھ نہیں آتا ہے چار سمت نظر
سیاہ آندھیوں نے دشتِ کیں کو گھیرا ہے
کوئی چراغ نہیں ، ہر طرف اندھیرا ہے

(۸۸)

یہ سن کے عابدؑ مضطر سہارا لے کے اٹھے
اٹھا کے خیمہ کا پردہ جو دیکھا بے کس نے
سناں پہ باپ کا سر دیکھ کر تڑپ اٹھے
زباں سے نکلے بصد اضطراب یہ کلمے
قتیلِ خنجر شمر لعیں سلامٌ علیک
ذبیحِ سجدۂ عصر یقیں سلامٌ علیک

مرثیہ

گواہی

تعدادِ بند......۱۱۲

قطعہ

وسعتِ کارِ نبیؐ کی حد میں شامل کربلا
دین کی سینہ سپر ، باطل کی قاتل کربلا
کشتیٔ اسلام کے مالک نبیؐ ، لنگر حسینؑ
ایک ساحل ہے مدینہ ، ایک ساحل کربلا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

گواہی

در حالِ جنابِ علی اصغرؑ و امام حسینؑ

(۱)

مری نظر میں ہے منظر دیارِ ہستی کا
ہے رنگ جوش پہ باغ و بہارِ ہستی کا
شباب ہے جو نظر میں نگارِ ہستی کا
زباں پہ وصف ہے پروردگارِ ہستی کا
شعور نے جو یہ منظر مجھے دکھایا ہے
زباں پہ اشہد ان لا الٰہ آیا ہے

(۲)

یہ لفظ اَشہدُ حق گوئی کی علامت ہے
نظامِ عدل میں اس کی بڑی ضرورت ہے
یہی ہے حق کی گواہی، یہی شہادت ہے
خدا سے ربط اسی لفظ کی بدولت ہے
وجودِ حق پہ یہ قرآن کی گواہی ہے
خدا کی ذات پہ انسان کی گواہی ہے

(۳)

نظام عدل نے دینی ہو وہ کہ دنیاوی
گواہیوں ہی پہ انصاف کی بِنا رکھی
ثبوتِ دعوئی کو لازم ہے شاہدِ عینی
سنی سنائی پہ کرتا نہیں یقین کوئی
یہی ہے ضابطہ قانون میں شہادت کا
یہی اصول ہے اللہ کی شریعت کا

(۴)

تقاضا کرتا ہے شاعر کا جب دلِ حسّاس
لگاتا ہے وہ عدالت خود اک سرِ قرطاس
وہ جس میں ہوتے ہیں منصف ضمیر اور احساس
فریق تاج اُدھر اور اِدھر عوام الناس
مقدمہ جو یہاں رو بکار ہوتا ہے
زباں وکیل قلم پیشکار ہوتا ہے

(۵)

شروع ہوتا ہے جب سلسلہ سماعت کا
گواہ ہوتا ہے تاریخ کا ہر اک لمحہ
مؤرخ آتا گواہی کو تو کہا جاتا
جو اس نے دی ہے خبر اس کا اعتبار ہی کیا
خبر میں جھوٹ کا بھی احتمال ہوتا ہے
یہ حرص و جبر کا بھی اک مآل ہوتا ہے

(۶)

لہٰذا اس نے گواہی میں جو بیان دیئے
اہمیت یہ معزز عدالت ان کو نہ دے
یہاں پہ لاتے ہیں اکثر سکھا پڑھا کے اسے
کبھی بہ جبر ، کبھی مال و زر کی لالچ سے
مفادِ ذات کے دھارے پہ جب یہ بہتا ہے
تو پھر یہ جھوٹ کو سچ ، سچ کو جھوٹ کہتا ہے

(۷)

ہزاروں واقعے ایسے یہاں تو ہوتے ہیں روز
کہ چند پیشہ ور و شاہدان کذب فروز
دیا ہی کرتے ہیں پیہم شہادتیں حق سوز
بلا سے ان کا نتیجہ ہو کتنا ہی دل دوز
انھیں یہ فکر نہیں ظلم بڑھ نہ جائے کہیں
یہ بے گناہ ہے ، سولی پہ چڑھ نہ جائے کہیں

(۸)

کچھ ایسے واقعے تاریخ میں بھی ہیں محفوظ
کہ اہلِ عدل جو ان کو پڑھیں تو ہوں محظوظ
مگر جو لفظوں کی تہہ میں ہیں معنیٔ ملفوظ
بہت ہی باعثِ عبرت ہیں یہ رہے ملحوظ
نہ منصفی نہ جہاں آبرو شہادت کی
کہیں جو عدل تو توہین ہو عدالت کی

(۹)

تھا ایک اونٹ پہ قاضی کو فیصلہ کرنا
وہ جس کا اونٹ تھا وہ تو گواہ لا نہ سکا
وہ لے کے آیا اسے اونٹنی جو کہتا تھا
کہا سبھی نے یہ ہے اونٹنی قسم خدا
ہے خوب عدل کہ قاضی کی کم نگاہی سے
وہ اونٹ اونٹنی ٹھہرا اسی گواہی سے

(۱۰)

جو منصفوں سے کہ تھے مدعا علیہ وہی
جب ایک مسئلۂ ملکیت پہ بحث ہوئی
دلیل دی گئی جب قبضہ و تصرف کی
تو قاضیوں سے شہادت ہبہ کی بھی مانگی
جو حقِ ارث پہ قرآن کی شہادت تھی
اسے بھی کر دیا رد ، یہ عجب عدالت تھی

(۱۱)

کسی کے حق پہ سوا لاکھ شخص تھے جو گواہ
اسے بھی حق نہ ملا ، خوب منصفی ہے یہ ، واہ
کبھی کھلی جو شہادت کو خود لسان اللہ
گواہی وہ بھی ہوئی مسترد ، خدا کی پناہ
یہ فیصلے ہیں وہ جن پر کوئی دلیل نہیں
مگر عدالتِ دنیا میں اب اپیل نہیں

(۱۲)

خدا علیم ہے، سب کچھ ہے علم میں اس کے
چھپا نہیں ہے کسی کا کوئی عمل اس سے
کسی گواہ کی حاجت ذرا نہیں ہے اسے
ثبوتِ جرم ہے لازم مگر سزا کے لیئے
وہاں بھی فیصلہ ہوگا کسی شہادت پر
کہ حرف آئے نہ اللہ کی عدالت پر

(۱۳)

بروزِ حشر جو وقتِ حساب آئے گا
فرشتے لائیں گے اعمال نامہ اک اک کا
کریں گے عذر جو ہم، اس کا اعتبار ہی کیا
کہ آدمی دمِ تحریر اپنا کوئی نہ تھا
ملک کے حق میں گواہی کو لب یہ کھولیں گے
ہمارے عضو ہمارے خلاف بولیں گے

(۱۴)

ہے جیسے ہم کو یہ لازم کہ جب کریں دعوا
گواہ پیش کریں اور ثبوت دیں اس کا
اسی طرح سے اگر یہ سوال ہو پیدا
وجودِ خالقِ کونین کی دلیل ہے کیا
گواہ چاہیئے ہیں شانِ کبریائی پر
ثبوت چاہیئے ہے دعوئے خدائی پر

(۱۵)

نہیں تو کوئی بھی فرعون اور کوئی نمرود
اٹھے گا کر کے یہ دعویٰ کہ ہے وہی معبود
وہی خدا ہے ، وہی کبریا وہی مسجود
اسی کے ہاتھ میں ہے ہر بشر کی بود و نمود
اگر گواہ و دلیل اِس پہ بے ضرورت ہے
تو پھر یہ دعویٰ باطل بھی اک حقیقت ہے

(۱۶)

تمام خلق میں ہے سب سے باشعور انساں
ہے نیک و بد بھی انسان کی نظر پہ عیاں
یہ اپنی فکر میں آزاد ہے ببر عنواں
جبھی تو اس کے بھٹکنے کے ہیں بہت امکاں
یہ راہِ حق و صداقت سے ہٹ بھی جاتا ہے
خدا کی دے کے شہادت پلٹ بھی جاتا ہے

(۱۷)

کبھی جو دیتی ہے اس کی خرد اسے دھوکا
سمجھنے لگتا ہے طاقت کو یہ خدا اپنا
کبھی جو دیکھتا ہے یہ انا کا آئینا
تو کہنے لگتا ہے خود اپنے آپ ہی کو خدا
کبھی شعور جو اس کو فریب دیتا ہے
یہ اک نہ ایک خدا خود تراش لیتا ہے

(۱۸)

سوائے حضرتِ انساں جو اور ہے خلقت
نہ اس پہ نفس پرستی ، نہ کفر کی تہمت
نہ اس کو شوقِ خدائی ، نہ اقتدار کی لت
نہ بت تراشنا اس کے لیئے کوئی صنعت
بس اپنی اپنی زباں میں خدا کی مدحت ہے
یہی ہے ان کی گواہی ، یہی عبادت ہے

(۱۹)

یہ چہچہاتے پرندے چمن میں نغمہ سرا
خروس و قمری و طاؤس و بلبلِ شیدا
سرور عشق میں حق سرّہٗ کا یہ نعرا
یہ بانگِ مرغ ، اذانِ سحر جو ہے گویا
کمالِ صنعتِ صانع کا دم یہ بھرتے ہیں
سب اپنی اپنی طرح اس کی حمد کرتے ہیں

(۲۰)

زبانِ خار پہ ہے حمدِ خالقِ غفار
ہیں ایک وجد کے عالم میں سب گل و گلزار
یہ اٹھتی جھکتی ہوئی ٹہنیاں ثمر بردار
کہ جیسے محوِ رکوع و سجود ہوں ہر بار
خدا کے حکم پہ ان کی جو ہے نظر پیہم
کھڑے ہیں سارے شجر ایک پاؤں پر پیہم

(۲۱)

نجومِ بزمِ فلک کی وہ نورافشانی
وہ ماہتاب کی جلوہ فروز تابانی
وہ آفتاب کی ظلمت شکن درخشانی
جھلک دکھاتا ہے ان سب میں نورِ یزدانی
فلک کی بزم میں شمعیں جو یہ جلائی ہیں
شعور کہتا ہے جلوے یہ کبریائی ہیں

(۲۲)

وہ کوہسار ، وہ جنگل ، وہ دشت ، وہ گلزار
وہ شط ، وہ جھیل ، وہ دریا ، وہ قلزمِ ذخار
وہ کہکشاں کے چراغوں کی دل فریب قطار
وہ آبشار ، وہ پانی کی خوش نما دیوار
کمالِ صنعتِ صانع دکھا رہے ہیں سبھی
پتہ کسی نہ کسی کا بتا رہے ہیں سبھی

(۲۳)

وہ رات کی ہو سیاہی کہ نور کا تڑکا
وہ حبس ہو کہ ہو ٹھنڈی ہوا کا اک جھونکا
ہو موج زمزم و کوثر کہ پیاس کا صحرا
ہو برشگال کی رم جھم کہ زور کا لہرا
یہ سب دلیلِ وجودِ الٰہ ہیں کہ نہیں؟
یہ سب خدائی پہ اس کی گواہ ہیں کہ نہیں؟

(۴۴)

ہے ذرہ ذرہ سے یکسر عیاں خدا کا وجود
ہے ظاہرا کوئی خالق بھی خلق کا موجود
وہ جس کے ہاتھ میں ہے اس جہاں کی بود و نمود
تمام خلقتِ عالم ہے عبد ، وہ معبود
ہنر تو اہلِ ہنر کا کمال ہوتا ہے
سبب کا ہونا مُسبّب پہ دال ہوتا ہے

(۴۵)

جب ان مظاہرِ قدرت کی یہ گواہی بھی
ثبوتِ حق کے لیئے ہو بشر کو ناکافی
جب آنکھ والوں کو دھوکا دے ان کی بینائی
سماعتوں پہ جو مہریں لگی ہوں باطل کی
نگاہِ کور کو نورِ خدا ملے کیسے
بشر کو عظمتِ حق کا پتا ملے کیسے

(۴۶)

جبھی تو جہل کو رہبر بنا کر انساں نے
ادھوری عقل سے ، نامعتبر بصیرت سے
بغیر رہبری عقل فیصلے جو کیئے
خدا کے بارے میں دھوکوں پہ کھائے ہیں دھوکے
تلاشِ حق میں کہیں سے چلے ، کہیں پہنچے
کسی بھی راہ سے اللہ تک نہیں پہنچے

(۲۷)

ہو رائج دہر میں جب اس طرح جہالت کا
ستارہ لوج پہ آتا ہے بادشاہت کا
خمار چڑھتا ہے پھر تاج کی رعونت کا
کچھ اور بڑھتا ہے نشہ مئے حکومت کا
پھر اقتدار کی طاقت جتائی جاتی ہے
جو سر اٹھائیں تو گردن اڑائی جاتی ہے

(۲۸)

اسی فضا سے ابھرتا ہے پھر کوئی نمرود
اسی سے اٹھتا ہے فرعون سا کوئی مردود
جو بے لگام سبھی کو بھی جان کر محدود
یہ چاہتا ہے کہ بن جائے خلق کا معبود
سند خدائی کی لے حاشیہ نشینوں سے
کرائے سجدے خریدی ہوئی جبینوں سے

(۲۹)

جو حال دیکھ کے انسانیت کا اتنا سقیم
گواہ مانگے خدائی پہ کوئی ابراہیم
تو اس زمین پہ بھڑکا کے شعلہ ہائے جحیم
اسی میں پھینک دے اس کو سمجھ کے اپنا غنیم
غرض ہو اس سے کہ یوں رفع یہ عذاب بھی ہو
زمانے بھر پہ خدائی کا رعب و داب بھی ہو

(۳۰)

پیامِ حق لیئے موسیٰ جو اس کے پاس آئے
رہِ نجات وہ فرعون کو دکھانے لگے
اب اس نے وصف جو پوچھے خدائے برحق کے
یہ مختصر سا تعارف کرایا حضرت نے
خدا کے زیرِ نگیں کائنات ہوتی ہے
اسی کے ہاتھ میں موت و حیات ہوتی ہے

(۳۱)

یہ سن کے اس نے کسی بے گنہ کو قتل کیا
کہا کہ موت مرے ہاتھ میں ہے، دیکھ ذرا
سزائے موت کے قیدی کو کر دیا جو رہا
کہا کہ دیکھ لو مردے کو کر دیا زندہ
نگاہِ عدل میں یہ بس ادائے شاہی تھی
نہ یہ دلیل تھی برحق، نہ یہ گواہی تھی

(۳۲)

وہ جب بھی صورتِ حال اس طرح کی پیش آئی
خدا کے حق میں شہادت کی آگئی باری
جو مسترد نہ ہو ایسی شہادتِ لبدی
خدا کے خاص گواہوں کی ذمہ داری تھی
وہی زمیں پہ نمائندۂ الٰہ بھی تھے
وہی وکیل بھی حق کے، وہی گواہ بھی تھے

(۳۳)

یہ وہ گواہ تھے جن کا نظیر تھا نہ مثیل
جہانِ عدل میں جن کا ہوا نہ کوئی عدیل
انھیں کے نور سے روشن تھی صدق کی قندیل
کوئی ذبیحِ رہِ حق ، کوئی خدا کا خلیل
جو لوگ مثلِ ذبیحؑ و خلیلؑ ہوتے ہیں
وہ خود وجودِ خدا کی دلیل ہوتے ہیں

(۳۴)

گواہ حق کے تھے آدم سے لے کے خاتم تک
دکھا رہے تھے جو دنیا کو نورِ حق کی جھلک
اندھیرے کفر کے جن سے اٹھاتے رہتے تھے زک
وہ سب وجودِ خدا کی دلیل تھے بے شک
سند خدائی پہ لیتے تھے کل خدائی سے
خود اپنے خون کی گلرنگ روشنائی سے

(۳۵)

کسی کو آرے سے چیرا گیا بہ ظلم و ستم
کسی کے واسطے دار اور کسی کو قید الم
کسی کو آگ میں پھینکا کہ ہو وہ جل کے بھسم
مگر انھوں نے نہ مٹنے دیا وفا کا بھرم
ادھر جفا پہ حریفانِ حق تُلے ہی رہے
ادھر خدا پہ گواہی کو لب کُھلے ہی رہے

(۳۶)

یونہی گزرتے ہوئے وقت کی ہٹی جب دھول
نگاہِ دل نے لیا بوسۂ جبینِ رسولؐ
وہی رسولِ جو سارے عرب میں تھا مقبول
کہ حسنِ خُلق تھا اس کی حیات کا معمول
جب اس کے نور کی فاران جلوہ گاہ ہوا
تو اس کے صدق پہ سارا عرب گواہ ہوا

(۳۷)

عجیب دَور تھا وہ جہل و جاہلیت کا
انا پرستیوں کی بھینٹ چڑھ گیا تھا خدا
کوئی شجر ، کوئی پتھر کا بت ، کوئی پُتلا
سبھی کو ان میں تھا حاصل خدائی کا درجا
وہ کون شے تھی وہاں جس کی کبریائی نہ تھی
نہ تھی تو صرف اک اللہ کی خدائی نہ تھی

(۳۸)

یہ ذوق و شوقِ خداسازی و الٰہ گری
ہر ایک پیروِ بوجہل کی تھی کم نظری
بڑھی جو حد سے سوا حق سے ان کی بے خبری
ہوا رسول کا ذمہ بشر کی راہبری
خدا نے چاہا کہ ذہنوں میں انقلاب آئے
تو آپ بن کے ہدایت کا آفتاب آئے

(۳۹)

جو مدعیٔ رسالت ہوئے رسولؐ انام
تو حق یہ پوچھنے کا رکھتے تھے خواص و عوام
اگرچہ آپ ہیں صادق ، نہیں کچھ اس میں کلام
حضور اتنا بڑا دعوئے رسالتِ عام
ثبوت دعوے کا منجانب اللہ بھی ہے
کوئی سند ، کوئی سرخط ، کوئی گواہ بھی ہے

(۴۰)

جو مدعیٔ نبوت کبھی ہو کوئی بشر
ہے لازم اس کو ثبوت و گواہ دعوے پر
نہیں تو روز ہی آجائے بن کے پیغمبر
کوئی مسیلمۂ کاذب و جفا پرور
نبی بنیں گے جو دعوائے بےدلیل کے ساتھ
کبھی بتائیں گے ربط اپنا جبرئیل کے ساتھ

(۴۱)

وہ حق تھا لوگوں کا ، یہ فرض سیدِ عالمؐ
کہ لائیں دعوے پہ اپنے گواہیاں محکم
کوئی ثبوت نہ دعوے کا ہو تو حق کی قسم
اسے قبول کرے گا کوئی عرب نہ عجم
نہ آئے حق پہ گواہی تو حق بھی رد ہوگا
جو بےدلیل ہو دعویٰ تو مسترد ہوگا

(۴۲)

خدا نے چونکہ مقرر کیا تھا ان کو نبی
لہٰذا اس نے تقرر کی خود سند بھیجی
وہ اک کتاب کہ جو تا بہ حشر ہے باقی
جواب جس کی کسی شِق کا لا سکا نہ کوئی
سبھی نے کہہ دیا یہ آدمی کا کام نہیں
کلامِ حق ہے یہ ، اس میں کوئی کلام نہیں

(۴۳)

پھر اس کے بعد گواہوں کی آگئی باری
تو خود مظاہرِ قدرت ہوئے گواہِ نبیؐ
ہے نظمِ عدل میں جو شرط دو گواہوں کی
تو ایک چاند نے دو ہو کے خود گواہی دی
جو اہلِ شر نے کیا شک نبیؐ کے بارے میں
تو چاند ہوگیا دو ان کے اک اشارے میں

(۴۴)

یہ تو فلک پہ تصرف ہوا حکمِ خدا
زمیں پہ رکنِ حرم نے انھیں سلام کیا
جو سنگ ریزوں نے ہاتھوں پہ پڑھ لیا کلمہ
تو حکم پا کے شجر چل کے آپ تک آیا
حکمِ حق تھے یہ سب منزلِ شہادت پر
یہ سب گواہ ہوئے آپ کی رسالت پر

(۴۵)

مگر جو طبعِ بشر میں ہے شر کا اک پہلو
اسی پہ چلتا ہے ابلیسیت کا بھی قابو
ہو جہل و کفر کی آغوش میں بھی جن کی نمو
نظر میں ان کی نہ کیوں معجزے بھی ہوں جادو
جو معجزہ کی حقیقت ہی کو نہ جانیں گے
وہ ان پہ حق کی گواہی کو خاک مانیں گے

(۴۶)

مگر جھکاؤ نہ تھا جن کا انتہا کی طرف
وہ ان گواہیوں سے آئے مصطفیٰ کی طرف
گواہیوں کی جو نسبت تھی کبریا کی طرف
نظر ہر ایک کی مڑنے لگی خدا کی طرف
نبی کی جلوہ نمائی کو بھی قبول کیا
اور اک خدا کی خدائی کو بھی قبول کیا

(۴۷)

ہٹا کے اس نے رہِ حق سے ایک ایک روڑا
سوئے خدا بشریت کا قافلہ موڑا
جب اس نے ذات و انا کے طلسم کو توڑا
خدا کے بندوں کا رشتہ خدا سے پھر جوڑا
بشر پہ اب جو عیاں اس کے رب کی شان ہوئی
خدا کے نام کا ڈنکا بجا ، اذان ہوئی

(۴۸)

خدا کی راہ پہ آنے لگے جو تھے گمراہ
غریبوں، فاقہ کشوں کو ملی نبیؐ کی پناہ
صنم پرست بھی ہونے لگے خدا پہ گواہ
تھا نغمہ کہ اشہد ان لا الہٰ الا اللہ
دیارِ کفر میں اب حق کے پھول کھلنے لگے
بتوں کے گھر سے خدا کو گواہ ملنے لگے

(۴۹)

چمن میں حق کے کھلے اب ہزار رنگ کے پھول
کسی میں بوئے تمنا کسی میں رنگِ قبول
کہیں جمی تھی، کہیں ڈھل چکی تھی وقت کی دھول
کہیں پہ سایۂ گل میں پنپ رہے تھے ببول
تھا اک مرقع میں سو سو اداؤں کا منظر
تھا اس چمن میں عجب دھوپ چھاؤں کا منظر

(۵۰)

رہی تو باغ میں تئیس سال تک یہ بہار
مگر خزاں کی توقع پہ چبھتے رہتے تھے خار
تھی نرم کرنے کو ان کے زبانِ حلم شعار
جہاں زبان نہ کام آ سکی وہاں تلوار
وہ تیغِ تیز جسے ذوالفقار کہتے ہیں
وہ جس کی دھار سے دھارے لہو کے بہتے ہیں

(۵۱)

کبھی احد میں یہ چمکی ، کبھی یہ خیبر میں
کبھی در آئی یہ مرحب کے خود و مغفر میں
کبھی حلول کیا نُطقِ کفر کے سر میں
کبھی لگا دیا قط جبرئیلؑ کے پر میں
ہر ایک ضرب کی شہرت علی العموم ہوئی
زمیں پہ تیغ چلی ، آسماں پہ دھوم ہوئی

(۵۲)

جب آئی فوج میں اڑتی ہوئی خبر کی طرح
شکار تاڑ لیئے صاحبِ نظر کی طرح
عدو کے فرق پہ کھینچا جو خط زبر کی طرح
در اس میں کھول دیا میکدہ کے در کی طرح
عدو کی قابلِ دید اب جو بدحواسی تھی
یہ اس پہ ٹوٹ پڑی خون کی جو پیاسی تھی

(۵۳)

یہ عرش پر ملک الموت کی بنائی ہوئی
ہے جوہروں کے جواہر سے یہ سجائی ہوئی
سند حدید کی قرآں سے ہاتھ آئی ہوئی
خدا کے شیر کے ہاتھوں کی آزمائی ہوئی
گواہ بن کے خدا کی فلک سے آئی ہے
ہر ایک جنگ اسی تیغ نے جتائی ہے

(۵۴)

ہے روزِ خلقتِ آدم سے جنگ یہ جاری
جو مسترد کیا شیطاں نے حکمِ سرکاری
مقدمہ کی اگرچہ بہت تھی تیاری
چلی نہ کچھ بھی مگر پیشِ حضرتِ باری
لعیں جو پہلی ہی پیشی میں جنگ ہار گیا
تو کفر و شر کی کچہری میں بار بار گیا

(۵۵)

یہ جنگ خلد سے تا نیل و طور و بدر و حنین
مقدمہ یہ خدا اور خلق کے مابین
ہے جس کی جائے عدالت یہ عرصۂ کونین
فریق اس میں ہیں سب سے اہم یزید و حسینؑ
جناں میں جس کی سماعت وہ ابتدا میں ہوئی
اسی کی آخری پیشی یہ کربلا میں ہوئی

(۵۶)

یزید روئے زمیں پر تھا نائبِ ابلیس
ہر ایک پیروِ ابلیسیت کا راس و رئیس
عدوئے دینِ خدا ، دشمنانِ حق کا جلیس
جو اس کا نام لیں تو حق کے دل میں اٹھے ٹیس
بتانِ کفر کی زلفیں سنوارنے والا
خدا کے حکم کو ٹھوکر پہ مارنے والا

(۵۷)

علیل فلسفہ و فکر ، ذہنیت بیمار
سیاست اس کی وہی اہلِ ظلم کا جو شعار
تھے اس کے دستِ سیاست میں دو ہی ہتھیار
تھا ایک کیسۂ زر ، ایک جبر کی تلوار
بکاؤ مال زر و نقد پر خرید کیا
نہ بک سکے جو انھیں ظلم سے شہید کیا

(۵۸)

حسینؑ منبر و محراب میں نبیؐ کے جلیس
حبیب حق کے حبیب ، اہلِ حق کے راس و رئیس
ملک بھی چوم لیں لوح جبیں میں وہ تقدیس
دلوں کو کھینچ لے جو ، شخصیت وہ مقناطیس
اٹھے جدھر نگہ لطف کہربا کی طرح
عدو کو کھینچ لے وہ حر سے باوفا کی طرح

(۵۹)

حسینؑ فاطمہؑ کا چاند ، نورِ چشم رسولؐ
یہ ساری زینتِ عالم ہے جس کے پاؤں کی دھول
خدا کی راہ میں عزت کی موت جس کا اصول
دیا رسولؐ نے سجدے کو جس کی خاطر طول
جب اس نے سجدۂ آخر کو خود جھکایا سر
تو پھر نہ سجدۂ معبود سے اٹھایا سر

(۶۰)

حسینؑ شاہدِ عادل تھے ذاتِ خالق پر
یزید منکرِ شانِ خدا تھا سر تا سر
فسانہ اس کے لیئے تھی حقیقتِ داور
تھا زعم اس کو فقط اقتدارِ دنیا پر
ہمیشہ نشۂ طاقت میں چور رہتا تھا
خدا کے دین کو دنیا کا ڈھونگ کہتا تھا

(۶۱)

جو موج مئے سے اٹھا اس کی فکر کا دھارا
خدا کے سامنے خم ٹھونک کے وہ للکارا
تھا بس کے وقت میں اسلام اتنا بے چارا
کسی نے سامنے ظالم کے دم نہیں مارا
تھا کون سانپ کے پھن پر جو ہاتھ رکھ دیتا
سر اپنا خنجرِ قاتل کے ساتھ رکھ دیتا

(۶۲)

بس اک حسینؑ تھے خالق کی عظمتوں کے گواہ
امینِ وحئ خدا کی صداقتوں کے گواہ
کل انبیائے سلف کی شہادتوں کے گواہ
زمین پر ان کی خدائی نیابتوں کے گواہ
جو اس مقدمہ میں حق نے ان سے چاہی تھی
خدا کے حق میں وہ سب سے بڑی گواہی تھی

(۶۳)

مقابلہ پہ خدا کے اب آ گیا جو یزید
کیا غرورِ حکومت میں اس نے بے تمہید
خدا کی ذات کا انکار ، دین کی تردید
تو اب حسینؑ خدا پر ہوئے گواہ و شہید
سر اپنا دے کے ضمیرِ بشر جھنجھوڑ دیا
انا کا زعم ، شہی کا غرور توڑ دیا

(۶۴)

حسینؑ مصلحتِ وقت کے تقاضے سے
مدینہ چھوڑ کے مکے میں آئے حج کے لیئے
یہاں کرائے کے قاتل یزید نے بھیجے
کہ بس حسینؑ کو چپکے سے قتل کروا دے
وہ چھپنا چاہتا تھا پردۂ سیاست میں
یہ کھینچ لائے اسے اک کھلی عدالت میں

(۶۵)

یہ وہ عدالتِ عالی تھی بینِ ارض و سما
تھا منصفوں میں جہاں وقت کا بس اک لمحا
مقدمہ جو سرِ کربلا یہ پیش ہوا
تھا اک فریق یزید اور اک فریق خدا
حسینؑ مدعی منجابِ اللہ ہوئے
بہتّر اہلِ شرف آپ کے گواہ ہوئے

(۶۶)

وہ جن کے نام تھے فہرست میں گواہوں کی
حق آشنا و صداقت شعار تھے وہ بھی
بلند شک سے تھی ان کی بلند کرداری
ہر ایک آئینۂ اعتبارِ سبطِ نبیؑ
وہ حق شناس کہ قانون احترام کرے
وہ عدل خو کہ عدالت انھیں سلام کرے

(۶۷)

تھے ان میں سترہ خود گلشنِ نبیؐ کے گلاب
تھے ان کے ساتھ رسولِؐ خدا کے آٹھ اصحاب
علاوہ ان کے تھے اکیس تابعین ، جناب
تو حافظانِ کتابِ خدا تھے چھ احباب
تھے راویانِ حدیث ان میں نو مجاہد بھی
تھے دس وہ ، اشجع عالم بھی تھے جو زاہد بھی

(۶۸)

اِدھر یہ منتخب روزگار ، اہلِ شرف
اُدھر یزید کے ہمراہ اہلِ ساغر و دف
وہ ننگِ آدم و عالم ، یہ افتخار سلف
وہ سب یزید کے حامی ، یہ سب خدا کی طرف
یہ وہ کہ عدلِ شہادت پہ انحصار کرے
وہ وہ کہ کوئی بھی منصف نہ اعتبار کرے

(۶۹)

ہر ایک قطرۂ خوں ہو جہاں پہ حق کا گواہ
جہاں پہ بہرِ تقیہ بھی خامشی ہو گناہ
اُدھر ہو قتل پہ مائل فریقِ کفر پناہ
اِدھر زباں پہ رہے لا الٰہ الا اللہ
نہیں یہ عام گواہی ، یہ حق پہ حجت ہے
صحیح معنوں میں یہ منزلِ شہادت ہے

(۷۰)

کیا حسینؑ نے پیش اب جو سب سے پہلا گواہ
تو اکبرؑ اٹھے بحکمِ امامِ صدق پناہ
اذانِ صبح جو گونجی فضا میں اب ناگاہ
ہوا غل اشہد ان لا الٰہ الا اللہ
ہر ایک ذرے نے اللہ پہ گواہی دی
اذاں نے حر کو بھی توفیقِ حق نگاہی دی

(۷۱)

یہیں سے ہونے لگے منحرف اُدھر کے گواہ
حر اس کا بھائی غلام اور ایک نورِ نگاہ
علاوہ ان کے تھے بکر ابن حیؔ حق آگاہ
حلاس ازدی و نعمان ازدی ذی جاہ
اُدھر سے سولہ چلے حق سے متصف ہو کر
اِدھر سے ایک بھی نکلا نہ منحرف ہو کر

(۷۲)

حسین لائے بس اب تو گواہ ایک سے ایک
حق آشنا و حقیقت نگاہ ایک سے ایک
عدوئے کذب ، صداقت پناہ ایک سے ایک
وہ آئے ایک کے بعد ایک ، واہ ایک سے ایک
سبھی نے دی یہ صدا لا الٰہ الا اللہ
خود اپنے خوں سے لکھا لا الٰہ الا اللہ

(۷۳)

ہوئے وجودِ خدا پر جو حر گواہ و شہید
حبیب لکھ گئے مقتل میں کلمۂ توحید
زہیر قین نے کی خوں سے دین کی تجدید
سبھی یزید کے دعوے کی کر گئے تردید
یہ سب عدالتِ انسانیت میں آئے ہوئے
ڈٹے رہے سرِ موقف قدم جمائے ہوئے

(۷۴)

شہادتوں کے اسی سلسلے میں آ پہنچا
نمازِ ظہر کا ہنگام درمیانِ وغا
ابوثمامہؓ نے کی عرض پیشِ شاہِ ہدا
یہ آخری ہے نماز اپنی یا شہِ والا
ہم اور کچھ رہِ خالق میں تیز بڑھ کے چلیں
سوئے بہشتِ بریں ہم نماز پڑھ کے چلیں

(۷۵)

طلب کیا جو عدو سے نماز کا وقفہ
دریدہ دہنوں نے مولا کو وہ جواب دیا
کہ حق کے شیروں نے دشمن پہ کر دیا حملا
ابوثمامہ اسی میں ہوئے شہیدِ جفا
جہاں میں آرزوئے ناتمام چھوڑ گئے
مگر نمازگزاروں میں نام چھوڑ گئے

(۷۶)

یہی تھا جنگ میں صفین کی علیؑ کا عمل
برستے تیروں میں بھی کی نماز ادا اول
کہا کسی نے جو اس وقت اس کا کیا ہے محل
کہا اسی کے لیئے تو ہے سب یہ جنگ و جدل
انھیں خدا کو چھپانے کا کام کرنا ہے
ہمیں خدا کی خدائی کو عام کرنا ہے

(۷۷)

اب اس کے بعد ادا یوں نمازِ ظہر ہوئی
برستے تیروں میں سب نے نمازِ خوف پڑھی
زہیر ہو گئے جس میں فدائے سبطِ نبی
زمانہ ہوگیا مجبور سوچنے پہ یہی
یہ کس کے حکم سے سوئے قضا یہ بڑھتے ہیں
خدا نہیں ہے تو کس کی نماز پڑھتے ہیں

(۷۸)

شہید ہو چکے حق پر جو دوست اور انصار
تو آئے بہرِ شہادت رسول کے دلدار
کوئی شبیہِ پیمبرؐ ، کوئی علیؑ آثار
کوئی حسنؑ کا مرقع ، کوئی حسینؑ شعار
مخالف ان کے بھلا کیا گواہ لائیں گے
اب اور ان سے بھی صادق کہاں سے آئیں گے

(۷۹)

یہ صادق اب جو شہادت کے واسطے نکلے
ملوکیت کے در و بام بھی لرزنے لگے
مگر جو اہلِ حرم پر گزر گئی اس سے
وہ کیا قیامت کبریٰ تھی ، اس کو کیا کہیئے
نصیب ایسا اب ایک ایک کا بگڑنے لگا
کسی کی گود ، کسی کا سہاگ اجڑنے لگا

(۸۰)

پڑی جو زینبِ ناشاد پر یہ اب افتاد
تو آئے عون و محمدؐ برائے اذنِ جہاد
اٹھا خیام میں اک شورِ نالہ و فریاد
مگر تھا زینبِ مضطر کا صبر قابلِ داد
سنا کے حکمِ شہادت خود اپنے شیروں کو
جبینیں چوم کے رخصت کیا دلیروں کو

(۸۱)

پھر ان کے بعد جو قاسم کی آئی باری
یہ کر رہے تھے سحر ہی سے اس کی تیاری
تھا ان کو شوقِ شہادت میں ہر نفس بھاری
ملا جو اذن ، کیا شکرِ حضرت باری
حسن کے شیر تھے ، اس بن میں بھی جیالے تھے
قضا کو شہد سے شیریں سمجھنے والے تھے

(۸۲)

ہوئے جو گھر سے یہ رخصت برائے دشتِ قتال
کسی کا ذکر تو کیا ، تھا یہ خود حسین کا حال
لپٹ کے ان سے جو اب روئے شاہِ صبر خصال
وفورِ غم سے ہوئی ماں کی زندگی ہی محال
یہ آئے پیشِ عدو جو اڑا کے مرکب کو
وہ حُسن تھا کہ خدا یاد آ گیا سب کو

(۸۳)

یہ حُسن بھی گواہی تھا ان کی خالق پر
اس آئینہ میں نظر آ رہا تھا آئینہ گر
اب اس کے بعد یہ بن نور یہ تیغ کے جوہر
عدو کو آئی نظر قدرتِ خدا یکسر
خدا پہ ہو کے فدا پھر تو دشتِ غربت میں
نمایاں ہو گئے یہ منزلِ شہادت میں

(۸۴)

اب آئے حضرت عباسؑ شیرِ ضیغمِ حق
وہ بن کے رعب سے دل شامیوں کے ہو گئے شق
جبینِ عارض ان کے جو اک مصحفِ وفا کے ورق
فراتِ عشق کو آبِ بقا جبیں کا عرق
مشاہدہ جو کرایا خدا کی قدرت کا
لبِ فرات پہ کلمہ لکھا شہادت کا

(۸۵)

شہادتیں یہ مکمل ہوئیں تو اب شبیرؑ
گواہ لائے وہ منجانب خدائے قدیر
جو پھول پان سا بچہ مگر علیؑ کی نظیر
کچل دے وزنِ شہادت سے جو بشر کا ضمیر
یہ چھ مہینے کے بچے کی وہ شہادت ہے
جو منکرانِ خدا پر خدا کی حجت ہے

(۸۶)

زمانہ سوچ رہا تھا یہ دم بخود ہو کر
یہ قتل گاہ، یہ ظالم یزید کا لشکر
یہ چھ مہینے کا بچہ پدر کے ہاتھوں پر
کہ جیسے شاخ پہ مرجھا گیا ہو غنچۂ تر
عدو نے چلّے کمانوں میں کیوں چڑھائے ہیں
حسینؑ کیوں اسے مقتل میں لے کے آئے ہیں

(۸۷)

ابھی اٹھائے تھے خود بھانجوں کے دو لاشے
ابھی تو قاسمِ مضطر کے جسم کے ٹکڑے
وغا کے دشت میں بکھرے ہوئے سمیٹے تھے
ابھی تو کھینچی تھی برچھی جواں کے سینے سے
ابھی تو نورِ نگاہوں کا کھو چکے ہیں حسینؑ
ابھی تو بھائی کے لاشے پہ رو چکے ہیں حسینؑ

(۸۸)

کہاں عدو وہ ہزاروں، کہاں یہ چند نفر
مگر حسینؑ کا اس پر یہ حوصلہ، یہ جگر
بلا سبب تو لٹاتا نہیں ہے یوں کوئی گھر
کوئی تو مقصدِ اعلیٰ ہے ان کے پیشِ نظر
نہیں حکومتِ دنیا پہ کچھ نظر ان کی
وگرنہ فوج تو ہوتی نہ مختصر ان کی

(۸۹)

اگر حکومتِ دنیا کی کچھ نہیں ہے طلب
تو پھر یہ غیر مساوی وغا کا کیا مطلب
ہزارہا سے بہتّر کی جنگ ہے یہ عجب
یہ کیسے کہیئے کہ اس کا نہیں ہے کوئی سبب
یہ کس کے نام پہ گھر کو لٹا رہے ہیں حسینؑ
یہ سب لٹا کے بھلا کیا بچا رہے ہیں حسینؑ

(۹۰)

برائے جنگ یہ اتنی سی فوج لاتا کیا
خوشی سے دل پہ بہتّر کے داغ اٹھاتا کیا
مصلّیٰ خون کی موجوں پہ یہ بچھاتا کیا
برستے تیروں میں سجدے میں سر جھکاتا کیا
یہ عین جنگ میں سجدہ گزاریاں کس کی
وہ کون ہے کہ عبادت ہو اس طرح جس کی

(۹۱)

حرم کو جنگ کی ہلچل میں لے کے آئے کیوں
حیات موت کے جنگل میں لے کے آئے کیوں
یہ اس صغیر کو مقتل میں لے کے آئے کیوں
یہ پھول خون کی دلدل میں لے کے آئے کیوں
سوال تھا بشریت کا یہ برائے حسینؑ
اسی سوال کا لے کر جواب آئے حسینؑ

(۹۲)

سنو، یزید نے برپا کیا ہے دیں میں فساد
کتاب و سنت و مذہب کو کر دیا برباد
ہے خلد و نار کا منکر وہ ثانیٔ شداد
مقابل آیا ہے اللہ کے وہ کفر نہاد
ہے نشہ اتنا اسے اقتدار و طاقت کا
ہوا ہے طالب اولی الامر سے بھی بیعت کا

(۹۳)

رسول ہو کہ اولی الامر از رہِ قرآں
ہے واجب ان کی اطاعت کرے ہر اک انساں
جو ان سے طالبِ بیعت ہو کوئی کفرنشاں
ہو چاہے فاسق و فاجر کہ نیک وہ ناداں
وہ گویا طالبِ بیعت خدا سے ہوتا ہے
نبرد آزما وہ کبریا سے ہوتا ہے

(۹۴)

اگر رسولؐ سے کرتا مطالبہ وہ یہی
تو کیا حضورؐ سے ممکن تھی بیعت اس کی کبھی
بہ جبر کرتا جو اصرار اس طرح سے شقی
تو آتے اس کے مقابل یونہی خدا کے نبیؐ
اگرچہ راہِ شہادت میں سب کے سر جاتے
خدا کے حق کو وہ ثابت جہاں پہ کر جاتے

(۹۵)

رسولؐ غیرِ خدا کی بھلا کریں بیعت
مطیع ہو نہیں سکتے کسی کے بھی حضرت
کسے مجال کہ ان پہ وہ کر سکے سبقت
اسی طرح ہے اولی الامر کی بھی حیثیت
نہ اہلِ زر سے، نہ اہلِ شرف سے ہوتے ہیں
یہ دونوں عہدے خدا کی طرف سے ہوتے ہیں

(۹۶)

جہاں میں اب جو نہیں ہیں رسولِ ہر دوسرا
تو اب یہ فرض خدا کی طرف سے ہے میرا
ہے کائنات پہ جو اقتدار خالقؔ کا
شہادت اس کی بھی دوں پیشِ اہلِ ظلم و جفا
اگرچہ دستِ ستم سے اماں نہیں مجھ کو
خیالِ سود و زیاں کچھ یہاں نہیں مجھ کو

(۹۷)

نہ آرزوئے حکومت مجھے، نہ خواہشِ زر
جبھی تو ساتھ نہیں ہے مرے کوئی لشکر
یہ میرے اقرباؑ، یہ میرے دوست اور یاور
یہ سب شہید ہیں، یہ سب گواہ ہیں حق پر
یہ ملک و مال کی خاطر تو رن میں آئے نہیں
سر اپنے کردیئے حق پر فدا، جھکائے نہیں

(۹۸)

کریں جو میرے بہتّر سپاہیوں پہ نظر
نہیں ہیں جنگ کے قابل ہی ان میں سے اکثر
ہیں کچھ وہ جن کی ضعیفی سے جھک گئی ہے کمر
کچھ ان میں بچے ہیں حتیٰ کہ شیرخوار اصغر
وہ ٹھیک ہے جو قلم بھی پکڑ نہیں سکتے
وہ ملک و مال کی خاطر تو لڑ نہیں سکتے

(۹۹)

ان اہلِ حق میں مگر زر خرید کوئی نہیں
جہاں میں ان سے زیادہ سعید کوئی نہیں
مقامِ عدل میں ایسے شہید کوئی نہیں
یہی تھے دہر میں بس اب مزید کوئی نہیں
شہید حق پہ ہوئے یہ جو اپنی مرضی سے
لکھا بیان شہادت لہو کی سرخی سے

(۱۰۰)

ابھی تو محو اسی سوچ میں تھا ذہنِ بشر
کہ اک قیامتِ کبریٰ بپا ہوئی وہ ادھر
وہ حرملہ نے کیا تیر اک کمان سے سر
وہ زد پہ تیر کی نازک سی گردنِ اصغر
اِدھر تو پھول سی گردن پہ پڑ گیا ناوک
اُدھر وہ ماں کے کلیجے میں گڑ گیا ناوک

(۱۰۱)

غریب باپ کو دم بھر کو ہو گیا سکتا
مگر ثباتِ قدم میں نہ کوئی فرق آیا
لہو صغیر کا شہ نے جو اپنے منھ پہ ملا
زمیں لرزنے لگی ، آسمان تھرایا
ستم یہ وہ تھا کہ جس پر قضا بھی کانپ اٹھے
وہ ظلم تھا کہ خود اہلِ جفا بھی کانپ اٹھے

(۱۰۲)

بلند ہاتھوں پہ بچہ کو کرکے شہ نے کہا
ضمیر آدمیت منصفی کو آئے ذرا
یہ شیر خوار ہے ، چھ ماہ کا مرا بچا
وجودِ حق پہ ہے سب سے بڑا گواہ مرا
خدا کے حق میں شہادت یہ اس سپاہی کی
وقار عدل کا ہے ، آبرو گواہی کی

(۱۰۳)

حسینؑ لے کے تو اصغر کو آئے مقتل سے
یہ حال بچے کا ماں کو مگر دکھا نہ سکے
بنا کے چھوٹی سی اک قبر بے زباں کے لیے
وہ لاش دفن کی اور قبر سے یہ کہہ کے اٹھے
غضب ہے تجھ میں کلیجہ نکال کر رکھنا
ربابؑ کی یہ امانت سنبھال کر رکھنا

(۱۰۴)

حسینؑ اٹھے جو اب ہاتھ جھاڑ کر اپنے
تو آکے خیمے میں رخصت طلب ہوئے سب سے
چلا جو والی و وارث بھی اپنی جاں دینے
غمِ فراق سے اہلِ حرم تڑپنے لگے
نکل کے خیمہ سے دشتِ وغا میں آئے حسینؑ
حرم تڑپتے رہے کہہ کے ہائے ہائے حسینؑ

(۱۰۵)

تھا اب جو وقت یہ حجت تمام کرنے کا
پہنچ کے رن میں دیا شہ نے آخری خطبہ
پھر اس کے بعد جو لشکر پہ اب کیا حملہ
دہائی دینے لگے شہ کی دشمنانِ خدا
تھا جنگِ شاہ سے ایک حشر فوجِ اعدا میں
کہا ملک نے کچھ ایسے میں گوشِ مولا میں

(۱۰۶)

بس اب شہادتِ کبریٰ کا وقت آ پہنچا
حسینؑ جھک گئے لبیک کہہ کے پیشِ خدا
جو ذوالفقار کو مولا نے اب نیام کیا
تو چار سمت سے گھر گھر کے آ گئے اعدا
ہر اک طرف سے قیامت کے وار چلنے لگے
دہانِ زخمِ بدن سب لہو اگلنے لگے

(۱۰۷)

ادھر حسینؑ، اُدھر وہ ہزارہا خوں خوار
ادھر یہ ایک اُدھر کم سے کم وہ بیس ہزار
کوئی چلاتا ہے تیر و تبر، کوئی تلوار
جراحتوں کی کوئی حد نہ ضربتوں کا شمار
ہیں وار اتنے کہ پہلو بدل نہیں سکتے
حسینؑ زین پہ بس اب سنبھل نہیں سکتے

(۱۰۸)

بس اک نشیب تک آئے جو اب شہؑ ذی جاہ
ہوئے نماز پہ آمادہ بہرِ شکرِ الٰہ
تمام خلقتِ عالم کو کرکے شہؑ نے گواہ
کہا کہ اشہد ان لا الٰہ الا اللہ
سنی جہاں نے شہِ مشرقین کی آواز
فضا میں گونج رہی تھی حسینؑ کی آواز

(۱۰۹)

اِدھر تھے سجدۂ خالق میں شاہِ ہر دوسرا
اُدھر وہ شمر جفاکار پشت پہ آیا
لبوں پہ شہؑ کے تھا سبحان ربی الاعلیٰ
گلے پہ خنجر قاتل ، زباں پہ حمدِ خدا
تھے زیرِ تیغ جو اللہ پہ گواہ حسینؑ
جہانِ عدل میں اک دھوم تھی کہ واہ حسینؑ

(۱۱۰)

اِدھر جو فتح کا فوجِ لعیں میں طبل بجا
اُدھر وہ زینبِ مظلوم تک گئی یہ صدا
دلِ ملول پہ غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا
چلیں تڑپ کے وہ خیمے سے سوئے دشتِ وغا
ستم وہ دیکھا شہِ انس و جاں پہ زینبؑ نے
سر اپنے بھائی کا دیکھا سناں پہ زینبؑ نے

(۱۱۱)

گئیں جو لاش پہ بھائی کی دل سنبھال کے اب
عجیب جرأت و ہمت دکھا گئیں زینبؑ
خدا سے عرض کی لاشے پہ رکھ کے دستِ ادب
ہمارا ہدیۂ آخر قبول کر یا رب
جو روحِ عدل نے تیری طرف سے چاہی ہے
یہ تیرے حق میں وہ سب سے بڑی گواہی ہے

(۱۱۲)

اگرچہ لٹ گیا اس راہ میں ہمارا گھر
شہید ہوگئے عباسؑ و قاسمؑ مضطر
یہ میرا بھائی ، وہ عونؑ و محمدؑ و اصغرؑ
مگر ہے شکر کی جا تیری فتح اے داور
جہاں سے تاج و حکومت کا اعتبار گیا
یہ تیری فتح ہوئی اور یزید ہار گیا

مرثیہ

فیصلہ

تعدادِ بند......۱۲۰

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فیصلہ

(۱)

خدا کی حمد میں کھلتی ہے جب زبانِ قلم
صریر گونجتی ہے صورتِ اذانِ قلم
بلند ہوتی ہے ظاہر میں اس سے شانِ قلم
مگر یہ اصل میں ہوتا ہے امتحانِ قلم
ہے کامیاب کہ ناکام ہے لکھا اس کا
نگاہ والے ہی کرتے ہیں فیصلا اس کا

(۲)

یہ بزمِ اہلِ نظر اک کھلی عدالت ہے
بڑی بلند یہاں منزلِ سماعت ہے
نہ مدعی سے تعصب، نہ رو رعایت ہے
جو سچ کہو تو یہی عدل کی ضرورت ہے
وکیل کر کے یہاں آبرو کو کھونا ہے
اصالتاً ہی سخن ور کو پیش ہونا ہے

(۳)

یہ ہیں وہ منصف و کرسی نشینِ عدل و حکم
ہو کامیاب جو ان کے حضور سعیٔ قلم
ہزار کوئی اپیلیں کرے تو اب کیا غم
وہی ہے فیصلہ حتمی ۔ یہاں ہوا جو رقم
اصولِ عدل پہ مبنی جو ہے کہا ان کا
مٹائے مٹ نہیں سکتا ہے فیصلا ان کا

(۴)

اگر ہو متفقہ فیصلہ تو کیا کہنا
جو ہو وہ کثرت آراً سے تو بھی ہے اچھا
یہ لازمی تو نہیں ۔ جب ہو فیصلہ دینا
ہر ایک رکنِ عدالت ہو ایک رائے کا
جو منصفین میں سے کوئی اختلاف کرے
وہ اپنی رائے الگ لکھ کے بات صاف کرے

(۵)

تنازعات جو ہیں اس معاشرہ کا شعار
ہر اک نزاع میں ہوتا ہے فیصلہ درکار
صحیح فیصلہ کرنا ہے عدل کا معیار
عدالتیں ہی تو انصاف کی ہیں ذمہ دار
جو عدل کر نہ سکے ۔ اس کا ذمہ دار نہیں
کہ عدل و داد عبادت ہے ۔ کاروبار نہیں

(۶)

تقاضہ بس ہے یہی منصبِ عدالت کا
ہوں بس حقائق و قانون فیصلہ کی بنا
نہ جبر ہو اثر انداز اور نہ حرص و ہوا
سمجھتے بوجھتے لکھیں نہ فیصلہ الٹا
سوا خدا کے انھیں ماسوا کا خوف نہ ہو
جزا کی فکر نہ ہو اور سزا کا خوف نہ ہو

(۷)

جہاں ہو رسمِ ستم روز اک نئی ایجاد
جہاں پہ سی دیئے جاتے ہوں لب دمِ فریاد
قفس بدست ہوں بلبل کی گھات میں صیاد
گلوئے عدل پہ چلتا ہو خنجرِ بیداد
وہاں پہ کس سے بھلا داد عدل کی چاہیں
کسے وکیل کریں، کس سے منصفی چاہیں
(تضمین)

(۸)

جہاں گواہ ہوں کذاب و پیشہ ور اکثر
وہاں پہ کیسے شجر عدل کا ہو بارآور
جو سچ کے حلق پہ چل جائے جھوٹ کا خنجر
تو کیوں نہ دامنِ انصاف پھر ہو خون سے تر
اب اس فضا میں، جو خود عدل کی مخالف ہے
کرے نہ خون جو انصاف کا، وہ منصف ہے

(۹)

جو فیصلہ ہو غلط نیک نیتی سے کبھی
اگرچہ گھٹتا ہے انصاف کا گلا یوں بھی
ہے منصف اس میں مگر جرم کی سزا سے بری
بجاً ہے ° انما الاعمال بالنیات ° اس کی
جو فیصلہ یوں کوئی عدل کے خلاف کرے
قصوروار ہے ، لیکن خدا معاف کرے

(۱۰)

اصولِ عدل سے حاکم اگر ہو خود جاہل
نہیں وہ منصبِ انصاف و عدل کے قابل
ہر آن جہل ہو اس کا جو عدل میں حائل
گھڑی گھڑی کوئی اور اس کی حل کرے مشکل
اگرچہ خوفِ ہلاکت اسے ستاتا ہے
مگر وہ پھر بھی غلط فیصلے سناتا ہے

(۱۱)

اگرچہ ہو کوئی ظالم قضا کی مسند پہ
اسے بھی کہتا ہے عادل ہر ایک طالبِ زر
یہی تو ہوتا ہے ہر حاشیہ نشیں کا ہنر
جفا کو عدل کہے ، زہر کو نبات و شکر
جہاں یہ زرطلبی کا جنون ہوتا ہے
وہاں پہ عدل کا سو بار خون ہوتا ہے

(۱۲)

ملوکیت کا جنھیں نشہ ہو ، وہ ظلم سیرؔ
یزید سیرت و فرعون خو ، جفاپرور
جنھیں نہ خوفِ خدا ہو ، نہ احتساب کا ڈر
بزورِ تیغ سناتے ہیں فیصلے اکثر
نظامِ عدل پہ یوں ظلم فتح پاتا ہے
تو وقت اپنا الگ فیصلہ سناتا ہے

(۱۳)

وہ اہلِ عدل کہ جن کا ضمیر ہو بیدار
جو کھینچتے نہ ہوں خود روحِ عدل کو سرِ دار
اگر وہ ہوتے ہیں جبرِ ملوکیت کا شکار
سروں پہ ان کے کھنچی ہو جو ظلم کی تلوار
وہ آپ چنتے ہیں میدانِ ابتلا اپنا
خود اپنے خون سے لکھتے ہیں فیصلا اپنا

(۱۴)

مگر لگے گی عدالت جو ایک روزِ حساب
وکیل ہوں گے نہ قانون و قاعدہ کی کتاب
ہر اک دے گا خود اپنے معاملوں کا جواب
کسی کو ہوگی وہاں جھوٹ بولنے کی نہ تاب
نہ ہوگی بحث بھی قانون کے دقائق پہ
سنایا جائے گا ہر فیصلہ حقائق پہ

(۱۵)

مری نظر میں ہے مشہور قولِ پیغمبرؐ
کہ سب سے اچھے علیؑ ہیں قضا کی مسند پہ
وہ عدل کرنے میں تم سب سے ہیں بہت بہتر
یہ قولِ مخبرِ صادقؐ رہے جو پیشِ نظر
سبھی کہیں گے عدالت کے واقعے سن کے
گواہ صدقِ نبیؐ پر ہیں فیصلے ان کے

(۱۶)

کلیمِ طورِ سلونی نے خود یہ فرمایا
مقدمہ ہو یہودی کا یا مسلماں کا
زبور سے ہو کہ انجیل سے کوئی دعوا
اسی کے مصحفِ ایماں سے فیصلہ دوں گا
علیؑ کے سر پہ عدالت کا تاج ہے کہ نہیں
یہ ادعا بھی سلونی مزاج ہے کہ نہیں

(۱۷)

مقدمات جو ہر ہر طرح کے پیش ہوئے
علی نے فیصلے ان سب کے اس طرح سے کیئے
کہ ان سے دونوں فریقِ مقدمہ خوش تھے
کسی کو کوئی شکایت ہوئی نہ منصف سے
مقدمہ جو عدالت میں ان کی ہار گیا
تو وہ بھی ان سے خوش اور خود سے شرمسار گیا

(۱۸)

تھی فیصلوں میں جو عدلِ خدا کی تابانی
کبھی تو ہوتے تھے ظاہر رموزِ ربانی
کبھی تھی ان کی بناٗ نفسیاتِ انسانی
کبھی تھی علمِ حسابی کی جلوہ سامانی
نئے اصول سے اکثر شہادتیں لے کر
علومِ نو کیئے ایجاد فیصلے دے کر

(۱۹)

جو ایک بچہ کی دو عورتیں ہوں دعویدار
کہ زر کے حصہ کا تعدادِ نان پہ ہو مدار
نزاع سترہ اونٹوں کی پیٹھ پہ ہو بار
کہ جرمِ قتل کے الزام سے کوئی ہو دوچار
علی کے فیصلے جو چشمِ دل میں تل جائیں
تو اہلِ عدل کی آنکھیں بھی ان سے کھل جائیں

(۲۰)

کیئے اصول عدالت کے جو علی* نے رقم
وہی ہیں آج بھی معیارِ عدل، حق کی قسم
مقر ہے اس کا، سر ان کے حضور کر کے خم
ممالکِ متحدہ کا منصفِ اعظم
نظر میں اس کی عجب ان کی قدر و قیمت ہے
کہ ان سے حجرۂ منصف کی زیب و زینت ہے

* اس حوالے سے فٹ نوٹ مضمون کے آخر میں ملاحظہ فرمائیے۔

(۲۱)

عدالتیں ہیں کئی طرح کی یہاں ، جن سے
رجوع کرتے ہیں ہم آپ فیصلوں کے لیئے
کبھی نصیب ، کبھی دل نے فیصلے ہیں دیئے
مگر ہے فیصلہ بس وہ درست ، عقل جو دے
ضمیر سب سے سوا صاحبِ بصیرت ہے
خدا کے بعد یہ سب سے بڑی عدالت ہے

(۲۲)

اسی عدالتِ عالی میں تھا شبِ عاشور
حر اک اسیرِ گنہ ، مجرمِ شۂِ جمہور
اک اضطراب کا تھا شام ہی سے اس پہ وفور
نبردآزما تھے دل سے اس کے عقل و شعور
تھا دل جو عقل سے نالاں ، وہ اس سے بدظن تھی
وہ کس کی بات سنے حر کو سخت الجھن تھی

(۲۳)

اسی دن آیا تھا لے کر پیامِ ابنِ زیاد
برائے جنگ و جدل شمرِ ظالم و جلاد
وہ جس کو پڑھ کے عمر ابن سعدِ نحس نہاد
تھا مائل اس پہ کہ ہو اب حسینؑ پہ بیداد
یقیں ہوا وہ ستم سے جہاں کو بھر دے گا
حسینؑ کو عمر سعد قتل کر دے گا

(۲۴)

اگرچہ لایا تھا حرؑ گھیر کر خود ان کو یہاں
اسی نے روکی تھی راہِ شہؑ زمین و زماں
مگر اسے نہ تھا اس بات کا ذرا بھی گماں
کہ ان کے قتل کے درپے ہیں دشمنِ ایماں
یقیں تھا اس کو، اگرچہ تھا حسنِ ظن کی طرح
کہ صلح ان سے بھی ہو جائے گی حسنؑ کی طرح

(۲۵)

یہ سوچ کے ہوتی تھی عقل اس کی دنگ
بھلا کریں گے مسلماں نبیؐ کے لعل سے جنگ
یہ سنگدل شہِ مظلوم پر اٹھائیں گے سنگ
چلائے گا کوئی ان پر سنان و تیغ و خدنگ
رسولِ حق کو رسالت کا یہ ثمر دیں گے
نبیؐ کی جاں کو مسلمان قتل کر دیں گے

(۲۶)

ہوا تھا اب جو یہ سامانِ قتلِ شاہِ امم
جتا رہی تھی یہ رہ رہ کے عقل اسے پیہم
ترے سبب سے ہوئے شاہِ دیں اسیرِ الم
تو ہی تو ہے سببِ قتلِ سیدِ عالم
چلے گا ظلم کا خنجر جو شہؑ کی گردن پر
پڑیں گے خون کے چھینٹے ترے ہی دامن پر

(۲۷)

تھا اس خیال سے حر کو وہ صدمۂ جانکاہ
کبھی پٹکتا تھا سر اپنا ، گاہ کرتا تھا آہ
تھا ایک ساتھ جو احساسِ جرم و ظلم و گناہ
وہ کرب اور وہ تڑپ تھی کہ اے معاذاللہ
کہ جیسے قلب پہ چھریاں چلا رہا ہو کوئی
کشاں کشاں سرِ دار اس کو لا رہا ہو کوئی

(۲۸)

ہزار چاہتا تھا پائے خود پہ وہ قابو
کسی طرح بھی نہ ہوتے تھے ذہن و دل یکسو
تڑپ تڑپ کے بدلتا تھا اس طرح پہلو
کہ جیسے دام میں صیاد کے کوئی آہو
اس اضطراب نے سب کچھ شتاب چھین لیا
جو دل سے چین تو آنکھوں سے خواب چھین لیا

(۲۹)

یہ حال دیکھ کے اس کو صلاح عقل نے دی
کہ ہاتھ باندھ کے حاضر ہو پیشِ سبطِ نبی
حسین کر دیں معاف اب بھی گر خطا تیری
تو ان کے قدموں پہ کر دے نثار جاں اپنی
تو کیمیا ہو جو اس در کی خاک ہو جائے
خود اپنے خوں سے نہائے تو پاک ہو جائے

(۳۰)

بس اب امام کی خدمت میں ہاتھ جوڑ کے جا
یزیدِ نحس سے رشتہ وفا کا توڑ کے جا
رخ اپنا منصب و جاہ و حشم سے موڑ کے جا
یہ افسری، یہ تزک سب ہمیں پہ چھوڑ کے جا
یہاں پہ چند ٹکے کی یہ نوکری کیا ہے
ملے جو ان کی غلامی تو افسری کیا ہے

(۳۱)

مگر جو دل سگِ دنیا تھا، حق سے بیگانہ
نظر تھی اس کی زر و مال پر حریصانہ
زر و گہر جو تھے اس مرغِ حرص کا دانہ
مقابل آ ہی گیا عقل کے وہ دیوانہ
توجہ عقل کی جانب سے موڑ کر حر کی
بجھا دی زر کی چکاچوند سے نظر حر کی

(۳۲)

کہا یہ دل نے کہ اے حر، فریبِ عقل نہ کھا
یہ تیری دشمنِ جاں ہے، نہ اس کے پھیر میں آ
یہ ٹھاٹ چھوڑ کے اک بے نوا کے پاس نہ جا
یزید تجھ سے ہوا خوش تو گھر وہ بھر دے گا
اُدھر حشم ہے، خدم ہے، کہ مال و زر، کیا ہے؟
اِدھر ہے عیش بھری زندگی، اُدھر کیا ہے؟

(۳۳)

تھا عقل و دل میں جو اک معرکہ سا یہ برپا
تھا دو محاذوں پہ مصروف جنگ حر گویا
سنے وہ دل کی کہ مانے وہ عقل کا کہنا
تھا اس کے واسطے مشکل جو فیصلہ کرنا
وہ اب ضمیر کو منصف بنائے بیٹھا تھا
حر آپ اپنی عدالت لگائے بیٹھا تھا

(۳۴)

نہ تھا جو کوئی بھی منصف ضمیر سے بہتر
اسی سے حر نے کہا، تو ہی اب یہ فیصلہ کر
ضمیر آیا جو اب کرسیٔ عدالت پر
رہا پھر اب تو سماعت کا سلسلہ شب بھر
ضمیر کی تھی عدالت، مقدمہ حر کا
تھا وقت سننے کو بےتاب فیصلہ حر کا

(۳۵)

تھے اس مقدمہ میں عقل و دل وکیل و فریق
تھے دونوں قرب مکانی سے گو ازل سے رفیق
نہ مہرباں تھی یہ اس پر، نہ تھا وہ اس پہ شفیق
یہ لاجواب اسے کرتی، وہ اس کو کرتا ضیق
عبور عقل کا قانون پہ جو ظاہر تھا
تو دل بھی خوب وکالت کے فن میں ماہر تھا

(۳۶)

یہ بحث دل نے کی آغاز ، اے حرِ ذی جاہ
تو اپنے رتبہ و منصب سے خوب ہے آگاہ
یہ اقتدار ، یہ سامانِ عیش و عشرت ، واہ
کہ جن پہ رشک کریں صاحبانِ تیغ و سپاہ
کسی نے کب ترا جاہ و جلال پایا ہے
یہ احتشام و خدم کس کے ہاتھ آیا ہے

(۳۷)

عبث ہیں تیری یہ بے چینیاں ، یہ تیری تڑپ
فضول آنکھوں سے گرتے ہیں اشک جو ٹپ ٹپ
حسین بے کس و عاجز ہیں ، ان کا نام نہ جپ
ہے جان لیوا بہت یہ غمِ فراق کی تپ
یہاں تو خیر سے دام و درم برستے ہیں
وہ بوند بوند کو پانی کی خود ترستے ہیں

(۳۸)

یہ سن کے عقل نے بڑھ کر کہا کہ اے حق کوش
نہیں ہے اس دلِ دنیا طلب کو کچھ بھی ہوش
عبث ہے بحث و دلائل میں اس کا جوش و خروش
کہاں حسین ، کہاں شام و رے کے یہ مے نوش
حسین فخرِ رسل ، نازشِ اب و جد ہیں
حسین دہر میں اس دور کے مجدد ہیں

(۳۹)

جو دل نے یاد ابھی پیاس کی دلائی تھی
حقیقت اس نے دلائل میں یہ چھپائی تھی
عطش سے جبکہ تری جان پر بن آئی تھی
حسینؑ ہی نے تو دریادلی دکھائی تھی
وہ تشنہ لب سہی ، دل میں جو لہر آ جائے
تو ان کے جام میں کوثر کی نہر آ جائے

(۴۰)

جو کائنات کا مختار ہو بحکمِ الٰہ
وہی ہے حاکمِ گیتی ، وہ شاہِ عرش پناہ
طبق طبق ہے زمیں آسماں پہ اس کی نگاہ
تصرف اس کا ہر اک خشک و تر پہ ہے واللہ
وہ تشنہ لب ہے تو اللہ کی رضا کے لیئے
سمجھنا اس کو نہ بےبس کبھی خدا کے لیئے

(۴۱)

کیا حسینؑ نے صحرا ترے لیئے جل تھل
مگر جواب میں اس کے ترا یہ طرزِ عمل
کہ راہ روک کے ڈالا سفر میں ان کے خلل
کوئی بھی دیتا ہے احساں کا یوں کسی کو بدل
ادائے شکر تو کیا ، ان کو یوں ملال دیا
کہ تو نے ہاتھ لجامِ فرس پہ ڈال دیا

(۴۲)

وہ تیرا ہاتھ ، وہ اس کی لجامِ پاک جسے
غلام کی طرح عباسؑ سا جری تھامے
جلال دیکھا تھا اس شیر کا بھلا تو نے
وہ کیسے غیظ میں ضیغم صفت لرزتے تھے
جو شہؑ کے حکم سے تیری قضا نہ ٹل جاتی
تو اس جہاد کی تاریخ ہی بدل جاتی

(۴۳)

حسینؑ خسروِ گردوں پناہ ہیں ، اے حر
فروغِ نور سے صد رشکِ ماہ ہیں ، اے حر
نبیؐ کا دل ہیں ، علیؑ کی نگاہ ہیں ، اے حر
زمیں پہ مظہرِ شانِ الٰہ ہیں ، اے حر
یہ آج ان کا قدم جو نہ درمیاں ہوتا
تو نام کو بھی پھر اسلام اب کہاں ہوتا

(۴۴)

کہاں حسینؑ ، کہاں یہ ذلیل و ظالم و شوم
گناہ گار ہیں یہ سب ، وہ طیب و معصوم
یہ بدنصیب غلامی سے ان کی ہیں محروم
سعادتِ ابدی لے قدم جو ان کے چوم
بڑھ اور پیاسوں سے ساغر مئے حیات کے لے
اٹھ اور اٹھ کے قدم شاہِ کائنات کے لے

(۳۵)

یہ سن کے دل نے کہا ، اے ضمیرِ با انصاف
مئے حیات کی لالچ ہے قاعدہ کے خلاف
ہے اعتراض مجھے ، پہلے ہو یہ نکتہ صاف
کہ قصرِ عدل کی دیوار میں پڑے نہ شگاف
کہا ضمیر نے ، یہ جھوٹ ہے نہ لالچ ہے
خلافِ قاعدہ کب ہے وہ بات جو سچ ہے

(۳۶)

یہ اعتراض کیا مسترد ضمیر نے جب
کہا یہ عقل نے اب اے امیر نیک نسب
نبیؐ کے لعل کا لازم ہے تجھکو پاس و ادب
نہیں ہے ان کی غلامی سے بڑھ کے یہ منصب
شرف میں ان کے تجھے کب کلام تھا اے حر
کہ تو تو عارفِ حق امامؑ تھا اے حر

(۳۷)

جو ذو حسم پہ ہوا سدِ راہِ شاہِ حجازؑ
پڑھی تھی بعد میں گو تو نے ان کے پیچھے نماز
بجا ہے تو جو کرے زندگی بھر اس پہ ناز
مگر لجامِ فرس پہ کیا جو ہاتھ دراز
کہا تھا تجھ سے انھوں نے غضب کے عالم میں
خدا رلائے تری ماں کو تیرے ماتم میں

(۴۸)

یہ سن کے تو نے کہا تھا کہ شاہِ نیک انجام
عرب میں لیتا مری ماں کا یوں اگر کوئی نام
تو میں بھی کرتا یونہی اس کی ماں کے حق میں کلام
مگر ہوں آپ سے مجبور اے امامِ انام
وہ جس کی شان میں تطہیر و ہل اتیٰ آئے
مری زبانِ نجس پر وہ نام کیا آئے

(۴۹)

اسی طرح جو رہی بحث رات بھر جاری
تھی چونکہ دونوں فریقوں کی خوب تیاری
کبھی جو دل تو کبھی عقل دل پہ تھی بھاری
نہ اس نے مانی شکست اور نہ عقل ہی ہاری
نہ پہنچیں گو کہ صدائیں کسی کے کان تلک
یہ بحث جاری رہی صبح کی اذان تلک

(۵۰)

یہ بحث اور یہ دلائل سنے ضمیر نے جب
کہا کہ وقت عدالت کے فیصلہ کا ہے اب
اگرچہ دونوں نے واضح کیا ہے ہر مطلب
ہے ایک نکتہ ضروری یہاں پہ غور طلب
سوال جب یہ ہو، کس کو ولی بنایا جائے
اسے بناتے ہیں، کردار جس میں پایا جائے

(۵۱)

زروئے دل تو یہی حر کے حق میں ہے بہتر
ادھر کو جائے جدھر ہو متاعِ منصب و زر
یزید لاکھ سہی بدقماش و بانیٔ شر
مگر حسین کی جانب ہے جان کا بھی ضرر
حسین ضامنِ جنت ہیں ، اس میں شک کیا ہے
مگر جو نقد ہو سودا ، وہ سب سے اچھا ہے

(۵۲)

ادھر یہ بحث ہے عقل کی عیاں یکسر
قبول کر لیں ولی بننا خود حسین اگر
نگاہ‌دار رہیں گے وہ حر کے تا محشر
عدالت ایسے میں پہنچی ہے اس نتیجہ پر
خلاف عقل کے جب ہو معاملہ دل کا
قبول ہو نہیں سکتا ہے فیصلہ دل کا

(۵۳)

سنا دیا جو عدالت نے فیصلہ یکسر
کہ اس مقدمہ میں عقل ہو گئی سرِ بر
شکستِ دل سے ہوئی دل شکستگی نہ مگر
خدا کا شکر کیا حر نے فیصلہ سن کر
یہ پہلی جنگ تھی جو حر نے آج جیتی تھی
یہ حر کی فتح بھی تھی اور حسین کی بھی تھی

(۵۴)

تھے حاضرینِ عدالت یہ تین خوش انجام
تھا ایک بھائی جو حر کا تو ایک اس کا غلام
اور ایک حر کا پسر نوجوان و صاحبِ نام
نظر کا نور ، جگر کا سرور ، دل آرام
سنا جو فیصلہ تینوں نے یہ عدالت کا
دلوں میں جوش سا پیدا ہوا مسرت کا

(۵۵)

دلوں سے پھوٹ رہے تھے خوشی کے فوارے
یہ دھڑکنیں تو نہ تھیں ، بج رہے تھے نقارے
سفیدۂ سحری کر رہا تھا نظارے
یہ جشن دیکھنے آئے تھے چرخ سے تارے
تھے اشک بر سرِ مژگاں خوشی سے آئے ہوئے
خود آ گئے تھے یہ مہمان بن بلائے ہوئے

(۵۶)

جو دیکھا اپنے رفیقوں کا حال یہ حر نے
کھلا دیا دلِ پژمردہ اس تاثر نے
کیا سلام جو رخصت کا اب تکدر نے
حضورِ شاہ میں پہنچا دیا تصور نے
حر اٹھا جلوۂ ایماں طرازِ صبح کے ساتھ
نمازِ شکر ادا کی نمازِ صبح کے ساتھ

(۵۷)

کہا پھر ان سے کہ ہوتا ہوں میں تو اب رخصت
خدا کے فضل سے ہے اوج پر مری قسمت
تمھارا کیا اب ارادہ ہے کوچ کی بابت
ہماری پشت پہ دوزخ ہے ، سامنے جنت
خود اپنے پاؤں سے کیا جانبِ سقر جائیں
خدا نے دی ہیں جو آنکھیں تو دیکھ کر جائیں

(۵۸)

وہ تینوں پہلے ہی تیار تھے جو چلنے کو
حصارِ دوزخِ طاغوت سے نکلنے کو
یہ لازمی تھا جو سمتِ سفر بدلنے کو
چلے تو خیمہ سے گویا یونہی ، ٹہلنے کو
عدو کو دام میں تدبیر کے یہ لا نہ سکے
جو دل کا حال تھا ، چہرے اسے چھپا نہ سکے

(۵۹)

کسی نے کہہ دیا یہ ابنِ سعد سے جا کر
بہت عجیب سے کچھ آج حر کے ہیں تیور
ہے ظاہرا تو وہ محوِ جمالِ صبح ، مگر
وہ اضطراب ہے ، بسمل ہو جیسے مرغِ سحر
یہ رنگ رخ پہ بوقتِ سحر نہیں آتا
مجھے یہ طور کچھ اچھا نظر نہیں آتا

(۶۰)

یہ سن کے حکم دیا ابنِ سعد نے فوراً
کہ لاؤ مرغِ پرافشاں کو جانبِ گلشن
کھلے اس آہوئے رم خوردہ کا جو ہم پہ چلن
سمجھ میں آئے بھی سچ ہے کہ ہے غلط یہ سخن
ہے جوشِ جنگ اسے یا جنوں ۔ سبب تو چلے
کچھ اضطراب اگر ہے تو کیوں ۔ سبب تو چلے

(۶۱)

یہ حکم سن کے گیا اک رسالہ حر کے پاس
وہ جس سے اور بھی کچھ حر کا بڑھ گیا وسواس
بخیر خدمتِ شہ میں پہنچنے سے ہوئی یاس
چلا بہ جبر سوئے ابنِ سعد محسِ اساس
نگاہیں ملتے ہی سب حال کھل گیا اس کا
لکھا تھا صاف رخِ حر پہ فیصلہ اس کا

(۶۲)

جب اس نے تاڑ لیا رخ سے حر کے دل کا حال
کہا کہ تجھ کو بھلا کب ہے بے سبب یہ ملال
اگر حسینؑ سے عشق و وفا کا ہے یہ مآل
ہے دوستانہ میرا مشورہ یہ روگ نہ پال
نہ ان کے پاس ہے منصب ، نہ اقتدار کوئی
کسی غریب پہ کرتا ہے دل نثار کوئی

(۶۳)

کہا یہ حر نے کہ پہلے بتا یہ اے ظالم
بھلا حسین سے کیا جنگ ہوگئی لازم
کہا کہ ہاں ، ہے یہی اب تو مرضیٔ حاکم
وگر نہ میں تو ابھی تک ہوں صلح پر عازم
تجھے یہ ان سے لڑائی میں رد و کد ہے کیوں
بغیر جنگ ملے گی حکومتِ رئے کیوں

(۶۴)

ادھر یزید کا دریائے فیض ہے جاری
پھر اس پہ میرا یہ وعدہ ہے تجھ سے سرکاری
جو رئے پہ ہوگئی قائم مری عملداری
تو بخش دوں گا میں تجھکو سپاہ سالاری
ادھر یہ منصب و لعل و گہر کی بارش ہے
بھلا حسین کی جانب سے کیا نوازش ہے

(۶۵)

کہا یہ حر نے ، لگا اب نہ جاہ و مال کی رٹ
تجھی کو ہو یہ مبارک ، اب اس سے تو ہی چمٹ
کہے تو ، چڑھتے ہوئے آفتاب سے کہ پلٹ
بس اب نہ روک مجھے ، دور ہو نگاہ سے ، ہٹ
یہ میری تیغ ہے تجھ جیسے بے حیا کے لیئے
جو مرد ہے تو نکل دشت میں وغا کے لیئے

(۶۶)

یہ کہہ کے حر نے جو اب راہوار کو موڑا
مزاج آشنا حر کا جو خوب تھا گھوڑا
تو اس کو جنبشِ تارِ نظر ہوئی کوڑا
زغند بھر کے جو حلقہ کو فوج کے توڑا
وہ یوں نکل گیا اس دامِ فتنہ و شر سے
وہ دیکھتا ہی رہا ۔ اسپ اڑ گیا فر سے

(۶۷)

حصار توڑ دیا فوج کا جو یوں حر نے
کیا خیامِ حسینی کا رخ بہادر نے
دکھائی منزلِ مقصود جب تدبر نے
جبیں جھکا دی وہیں جذبۂ تشکر نے
کہا پسر سے ۔ جسارت انھیں سے تو کی تھی
وہ ہاتھ باندھ دو جن سے لجام تھامی تھی

(۶۸)

بندھیں جو ہاتھ تو شاید کھلے مری تقدیر
معاف کر دیں خطا میری حضرتِ شبیرؑ
اگرچہ عفو کے قابل نہیں مری تقصیر
مگر وہ رحمتِ حق ہیں ۔ وہ بحرِ خیرِ کثیر
شفاعت ان کی سفارش پہ ہو گی عقبا میں
تو کیوں امیدِ کرم ہو نہ ان سے دنیا میں

(۶۹)

ادھر وہ گرد جو اڑتی ہوئی نظر آئی
تو چونک اٹھے شہِ کربلا کے شیدائی
حسین نے جو توجہ ادھر کو فرمائی
تو بوئے الفتِ محبوب یہ خبر لائی
غلامِ بارگہِ بوتراب آتا ہے
پلٹ کے ڈوبا ہوا آفتاب آتا ہے

(۷۰)

حسین خوش ہوئے اور بھائی سے یہ فرمایا
ذرا ادھر کو تو آؤ ، یہ دیکھو کون آیا
یہ آج صبح کا سورج بڑی خبر لایا
بچھڑ گئے تھے جو ہم سے ، پھر ان سے ملوایا
جو دل ملول تھا ، وہ شاد ہو کے آتا ہے
یہ حر ہے ، نفس سے آزاد ہو کے آتا ہے

(۷۱)

اثر ہے نام کا اس کے کہ سربسر ہے حر
خودی سے سوئے خدا عازمِ سفر ہے حر
صدف سے شام کے نکلا جو وہ گہر ہے حر
ہوا طلوع جو اس شب کو ، وہ قمر ہے حر
کچھ ایسے آتشِ غم میں تپا دیا اس کو
اس ایک رات نے کندن بنا دیا اس کو

(۷۲)

بتا رہی ہے بہادر کی عاجزانہ چال
کہ اس کو اپنے کیئے پر ندامت اب ہے کمال
ہے مہماں یہ ہمارا بس اب رہے یہ خیال
بڑھیں اب آپ بھی۔ اکبرؑ بھی بہر استقبال
یہ عز و جاہ حرِ حق مآب کو لائیں
مع نجوم اب اس ماہتاب کو لائیں

(۷۳)

یہ سن کے نعرۂ تکبیر کا ہوا اک غل
کھل اٹھے غنچۂ دل سب کے مثل لالہ و گل
خوشی یہ تھی کہ قفس سے رہا ہوا بلبل
کسی نے شکر میں تاخیر کی نہیں بالکل
یہ حر کی فکر میں تبدیلی انقلابی تھی
حسینؑ کے لیئے پہلی یہ کامیابی تھی

(۷۴)

اٹھے اب اکبرؑ و عباسؑ یوں بصد تعجیل
کہ لازم ان پہ تھی فی الفور حکم کی تعمیل
سوار ہو کے جو دی باگیں کھینچ کر انھیں ڈھیل
تو گویا مرکبوں کو مل گئے پَرِ جبریل
پلک جھپکتے میں منزل پہ اپنی جا پہنچے
بس ایک آن میں حر کے قریب آ پہنچے

(۷۵)

جو حر نے دیکھا کہ آتے ہیں اکبرؑ و عباسؑ
ذرا سی دیر کو جاتے رہے بس اس کے حواس
ہوا جو قدر شناسیٔ شہؑ کا پھر احساس
پکڑ کے ان کے قدم پہ کہا بحسرت و یاس
بحقِ حضرت شبیرؑ بخشوا دیجے
امامؑ سے مری تقصیر بخشوا دیجے

(۷۶)

گلے لگایا جو عباسؑ نے بہ لطفِ عمیم
کہا کہ تجھ کو مبارک یہ سوئے حق تقدیم
حسینؑ سبطِ نبیؐ ہیں، کریم ابنِ کریم
نہ ان سا صاحبِ عفو و کرم، نہ تجھ سا اثیم
تری حرف سے انھوں نے دل اپنا صاف کیا
ترے قصور کو بخشا ہے، تجھ کو معاف کیا

(۷۷)

تجھے ہے کس لیئے اب اس قدر یہ حزن و ملال
شفیق تجھ پہ ہیں آقا مرے بحدِ کمال
یہاں جو آیا ہے ان کا غلام اور ان کا یہ لال
ہمیں انھیں نے تو بھیجا ہے بہرِ استقبال
یہ اشک آنکھوں میں روک اب، صدف میں در کی طرح
چل اب امام کی خدمت میں مردِ حر کی طرح

(۷۸)

وہ حریت کے پیمبر ہیں ، مردِ حر کے امام
انھیں بشر کی غلامی ہے ناپسند مدام
خدا کی بندگی ، انسان دوستی کا پیام
یہی ہے مقصدِ شبیرؑ اور یہی اسلام
حسینؑ رکھ کے ہتھیلی پہ سر جو آئے ہیں
وہ حفظِ عظمتِ نوعِ بشر کو آئے ہیں

(۷۹)

یہ سن کے جو سرِ تسلیم خم کیا حر نے
کمالِ ضبط سے اشکوں کو اب پیا حر نے
بہ سوزنِ رگِ جاں چاک دل سیا حر نے
چلا تو جا کے درِ شہ پہ دم لیا حر نے
اب اس سے آگے قدم وہ بڑھا نہ سکتا تھا
نبیؐ کے لعل سے نظریں ملا نہ سکتا تھا

(۸۰)

اگرچہ زور و شجاعت میں شیرِ نر تھا حر
مگر حسینؑ کے آگے شئے دگر تھا حر
رواں تھے اشک تو بجھتا ہوا شرر تھا حر
عرق میں شرم و ندامت کے تربتر تھا حر
لرز رہا تھا ہر اک جوڑ بند ، حال یہ تھا
نظر حسینؑ سے کیسے ملے ، سوال یہ تھا

(۸۱)

اگرچہ کھول چکا تھا وہ اپنے دل کے کواڑ
سوئے حسین مگر ہر قدم تھا اس کو پہاڑ
جنوں یہ کہتا تھا۔ اب اپنے جیب و دامن پھاڑ
خرد یہ کہتی تھی۔ لے بازوئے حسین کی آڑ
بہت حسین کے دل میں ہے الفتِ عباس
چھپالے خود کو پسِ پشتِ حضرتِ عباس

(۸۲)

بہت جو بڑھ گئی تھی دل کے آبلوں کی تپک
پسینہ آتا تھا بہہ بہہ کے سر سے ایڑی تک
اک اضطراب میں دل کر رہا تھا یوں دھک دھک
کہ ارد گرد جو تھے، سن رہے تھے اس کی دھڑک
بعید کیا تھا کہ وار اب قضا کا چل جائے
قریب تھا کہ بس اب اس کا دم نکل جائے

(۸۳)

کہا یہ آڑ سے عباس کی بقلبِ حزیں
ہے مجرم آپ کے رہوار کا یہ خاک نشیں
لجامِ اسپِ امام اور دستِ دشمنِ دیں
حقیر ذرے بھی چھوتے ہیں کہکشاں کو کہیں
لجامِ پاک وہ اور اس زبوں شعار کے ہاتھ
حضور، کاٹ دیں خود اس گناہ گار کے ہاتھ

(۸۴)

یہ سن کے آگے بڑھے خود امامِ ہردوسرا
پھر اس سے وارثِ خلقِ عظیم نے یہ کہا
تو میرا بھائی ہے اے حر، ذرا قریب تو آ
بس اب نکال دے دل سے خیالِ جرم و سزا
قریب اپنے یہ کہہ کے بلا لیا حر کو
خود آپ بڑھ کے گلے سے لگا لیا حر کو

(۸۵)

جو دیکھا حر نے یہ سبطِ نبی کا لطف و کرم
یہ ہاتھ جوڑ کے کی عرض، اے امامِ امم
مری ہی وجہ سے ہے آپ پر یہ جور و ستم
سزا نہ دیں گے مجھے آپ اگر خدا کی قسم
خود اپنے ہاتھ سے اپنا گلا میں کاٹوں گا
اب اپنی ذات سے میں انتقام خود لوں گا

(۸۶)

کہی حسینؑ نے اس کو گلے لگا کے یہ بات
جو ہو چکا وہ بھلا بھی دے مردِ خوش اوقات
سنے اب اتنے محبت بھرے جو یہ کلمات
ہوئی زبانِ امامؑ اس کو موجِ آبِ حیات
بس اتنی بات سے اس گل کو تازگی دے دی
مسیحِ وقت نے مردے کو زندگی دے دی

(۸۷)

تھے مہربان ادھر حر پہ شاہِ عرش پناہ
ادھر یہ فضہ کی آئی صدا یہ شیون و آہ
جسے بھی چاہے یہ اعزاز دے اسے اللہ
تجھے شرف یہ مبارک ہو اے حرِ ذی جاہ
بصد تشکر و سوز تمام کہتی ہیں
رسول زادیاں تجھ کو سلام کہتی ہیں

(۸۸)

یہ سن کے حر نے عمامہ اتار کر پھینکا
سر اپنا پیٹ لیا اور چیخ کر رویا
کہا کہ آہ۔ یہ آلِ نبیؐ پہ وقت پڑا
غلام کو یہ سلامِ اور ثانیٔ زہراؑ
گناہ گار ہوں۔ اب کیا کروں، کدھر جاؤں
میں کیا کروں جو گلا کاٹ کے نہ مر جاؤں

(۸۹)

پھر اس کے بعد گرا پائے شہؑ پہ اور یہ کہا
بس اب غلامِ کو آزاد کیجیئے آقا
جو منتخب کیا انجام آپ نے اپنا
شریک اس میں مجھے بھی تو کیجیئے مولا
خدا کی راہ میں پہلے مجھے فدا کیجیئے
بس اب غلام کو اذنِ وغا عطا کیجیئے

(۹۰)

کہا حسین نے یہ سر جھکا کے ، اے بھائی
ابھی ملے تھے ، ابھی ساعت فراق آئی
طعام کیسا ، نہ پانی کی بوند بھی پائی
یہ میزبانی اگر آپ کو نہیں بھائی
یہاں تو ہوگئے مجبور وقت شوم سے ہم
جناں میں آپ کی دعوت کریں گے دھوم سے ہم

(۹۱)

وہ بولا ، وقت یہ دعوت کا کب ہے شاہ انام
ابھی تو صبح ہوئی ہے ، یہ کب ہے وقت طعام
ہے یوں بھی ماحضر شب سے خوب سیر غلام
مگر ہے آلِ محمدؐ پہ آب و دانہ حرام
یہ باغِ حیدرؑ و زہراؑ کے پھول پیاسے ہیں
یہ نخلِ گلشنِ آلِ رسولؐ پیاسے ہیں

(۹۲)

کہا حسین نے ، اللہ کی رضا ہے یہی
نہیں تو کس میں تھی طاقت کہ روکتا پانی
بس اب سدھارو کہ رخصت کی آگئی ہے گھڑی
کرو گے دیر تو آزار دے گی تشنہ لبی
یہ سن کے حر نے طلب اپنا راہوار کیا
اسے حسین نے گھوڑے پہ خود سوار کیا

(۹۳)

سلام کر کے چلا حر جو سوئے دشتِ ستیز
اشارہ پاتے ہی مثلِ ہوا اڑا شبدیز
پسینۂ اسپ کا تھا جیسے آبِ عطر آمیز
سموں سے اڑتی ہوئی گرد بھی تھی عنبر بیز
ہوا جو لے کے یہ اب مشک بو غبار آئی
خزاں کے دشت میں بے فصل کی بہار آئی

(۹۴)

دکھائی تیز روی حر کے اسپ نے جو غضب
تو برق رہ گئی حیران دل پہ لے کے تعب
جو شہسوار نے اپنا ہنر دکھایا اب
اشارہ پاتے ہی بس جم کے رہ گیا مرکب
بس ایک ہاں سے جو اس بادِ پا کو ٹوک دیا
نفس کے زور پر جھونکا ہوا کا روک دیا

(۹۵)

پہنچ کے سامنے فوج عدو کے اس نے کہا
میں حر، ہوں حر، میرے آقا ہیں سیدِ والا
میں ایک ادنیٰ غلام ان کا، وہ شہِ بطحا
مقابل آئے۔ شجاعت کا ہو جسے دعوا
میں تم کو قتل کروں گا انھیں کی نصرت میں
پھر اس کے بعد تو جانا ہے مجھ کو جنت میں

(۹۶)

یہ کہہ کے کھینچ لی حر نے جو تیزدم تلوار
تمام دشت میں گونج اٹھی تیغ کی جھنکار
لرز گئے جسے سن کر تمام ناہنجار
سنی حسام نے لیکن یہ حر کے دل کی پکار
شرف نہ لے یہ کوئی اس غلام سے پہلے
چراغِ شام بجھانا ہے شام سے پہلے

(۹۷)

تھی دستِ حر میں یہ تلوار اک علم کی طرح
بلند ہوتی تھی اک پرچمِ حشم کی طرح
وفاشعار تھی حر سے وفاشیمٔ کی طرح
رواں تھی کاتبِ تقدیر کے قلم کی طرح
قضا کا فیصلہ لوحِ جبیں پہ لکھتی تھی
جہاں قلم کو ہو لکھنا ، وہیں پہ لکھتی تھی

(۹۸)

سپر پہ گرتی یہ تلوار تو کھڑک اٹھتی
جو آتی شعلہ مزاجی پہ تو بھڑک اٹھتی
عدو کو دیکھتی زد پر تو بےدھڑک اٹھتی
خود اپنے ناز و ادا دیکھ کر پھڑک اٹھتی
ہوئی تھی خانۂ حر میں جو پرورش اس کی
وغا کے دشت میں آزاد تھی روش اس کی

(۹۹)

تھا اس گھڑی جو حدِ دشت میں بس اس کا راج
عدو سر اپنے اسے دے رہے تھے مثلِ خراج
جو نصرتِ شہ تطہیر کر رہی تھی یہ آج
تو ہوگیا تھا طہارت پسند اس کا مزاج
عدوئے شاہ کا سینہ جو چاک کرتی تھی
نجس وجود سے دنیا کو پاک کرتی تھی

(۱۰۰)

امام عدل پہ دیکھا جو یوں فدا اس کو
خدا نے بخش دیا عہدۂ قضا اس کو
جو کرتے دیکھتی تھی ٹھیک فیصلا اس کو
تو داد دیتی تھی خود تیغِ لافتیٰ اس کو
جب اس کی مدح حسامِ امام کرتی تھی
یہ ذوالفقار کو جھک کر سلام کرتی تھی

(۱۰۱)

یہ تیغ پھرتی تھی اطرافِ حر میں مردانہ
کہ جیسے رقص کرے گردِ شمع پروانہ
تھے حملے حر کے وہ مردانہ و دلیرانہ
کہ گر بیاں ہوں تو لوگ ان کو سمجھیں افسانہ
جدھر بھی دشت میں حر کے فرس کی باگ اٹھی
ادھر سے فوجِ ستم بے مہار بھاگ اٹھی

(۱۰۲)

جو اب یہ دیکھا کہ حر نے بھگا دیا لشکر
تو ابنِ حصین تمیم شقی کے کہنے پر
مقابل آیا یزید تمیمیٔ خودسر
بس اک برق سی چمکی کہ تن سے اڑ گیا سر
وہ قتل ہوگیا بس یوں پلک جھپکتے میں
کہ جیسے جان شقی کی تھی حر کے قبضے میں

(۱۰۳)

ہوا جو قتل یزید تمیمیٔ بددیں
تو آیا حر کے مقابل نہ کوئی دشمنِ دیں
نہ آئے گا کوئی لڑنے کو، اب ہوا جو یقیں
لگایا نعرۂ تکبیر حر نے برسرِ زیں
نہ جب عدو کی طرف سے کوئی جواب آیا
پلٹ کے خدمتِ شہ میں وہ فتحیاب آیا

(۱۰۴)

پھر اس کے بعد کئی بار حر نے کی ہے دغا
ہر ایک بار جری کامیاب ہو کے پھرا
شہید ہوتے رہے تا بہ ظہر اہلِ وفا
یہاں تلک کہ ہوئے اب حبیبِ حق پہ فدا
بس اب تو جوش میں رن کی طرف جھپٹ کے چلے
یہیں سے غیظ میں حر آستیں الٹ کے چلے

(۱۰۵)

چلا جو اڑتا ہوا راہوارِ حر سر سر
مقابل آئی تو آندھی نہ لے سکی ٹکر
اڑی تھی گرد، مگر دور رہ گئی تھک کر
وہ تیز کاوے کہ خود چرخ کھا گیا چکر
یہ تیزیاں تھیں کہاں برق و رعد کے بس میں
بجائے خون کے بجلی بھری تھی نس نس میں

(۱۰۶)

ادھر دلیر نے حملہ کیا بہ غیظ و جلال
ادھر سے آئے زہیر ابنِ قین شیر خصال
بس اب تو دونوں نے کی مل کے وہ غضب کی جدال
لہو کی جو ہوئی بارش تو دشت ہوگیا لال
گھٹائیں ڈھالوں کی میدان سے سرکنے لگیں
جب ایک ابر میں دو بجلیاں چمکنے لگیں

(۱۰۷)

عدو تھے دو سے بیک وقت جنگ سے قاصر
تو درمیان میں دونوں کے آ گئے کافر
اکیلے حر کو ہوئے گھیرنے پہ اب قادر
یہ شیر نرغۂ اعدا میں آگیا آخر
زہیر قین بھی حر کو بس اب بچا نہ سکے
چھڑا کے فوجِ لعیں سے اب ان کو لا نہ سکے

(۱۰۸)

کھنچی تھی چاروں طرف حر کے فوج کی دیوار
ہر ایک سمت سے اب چل رہے تھے قہر کے وار
نکل رہی تھی ہر اک زخم تن سے خون کی دھار
لہولہان تھا خود اس دلیر کا رہوار
یہ شیر فوج کے نرغے سے اب نکل نہ سکا
زمیں پہ آگیا جب زین پہ سنبھل نہ سکا

(۱۰۹)

صدا یہ دی کہ محمدؐ کے دل کے چین مدد
جنابِ فاطمہؑ زہراؑ کے نورِ عین مدد
ضیائے چشمِ شہِ خیبر و حنین مدد
غلام ہوتا ہے قربان، یا حسینؑ مدد
بس اب یہ دل کی تمنا تو کم سے کم نکلے
کہ سر حضورؑ کے قدموں پہ ہو جو دم نکلے

(۱۱۰)

حسینؑ سن کے یہ آواز ہوگئے بے تاب
روانہ ہوگئے مقتل کو خود حضورؑ شتاب
تھے ساتھ اکبرؑ و عباسؑ بھی بچشمِ پرآب
پہنچ کے حر کے سرہانے کیا انھوں نے خطاب
ادب کی جا ہے شہِ مشرقین آئے ہیں
اٹھو سلام کو اے حر، حسینؑ آئے ہیں

(۱۱۱)

سرہانے بیٹھ گئے جلتی ریت پر مولاؑ
اور اپنے زانو پہ سر حرؑ کا آپ نے رکھا
پھر اس کے چہرۂ پر خوں کو شہؑ نے صاف کیا
مگر جو سر سے تھا جاری ، وہ خون نہ رکتا تھا
اسی لہو سے تو حرؑ نے یہ مرتبہ پایا
نبیؐ کے لعل سے رومالِ فاطمہؑ پایا

(۱۱۲)

جو آنکھ کھول کے حرؑ نے حسینؑ کو دیکھا
اٹھا کے ہاتھ ادب سے انھیں سلام کیا
سر اپنا زانوئے شہ سے ہٹا کے پھر یہ کہا
امامِ وقت کجا و منِ خراب کجا
زمیں کا ذرہ کہاں ، شاہِ خاص و عام کہاں
کہاں غلام کا سر ، زانوئے امام کہاں

(۱۱۳)

یہ وقتِ نزع ہی ، ہے مگر یہ سوئے ادب
امام بیٹھے ہوں لیٹا رہوں میں ، ہائے غضب
یہ کہہ کے اٹھا تو یوں گر پڑا وہ نیک نسب
قدم پہ شہ کے جو سر رکھا ، رنج مٹ گیا سب
دل حزیں سے ہر اک درد و رنج و غم نکلا
قدم پہ شاہؑ کے سر تھا کہ اس کا دم نکلا

(۱۱۴)

حسینؑ نے جو یہ دیکھا تو بس تڑپ اٹھے
مگر مشیتِ خالق یہی تھی ، کیا کرتے
جب اس کی لاش کو مقتل سے شاہؑ لے کے چلے
تھے ساتھ اکبرؑ و عباسؑ انھیں سنبھالے ہوئے
لٹایا گنجِ شہیداں میں لا کے جب حر کو
تو بھائی کہہ کے بہت روئے اس بہادر کو

(۱۱۵)

سرہانے حر کے یہ تاریخِ حریت نے کہا
یہ حر ہے حر کہ جو اقدامِ شہؑ کو حق سمجھا
سوئے حسینؑ زر و مال چھوڑ کر آیا
قضا کو اپنے ارادہ سے اختیار کیا
دلیلِ عظمتِ حق حر کو مان لے دنیا
اسی سے موقفِ شبیرؑ جان لے دنیا

(۱۱۶)

ادھر خیامِ حرم میں گئی یہ غم کی خبر
کہ حر نے نصرتِ شہؑ میں کیا جہاں سے سفر
ہے اس پہ نوحہ کناں بے کسی و یاس مگر
نہ اس کی ماں ہے نہ زوجہ جو روئے میت پر
یہ سن کے اہلِ حرمؑ میں بپا ہوا ماتم
سبھی نے ناصرِ شبیرؑ کا کیا ماتم

(۱۱۷)

ابھی تھیں نوحہ کناں حر پہ زینبِ غمگیں
کہ آئی کان میں قسمت کی یہ صدائے حزیں
ابھی ہیں اور بہت غم ، ابھی تو کچھ بھی نہیں
ابھی ہلاک نہ رو رو کے کیجیے اپنے تئیں
ابھی تو عونؑ و محمدؑ کے غم میں رونا ہے
ابھی تو لاشۂ اکبرؑ پہ جان کھونا ہے

(۱۱۸)

ابھی تو جائے گا مقتل میں قاسمؑ ابنِ حسنؑ
ابھی تو گھوڑوں سے پامال ہو گا اس کا بدن
ابھی تو فرقتِ عباسؑ دے گی رنج و محن
ابھی تو بازوؤں میں آپ کے بندھے گی رسن
ابھی تو رخصتِ آخر کو آئیں گے شبیرؑ
ابھی تو بہرِ وغا رن کو جائیں گے شبیرؑ

(۱۱۹)

عجیب عالمِ تنہائی ہوگا سرور پہ
نہ ہوں گے بھائی نہ بیٹے ، نہ مونس و یاور
کریں گے رن میں بحسرت جو چاروں سمت نظر
کہے گی بے کسی و یاس شہؑ سے رو رو کر
نہ لشکر ہے ، نہ سپاہ ہے ، نہ کثرت الناس ہے
نہ قاسمؑ ہے ، نہ علی اکبرؑ ہے ، نہ عباسؑ ہے

(۱۲۰)

وہ جس کو بھائی کہا ، اس کی اتنی خدمت کی
اٹھا کے لائے ہیں میت حسینؑ خود اس کی
ہزار حیف کہ قسمت کا فیصلہ ہے یہی
کہ جب شہیدِ جفا ہوں گے رن میں سبطِ نبیؐ
رہے گی دھوپ میں مظلوم و تشنہ کام کی لاش
کوئی اٹھا کے نہ لائے گا خود امامؑ کی لاش

* غالباً ایوب خان کے زمانہ میں دنیا بھر کے چیف جسٹس صاحبان کی ایک کانفرنس پاکستان میں ہوئی تھی ۔ اس میں امریکہ کے چیف جسٹس نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ حضرتِ علیؑ نے مالک اشتر کے نام اپنے خط میں نظام عدل کے جو اصول وضع کیئے تھے ، وہی آج عدل و انصاف کی بنیاد ہیں اور ہمارا نظام عدل ان سے ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھ سکا ہے ۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ حضرتِ علیؑ کے وضع کردہ نظام عدل کا انگریزی ترجمہ فریم کروا کے امریکہ کے چیف جسٹس کے چیمبر میں لگایا گیا ہے ۔ (ساحر)

مرثیہ

انسانیت اور حسینیت

تعدادِ بند...... ۹۲

رباعی

شبیرؑ کا ماتم نہ رلائے کیسے
اس غم میں آنکھ بھر نہ آئے کیسے
آنکھوں سے چھلک کر نہ بہیں کیوں آنسو
کوزوں میں سمندر یہ سمائے کیسے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انسانیت و حسینیت

(۱)

انسان شاہکارِ خدائے قدیر ہے
خالق ہے بے مثال تو یہ بے نظیر ہے
محتاج ہے خدا کا ، جہاں کا امیر ہے
اشرف ہے پھر بھی گو کہ بظاہر حقیر ہے
اضداد مجتمع ہیں تو قدسی بھی دنگ ہیں
فطرت میں اس کی چاروں عناصر کے رنگ ہیں

(۲)

پتلا جو خاک کا ہے تو خاک اس کی زندگی
اس پر ہوائے کبر ہے سر میں بھری ہوئی
آخر نہ کیوں ہو پیکرِ اضداد آدمی
شامل ہے جب خمیر میں پانی بھی ، آگ بھی
یہ منکسر مزاج بھی ہے ، تندخو بھی ہے
شعلوں کی آب و تاب بھی ذوقِ نمو بھی ہے

(۳)

آتش مزاج ، شعلہ جلالت ، شرر خصال
طوفاں پناہ ، بحر طبیعت ، گہر جمال
صرصر صفت ، نسیم طریقت ، صبا مثال
خاک آفریدہ ، خاک بسر ، خاک اتصال
ملتا ہے جھک کے شاخِ ثمردار کی طرح
کھنچتا ہے تو اپی ہوئی تلوار کی طرح

(۴)

کبرِ شہی ، غرورِ عمل ، جرأتِ ستم
توفیقِ عشق ، دولتِ احساس ، ذوقِ غم
تعمیرِ قوم و جذبۂ بربادیٔ امم
سب ہوگئے ہیں آدمی کی ذات میں بہم
بگڑے تو شام و کوفہ و رے کا امیر ہو
سنبھلے تو شہرِ علم کے در کا فقیر ہو

(۵)

یہ بات جو ازل ہی سے علم خدا میں تھی
تعلیم و تربیت کا ہے محتاج آدمی
لوح و قلم کو خلق کیا بہرِ آگہی
اقراء کا حکم دے کے عطا کی کتاب بھی
چپ تھی مگر کتاب ، زبان کھولتی نہ تھی
سب خوبیاں تھیں ، منھ سے مگر بولتی نہ تھی

(۶)

احکام جو کتاب میں روح الامین لائے
لازم تھا کوئی ان پہ عمل کر کے بھی بتائے
حکم صلوٰۃ میں مثلاً کیا سمجھ میں آئے
کیسے کوئی نماز پڑھے ۔ کس طرح پڑھائے
اک درس تھی ۔ عمل کی تلافی نہ تھی کتاب
تنہا کسی کے واسطے کافی نہ تھی کتاب

(۷)

اور پھر عمل نہ ہو تو ہر اک علم ہے فضول
ہر شرع کے بیان میں محکم ہے یہ اصول
با علم بے عمل ہو تو علم اس کا خاک دھول
پھر فرق کیا رہا کوئی عالم ہو یا جہول
انسان کی حیات عبارت عمل سے ہے
ایمان علم سے ہے ۔ عبادت عمل سے ہے

(۸)

تھا اس لیئے ضرور ، معلم بھی ہو کوئی
ایسا کہ جس کو علم خدا سے ہو آگہی
اس کی نظر میں ہو جو ہے منشائے ایزدی
پوری طرح ہو واقف اسرار زندگی
روشن ہوں نور حق کے چراغ اس کی راہ میں
کل راز کائنات ہو اس کی نگاہ میں

(۹)

اس واسطے خدا نے اتارے زمین پہ
علم و عمل سے کر کے سرافراز کچھ بشر
جو معتمد خدا کے ، خدائی کے راہبر
انساں کی تربیت کو عمل جن کا معتبر
منبر نشینِ علم وہ ذی جاہ ہو گئے
میدان میں عمل کے یداللہ ہو گئے

(۱۰)

ان رہبروں نے جبکہ سنوارا ہے آدمی
اس دن سے اس زمیں کا سہارا ہے آدمی
اہلِ فلک کی آنکھوں کا تارا ہے آدمی
حد تو یہ ہے خدا کو بھی پیارا ہے آدمی
بزمِ ازل میں علم کا جو سر پہ تاج تھا
پہلا ہی جو بشر تھا ، نبوت مزاج تھا

(۱۱)

اس سے بھی بڑھ کے حق نے شرف یہ عطا کیا
مسجود خود جو تھا تو اسے بھی بنا دیا
حکمِ خدا ملائکہ نور کو ہوا
اس ایک مشت خاک کو سجدہ کریں ادا
ابلیس کی انا کو یہ صورت ڈبو گئی
اک مشت خاک اشرفِ مخلوق ہو گئی

(۱۲)

غیرِ خدا کو سجدے کا خالق جو حکم دے
ابلیس کم نظر ہے ، نہ بہکے تو کیا کرے
سجدے کا حکم دینے سے پہلے کریم نے
اپنی صفات سے بھی کیا متصف اسے
بے شک انھیں صفات کا حامل ہے آدمی
جب تو ملک کے سجدے کے قابل ہے آدمی

(۱۳)

وہ نورِ محض ، نورِ مجسم ہے آدمی
عالم ہے اس کا ، سرورِ عالم ہے آدمی
اعلیٰ ہے وہ علیؑ مکرم ہے آدمی
محمود وہ محمدؐ اکرم ہے آدمی
رحمانیت اگر صفتِ کردگار ہے
یہ بھی زمیں پہ رحمتِ پروردگار ہے

(۱۴)

انسان پہ خدا کا یہ احسان دیکھ کر
حیرت سے دم بخود سا ہے ابلیسِ خیرہ سر
اس سے زیادہ اور ہو کیا عظمتِ بشر
اس کو بلا لیا شبِ معراج عرش پہ
میزانِ گفتگو میں اسے تولنے لگا
لہجے میں آدمی کے خدا بولنے لگا

(۱۵)

تزئینِ روزگار فقط آدمی سے ہے
اس ارض کا سنگھار فقط آدمی سے ہے
دنیا کا یہ نکھار فقط آدمی سے ہے
اس باغ کی بہار فقط آدمی سے ہے
جنت سے آ گیا ہے سمٹ کر یہ دور کیا
سب کچھ اسی کے دم کا ظہورا ہے اور کیا

(۱۶)

جھک کر ملے تو حاملِ خلقِ عظیم ہو
اپنے پرائے سب ہی پہ لطفِ عمیم ہو
اعدا کو بھی معاف کرے وہ رحیم ہو
دشمن بھی مستفیض ہوں ایسا کریم ہو
آزار دینے والوں پہ لطف و عطا کرے
کانٹے بچھانے والوں کے حق میں دعا کرے

(۱۷)

پھینکیں جو خیرہ سر خس و خاشاک فرق پہ
برسائیں سنگ راستہ چلتے جو بدگہر
ضربوں سے اپنی خون بہادیں جو اس قدر
ہو جائے لال خون سے نعلینِ مقتدر
چن لے انھیں پیامِ محبت کے واسطے
ایسوں کے گھر وہ جائے عبادت کے واسطے

(۱۸)

بھوکا ہو کوئی شہر میں تو خود بھی کچھ نہ کھائے
راتوں کو چھپ کے آپ وغذا اس کو دے کے آئے
تیہہ کوئی دکھانے لگے تو یہ مسکرائے
خلقِ حسن سے آتشِ غیظ و غضب بجھائے
راہِ خدا میں نفس کے غصے کو مات دے
قاتل کو جامِ شیر میں شہد و نبات دے

(۱۹)

جولاں کیا ہے اس نے عزائم کا وہ سمند
چھوتا ہے مہر و ماہ کو جو بھر کے اک زغند
منزل کوئی پڑے نہ کوئی راہ اس پہ بند
افلاک پہ نظر تو ستاروں پہ ہے کمند
جبریلِ فکر سدرۂ عزمِ جواں پہ ہے
ہیں چاند پہ قدم تو دماغ آسماں پہ ہے

(۲۰)

ٹھہرا ابھی کہاں وہ عزائم کا راہوار
کچھ اور آئی ہمتِ انساں بروئے کار
علمِ نجوم میں جو ہے جلادِ روزگار
کرنے چلا ہے اب اسی مریخ کو شکار
دیکھا جو اس کو شاخِ قمر کی مچان پہ
حیران تھا براق بھی اس کی اڑان پہ

(۲۱)

اتنا بلند حوصلہ انساں ہوا تو کیا
انسانیت کی منزلِ اعلیٰ سے جب گرا
ارذل ترین خلق یہی آدمی ہوا
ابلیس نے بھی اس کو ابوجہل کہہ دیا
ایسی درندگی کہ درندوں میں بھی نہ تھی
انسانیت کی جیسے ہوا بھی لگی نہ تھی

(۲۲)

فتنہ فساد جنگ جدل قتل لوٹ مار
کینہ، عناد و ظلم و ستم کر کے اختیار
بڑھنے لگی جو حد سے تمنائے اقتدار
خود آدمی کو آدمی کرنے لگا شکار
سوکھی زمیں کو خون سے جل تھل بنا دیا
دنیائے رنگ و نور کو مقتل بنا دیا

(۲۳)

آرے سے چیر ڈالا بمکر و ریا کبھی
انسان کو صلیب پہ لٹکا دیا کبھی
اس کا جگر چبایا کبھی، خوں پیا کبھی
گھر میں خدا کے، سجدے میں زخمی کیا کبھی
قرآں بلب جو سر تھے، سناں پر علم کیئے
حق کے علم تھے جن پہ وہ بازو قلم کیئے

(۲۴)

بے دردیوں سے خون کے دریا بہا دیئے
اس ظلم سے زمین کے طبقے ہلا دیئے
بیواؤں کے ، یتیموں کے مسکن جلا دیئے
بچے جو روئے ، ان کو طمانچے لگا دیئے
صندل سے جو رچی تھیں ، وہ مانگیں بگاڑ دیں
کچھ ماؤں کی بھری ہوئی گودیں اجاڑ دیں

(۲۵)

رکھا قدم جو پہلے بشر نے زمین پہ
معصوم سی فضائیں تھیں ہر سمت جلوہ گر
عصمت سرائے دہر بنی جنت نظر
دارالسلام ہوگئی یہ ارض سر بسر
انساں نشان رحمت و عدل و عطا کا تھا
ہوتا نہ کیوں ، یہ دہر میں نائب خدا کا تھا

(۲۶)

لیکن یہ دور امن بہت مختصر رہا
منظر جو تھا نظر میں ، یکایک بدل گیا
حیرت سے چرخ دیکھ رہا تھا یہ ماجرا
اک بھائی کی چھری ہے تو اک بھائی کا گلا
عصمت کی جو فضا تھی ، وہ پامال ہو گئی
انسان کے لہو سے زمیں لال ہو گئی

(۲۷)

پہلی خطا تھی ، دہر میں پہلا یہ قتل تھا
قاتل کے دل میں خوف سا اس جرم سے ہوا
سیکھا جو اک پرند سے انداز دفن کا
ویسے ہی اس نے خاک میں لاشہ چھپا دیا
کوشش یہ تھی کہ بھائی کا مردہ گڑا رہے
مطلب یہ تھا کہ جرم پہ پردہ پڑا رہے

(۲۸)

دیکھو تو وہ نحیف سا اک غم زدہ بشر
بیٹھا ہوا ہے یکہ و تنہا زمین پر
تڑپا رہا ہے قلب کو اس کے غمِ پسر
ہے ریشِ پاک اشکِ مسلسل سے تر بتر
دنیا سیاہ کیوں نہ ہو ان کی نگاہ میں
چہلم کا دن گزر گیا فریاد و آہ میں

(۲۹)

یہ غم زدہ وہ ہے جسے آدمؑ لقب ملا
یہ وہ مقام ہے جسے کہتے ہیں کربلا
پہلا زمیں پہ خون اسی دشت میں بہا
بیٹے کا داغ باپ نے پہلے یہیں سہا
دامن سے اب زمیں کے یہ دھبا نہ جائے گا
یہ خوں سمندروں سے بھی دھویا نہ جائے گا

(۳۰)

بارش کی پہلی بوند کے مانند جو گرا
وہ خون موج موج ابلتا ہوا چلا
صدیوں کے بندھ سے بھی یہ طوفاں نہ رک سکا
اب پھر وہی لہو ہے ، وہی دشت کربلا
پھر عظمتوں کے اوج سے گرتا ہے آدمی
پھر آدمی کے خون کا پیاسا ہے آدمی

(۳۱)

پھیلا ہوا ہے دشت میں ہر چار سو لہو
قطرہ بہ قطرہ ، یم بہ یم و جو بہ جو لہو
ذرہ بہ ذرہ ، در بہ در و کو بہ کو لہو
پھر بھی زمیں پکار رہی ہے لہو لہو
کیا تشنگی تھی ضبط جو اس سے نہ کی گئی
دو چار ساعتوں میں گھڑوں خون پی گئی

(۳۲)

اتنا بشر کا خون رواں جس جگہ بہا
اس بحرِ خوں میں کتنے جزیرے ہیں جابجا
دراصل یہ تو ہیں وہ شہیدانِ باوفا
جو سنگِ میلِ عشق ہیں ، جو منزلِ بقا
سمجھو تو یہ چراغ میں دامانِ طور کے
دیکھو تو بحرِ غم میں منارے ہیں نور کے

(۳۳)

ایک ایک ان میں وہ کہ سبب فخر و ناز کا
ہر اک کے سر پہ تاج کسی امتیاز کا
روحیں حقیقتوں کی تو پردہ مجاز کا
کوئی حبش کا ان میں ، کوئی ہے حجاز کا
جو بھی ہے راہ حق میں وفا کا نشان ہے
انسانیت کا دل ۔ بشریت کی جان ہے

(۳۴)

دیکھو وہ حریت کا نشاں ، حر کہیں جسے
وہ درِ بے بہا کہ بہادر کہیں جسے
حق آشنا بھی حق کا تفاخر کہیں جسے
تیور میں رعب وہ کہ تہور کہیں جسے
مرنے پہ بھی سکونِ دلی آشکار ہے
ابرو میں بانکپن ہے تو رخ پروقار ہے

(۳۵)

دیکھو ادھر ، وہ چین سے سوتا ہے اک جواں
روئے حسیں پہ ایسی جلالت کہ الاماں
لیکن کتابِ عشق میں سرنامۂ بیاں
اس ارضِ بے وفا پہ وفاؤں کا آسماں
اس جیسا باوفا نہیں کوئی خدائی میں
سوتا ہے وہ جو ہاتھ کٹائے ترائی میں

(۳۶)

اک سمت ہے جمالِ بشر کا وہ شاہکار
حوریں بھی صدقے جائیں، ملائک بھی ہوں نثار
ایسے حسیں جہاں میں کب آتے ہیں بار بار
افسوس، اس جواں کا کلیجہ بھی ہے فگار
سینے میں اس کے دیکھ کے برچھی گڑی ہوئی
روتی ہے موت اس کے سرہانے کھڑی ہوئی

(۳۷)

دیکھو وہ ایک چاند سے دولہا کی دل کشی
یہ حسن، یہ وقار، یہ جرأت، یہ کم سنی
جوڑا شہانہ ہے کہ قبا خون میں رنگی
دھاریں لہو کی سہرے کی لڑیاں بنی ہوئی
کنگنا ہے زخمِ تیغ کا اس کی کلائی میں
ایسا کوئی بنا بھی ہے دولہا خدائی میں

(۳۸)

اس سمت دیکھیے، وہ نشاں دوستی کا ہے
وہ سنگِ میل طاعت و حق آگہی کا ہے
بندہ ہر اک خدا کا ہے، آقا خودی کا ہے
جو بھی یہاں چراغ ہے، وہ روشنی کا ہے
ایک ایک ناخدا ہے شہادت کی ناؤ پہ
ہے کربلا میں خون کا دریا چڑھاؤ پہ

(۳۹)

دریائے خوں کے بیچ میں تنہا اک آدمی
زخموں سے چور چور ۔ قبا خون میں بھری
بازو شکستہ ۔ ٹوٹی کمر ۔ جوشِ تشنگی
دل غم سے ٹکڑے ٹکڑے مگر واہ رے جری
ذلت کی زندگی سے شہادت پسند ہے
کل کائنات پست ہے ۔ یہ سربلند ہے

(۴۰)

خود بھی جمیل اور مقاصد بھی ہیں جمیل
نظروں کے اعتماد سے جبرِ شقی ذلیل
قدموں میں وہ ثبات ۔ شجاعت کا جو کفیل
چہرے پہ وہ وقار ۔ بڑے پن کی جو دلیل
ہاتھوں پہ اس کے پھول سا اک شیرخوار ہے
جس کے لبوں پہ حسنِ گلستاں نثار ہے

(۴۱)

رخ پر جلال ۔ لب پہ تبسم ۔ نظر میں نور
روشن جبیں کی ضو سے منور چراغِ طور
عارض وہ جن کو پیار سے چومے نگاہِ حور
سایہ بھی رنج و غم کا رہے جن سے دور دور
آنکھوں سے کھیلتی ہے کرن آفتاب کی
ہونٹوں پہ جان دیتی ہیں کلیاں گلاب کی

(۴۲)

گودی میں ہے پدر کی اگرچہ وہ نونہال
دامن کے سائے میں بھی مگر ہے یہ اس کا حال
شدت سے تشنگی کی ہوا ہے جو وہ نڈھال
ہے چشمِ یاس سوئے پدر صورتِ سوال
ننھے سے دل میں عزمِ جوانی لیئے ہوئے
آنکھوں میں تشنگی کی کہانی لیئے ہوئے

(۴۳)

حالت پسر کی دیکھ کے وہ مردِ باوقار
کہتا ہے دشمنوں سے کہ اے فوجِ بدشعار
انسان پہ خدا نے کیا فخر و افتخار
انسانیت کو کرتے ہو کیوں حق سے شرمسار
یہ ظلم اختیار کیا کس خیال پر
پانی ہے بند کیوں مرے اس نونہال پر

(۴۴)

پیاسا کسی کو مارنا کارِ بشر نہیں
تم بھی ہو آدمی ہی بظاہر مگر نہیں
بچے پہ ظلم اور خدا کا بھی ڈر نہیں
پیاسا یہ تین دن سے ہے۔ تم کو خبر نہیں
ماں اس کی تشنہ لب ہے کنارے فرات کے
سوکھے ہیں قحطِ آب سے چشمے حیات کے

(۴۵)

چشمے خدا کے فیض کے جاری ہیں صبح و شام
دریا پہ سب کا حق ہے، یہ حق کا ہے لطف عام
جاگیر یہ نہیں ہے کسی ایک ہی کے نام
اک گھونٹ اس کو دو کہ یہ بچہ ہے تشنہ کام
دریا نہ تم سے دور، نہ پانی قلیل ہے
پیاسوں کے واسطے یہ خدا کی سبیل ہے

(۴۶)

دیکھو، وہ جھک کے باپ نے بچے سے کچھ کہا
دیکھو، وہ اپنے لب پہ زباں پھیرنے لگا
دیکھو، وہ منھ کو پھیر کے روتے ہیں اشقیا
دیکھو، وہ تیر سن سے سوئے بے زباں چلا
دیکھو، کلیجہ باپ کا اس غم سے پھٹ گیا
دیکھو، الٹ کے باپ سے بچہ لپٹ گیا

(۴۷)

مظلوم سے کچھ اور نہ اس وقت بن پڑا
چلو میں لے کے اس کا لہو منھ پہ مل لیا
تنہائی وہ کہ کوئی نہ ہمدم نہ آشنا
سامان دفن کا ہے نہ تربت کا کچھ پتا
میت پسر کی لے کے کہاں جائے، کیا کرے
یہ وقت کوئی باپ نہ دیکھے خدا کرے

(۴۸)

مجبور ہو کے بے کس و ناچار باپ نے
ننھی سی لاش رکھی زمیں پر سنبھال کے
اک تیغ دوزباں کو نکالا نیام سے
چھوٹی سی قبر کھود لی میت کے واسطے
ننھی لحد بنا کے بڑا نام کر گئی
اس وقت ذوالفقار عجب کام کر گئی

(۴۹)

پھر اٹھ کے اس جگہ سے ہوا اس طرف رواں
خیمے لگے ہوئے تھے کچھ اجڑے ہوئے جہاں
آئی ادھر سے دوڑ کے اک در پہ ایک ماں
شاید یہ پوچھتی ہے مرا لال ہے کہاں
صاحب، وہ میرے گھر کا اجالا کہاں گیا
آقا وہ میرا ہنسلیوں والا کہاں گیا

(۵۰)

دیکھو تو، وہ جواب میں بے کس نے کچھ کہا
سنتے ہی کیسا ماں کو وہ سکتہ سا ہو گیا
وہ خالی خالی گود میں کچھ دیکھتی ہے کیا
دیکھو، فضا میں شور یہ کیسا ہے، کچھ سنا
کہتا ہے کوئی، کیوں تمھیں بچے سے یاس ہے
بی بی، وہ اب بہشت میں دادی کے پاس ہے

مطلعِ ثانی

پلٹا حرم سے یوسفِ کنعانِ کربلا
جس کا جمال نیرِ تابانِ کربلا
نورِ نگاہ شمعِ فروزانِ کربلا
پائے ثبات منزلِ ایمانِ کربلا
ایسا جری کہ گردشِ دوراں کو ٹوک دے
ایسا قوی کے وقت کے طوفاں کو روک دے

(۵۲)

حاضر تھا در پہ مرکبِ خوش رنگ و خوش قدم
آیا قریب اس کے وہ مظلومِ محترم
دیکھا فرس کو پھر یہ صدا دی بصد الم
تھامے کوئی رکاب کہ ہولیں سوار ہم
سنتے ہی درد و یاس بھرے اس خطاب کو
شاید بہن نے آکے سنبھالا رکاب کو

(۵۳)

ہو کر سوار جانبِ مقتل چلا دلیر
اب ہے اسیرِ غم نہ بظاہر دکھوں سے زیر
کہتا ہے دبدبہ کہ ہے غصہ میں اب یہ شیر
رخ سے عیاں کہ حشر میں اب کچھ نہیں ہے دیر
چتون سے رعب ضیغم رب آشکار ہے
کہتی ہے ران ماک نہ دلدل[؟] سوار ہے

(۵۴)

پہنچا قریب لشکرِ اعدا جو شہسوار
دیکھا نگاہِ غور سے دشمن کو ایک بار
پھر یوں کیا خطاب بصد جاہ و افتخار
اے دشمنانِ آدم و انسانیت شکار
پہلے تعارفِ نسبی فرض عین ہے
سب جانتے ہیں نام ہمارا حسین ہے

(۵۵)

ہم کون ہیں ، یہ اچھی طرح جانتے ہو تم
آنکھیں تمہارے منھ پہ ہیں ، پہچانتے ہو تم
اس کے پسر ہیں جس کو نبیؐ مانتے ہو تم
کلمہ اسی کے نام کا گردانتے ہو تم
دنیا میں آج نائبِ احمد ہمیں تو ہیں
قولِ نبیؐ ہے چوتھے محمدؐ ہمیں تو ہیں

(۵۶)

ہم نے یہ قدر پائی ہے اقدار کے سبب
رفعت ملی بلندیٔ کردار کے سبب
تہذیبِ فکر و جذبۂ ایثار کے سبب
حق گوئی اور جرأتِ اظہار کے سبب
ثابت قدم ہیں حق پہ خدا کے کرم سے ہم
دبتے نہیں ہیں جور و جفا و ستم سے ہم

(۵۷)

کلمہ خدا کا پڑھ کے مکرتے نہیں ہیں ہم
انسانیت کے خوں سے نکھرتے نہیں ہیں ہم
دنیا کے اقتدار پہ مرتے نہیں ہیں ہم
راہِ خدا میں موت سے ڈرتے نہیں ہیں ہم
یہ بھی عطائے خاص خدائے کریم ہے
اپنا لقب کتاب میں "ذبحِ عظیم" ہے

(۵۸)

مرنا ہو راہِ حق میں تو مرنے سے خوف کیا
ہم کامیاب ہوں جو ہو سجدے میں سر جدا
کٹتا ہے ذکرِ حق میں تو کٹ جائے یہ گلا
لٹ جائے گھر بھی راہِ خدا میں تو کیا ہوا
کیا ڈر مقابلے پہ اگر تخت و تاج ہو
ہر ظلم کے خلاف مگر احتجاج ہو

(۵۹)

پہچان لو ہمیں کہ امامِ زماں ہیں ہم
کرتے ہیں اپنے دشمنِ جانی پہ بھی کرم
لیکن نہ ہوگا بیعتِ فاسق کو سر یہ خم
انسانیت کی عظمت و توقیر کی قسم
عزت کی موت شکرِ خدا کا مقام ہے
ذلت کی زندگی ہو تو جینا حرام ہے

(۶۰)

انسانیت کا مقصد و مفہوم ہے وہی
تعریف میں جو دین کی سمجھا گئے علی
یعنی ہر ایک حکمِ الٰہی کی پیروی
پھر خلقتِ خدا میں محبت ہر ایک کی
یہ دین بھی ہے، ہادیٔ دیں کی صفت بھی ہے
اسلام بھی یہی، یہی انسانیت بھی ہے

(۶۱)

تم کلمہ گو ہو، تم کو یہ شیوا نہ چاہیئے
اصنامِ کبر و جور کی پوجا نہ چاہیئے
دنیا کے بدلے دین کو بیچا نہ چاہیئے
انسانیت کی روح کا سودا نہ چاہیئے
شامِ ستم میں صبح کی تابندگی بنو
حیوانیت کو ترک کرو آدمی بنو

(۶۲)

یہ سن کے فوجِ کیں میں ہوا اضطراب سا
ذہنوں میں جاگنے لگا اک انقلاب سا
احساسِ جرم بن گیا خود اک عذاب سا
جو سنگ دل تھے، ان کو بھی تھا پیچ و تاب سا
جو اہلِ دل تھے، خوف سے تھرا کے رہ گئے
مردہ ضمیر طیش میں بل کھا کے رہ گئے

(۶۳)

سردار کی نظر تھی جو لشکر کے حال پر
سمجھا کہ اب ہے شام کا سورج زوال پر
اک خوف سے لرزنے لگا اس خیال پر
بولا، چلاؤ تیر پیمبر کے لال پر
بس آج فیصلہ یہ ہماری انا کا ہے
باقی امیرِ شام کا باقی خدا کا ہے

(۶۴)

سنتے ہی حکمِ حاکمِ افواج بد سیر
سب بھول بیٹھے گفتگوئے شاہِ بحر و بر
تھی لطف خسروی پہ جو ایک ایک کی نظر
حق نمک کی کھا کے قسم باندھ لی کمر
حملے کو اہلِ فتنہ و شر صف بہ صف بڑھے
اصحاب فیلِ کعبۂ حق کی طرف بڑھے

(۶۵)

یہ دیکھ کر حسینؑ کے تیور بدل گئے
قبضے پہ ہاتھ رکھ کے فرس پر سنبھل گئے
بدلی ہوئی نظر کے جو کچھ وار چل گئے
کچھ سورما تو پہلے ہی چپکے سے ٹل گئے
حملے کے ڈر سے ہی صفِ اول بکھر گئی
ندی غرور کی جو چڑھی تھی اتر گئی

(۶۶)

پھر لب کشا ہوئے یہ شہِ آسماں جناب
افسوس ہے کہ تم نے بھلا دی رہِ صواب
اب تک تو میں نے تم سے زباں سے کیا خطاب
اب بھی جو سرکشی ہے تو سن لو مرا جواب
انسانیت سے عہدِ وفا توڑتے نہیں
حیدرؑ کے لال جنگ سے منھ موڑتے نہیں

(۶۷)

انسانیت نے ہم کو پکارا تو آئے ہیں
مظلومیت نے مانگا سہارا تو آئے ہیں
حق کا ہوا جو ہم کو اشارہ تو آئے ہیں
تم نے کہا کہ آؤ خدارا تو آئے ہیں
اب جنگ پر تلے ہو تو اب جنگ ہی سہی
مرنا ہی چاہتے ہو تو اچھا یہی سہی

(۶۸)

تلوار اب اٹھاتے ہیں ناچار دیکھنا
خیبر کشاؑ کے لال کی پیکار دیکھنا
دھڑکن دلوں کی ، خون کی رفتار دیکھنا
اب زورِ دستِ حیدرؑ کرار دیکھنا
تکمیل پائے آج جو فرضِ امامؑ ہو
وہ معجزہ دکھاؤں کہ حجت تمام ہو

(۶۹)

یوں تو ہماری جرأتِ اظہار معجزہ
بیعت کی اس طلب پہ یہ انکار . معجزہ
اک اس فرس کی سرعتِ رفتار معجزہ
پھر یہ خدا کی دی ہوئی تلوار معجزہ
حیدرؑ کی یہ . رسولؐ کی وہ یادگار ہے
نام اس کا ذوالجناح ہے . یہ ذوالفقار ہے

(۷۰)

جب یوں کیا کلام امامؑ انام نے
حملہ کیا حضورؑ پہ افواجِ شام نے
کھینچی کمر سے تیغ شہِؑ تشنہ کام نے
اب کس میں ہے یہ تاب کہ آ جائے سامنے
سن کر ملوکیت یہ خبر ، تھرتھرا گئی
مظلومیت کے ہاتھ میں تلوار آ گئی

(۷۱)

دستِ امامؑ وقت میں جو ذوالفقار ہے
انسانیت نواز و عدالت شعار ہے
حق بیں ہے ، حق پناہ ہے ، باطل شکار ہے
اس پہ خدا کے دین کا دارومدار ہے
آئی ہے حفظِ حق کو شہِؑ انس و جاں کے پاس
رہتی ہے رات دن یہ امامِؑ زماں کے پاس

(۷۲)

تلوار معجزہ ہے بدستِ امامِ پاک
بیٹھی ہوئی ہے خندق و خیبر سے اس کی دھاک
اعدائے بوتراب کو دم میں چبائے خاک
ہفتاد گز پہ جائے یہ کرتی ہوئی ہلاک
کچھ فرق کاٹ میں ہے نہ کچھ آن بان میں
جیسے علی کے ہاتھ میں تھی نہروان میں

(۷۳)

کرتی ہے بند جنگ میں راہِ فرار کو
بچ کر نکلنے دیتی نہیں راہوار کو
دیتی ہے دوڑنے میں ہزیمت سوار کو
دوڑا کے مارتی ہے ہر اک نابکار کو
ان برق گامیوں سے یہ گرمِ ستیز ہے
گھوڑے بھی مانتے ہیں کہ تلوار تیز ہے

(۷۴)

بدلی نظر کسی نے تو فوراً اکڑ گئی
سر دھڑ سے گر پڑا جب اک ہاتھ جڑ گئی
رگ رگ سے خوں نچوڑ لیا جب یہ اڑ گئی
تلوار کو لہو کی عجب چاٹ پڑ گئی
لیکن نجس غذا سے شکم پالتی نہیں
خوں چکھ کے تھوک دیتی ہے، لب چاٹتی نہیں

(۷۵)

جیسے امامِ وقت کی تلوار معجزہ
تلوار کا وغا میں ہر اک وار معجزہ
ویسے ہی یہ حسینؑ کا رہوار معجزہ
معجزنما کے اسپ کی رفتار معجزہ
وارث نبی براق کا دنیا میں آج ہے
فرفر یہ دوڑتا ہے کہ رف رف مزاج ہے

(۷۶)

دم میں پھلانگ جاتا ہے یہ ماہ و سال کو
ماضی بس ایک آن میں کرتا ہے حال کو
کیا پاسکے سمندِ شہِ دیں کی چال کو
لگ جائیں پر بھی گر مرے اسپِ خیال کو
دیکھو اشارہ پا کے مڑا ، مڑ کے وہ گیا
میدان میں وہ جم کے اڑا ، اڑ کے وہ گیا

(۷۷)

برش سے ذوالفقار کی ہیبت ہے فوج میں
ٹاپوں سے راہوار کی دہشت ہے فوج میں
ہلچل ہے ، زلزلہ ہے ، قیامت ہے فوج میں
بھگدڑ ہے ، انتشار ہے ، آفت ہے فوج میں
گرتی ہے برق تیغ جری کوند کوند کر
غصہ اُتارتا ہے فرس روند روند کر

(۷۸)

مارا کسی کو تیغِ دو پیکر کے وار نے
کچلا کسی کا کر دیا ٹاپوں کی مار نے
کاٹا کسی کا سینہ و سر ذوالفقار نے
روندا کسی کو اسپِ شہِ نامدار نے
اعدا نے ہار مان لی دونوں کے داؤں سے
تیغ جری کے ہاتھ سے گھوڑے کے پاؤں سے

(۷۹)

شہ نے دکھائے رن میں جو خیبر کشا کے ہاتھ
ایک اک کو یاد آ گئے دستِ خدا کے ہاتھ
بھاگی سپاہِ شام وغا سے اٹھا کے ہاتھ
تلوار چومنے لگی شاہِ ہدا کے ہاتھ
اٹھا نجف کی سمت سے غل ، مرحبا حسین
دریا سے آ رہی ہے صدا ، واہ یا حسین

(۸۰)

اللہ رے ، فوج کیں پہ چڑھائی حسین کی
جرأت نے خود بھی تھاہ نہ پائی حسین کی
تاریخ بن گئی یہ لڑائی حسین کی
اب ظلم دے رہا ہے دہائی حسین کی
گھگھیا رہے ہیں بانیٔ بیداد ، یا حسین
ہر سمت ایک شور ہے ، فریاد یا حسین

(۸۱)

بس سنتے ہی وہ نالہ و فریاد کی صدا
دشمن کی بے بسی پہ انھیں رحم آ گیا
تلوار روک کر شۂ مظلوم نے کہا
لو اے گروہِ ظلم شعارانِ کربلا
تلوار ہم نے روک لی ، حربے سنبھال لو
اب وقت آ گیا ہے کہ حسرت نکال لو

(۸۲)

یہ رسمِ اہلِ جاہ و ہوس بھی عجیب ہے
ہر عیسیٰ زماں کا مقدر صلیب ہے
میں جانتا ہوں اب مری منزل قریب ہے
لیکن ملوکیت کو بھی ہزیمت نصیب ہے
مقصد سے ہم کنار کرے گی قضا مجھے
سنتے ہو کچھ ۔ پکار رہا ہے خدا مجھے

(۸۳)

فرما کے پھر رضاً بقضا تیغ روک لی
حسرت سے اک نخیب کی جانب نگاہ کی
اب ہاتھ میں سپر ہے نہ شمشیرِ حیدری
بے خوف ہو کے فوج عدو پھر پلٹ پڑی
مائل بہ رحم دیکھ کے حق کے نقیب کو
چاروں طرف سے گھیر لیا اک غریب کو

(۸۴)

وہ شام کے سیاہ نصیب و سیہ نظر
تھے آدمی کے بھیس میں دراصل جانور
تنہا نظر پڑا جو یہ حیدر کا شیر نر
مثلِ شغال بڑھنے لگے چیخ چیخ کر
تہذیب کے جہان میں طوفان آ گیا
نرغے میں بھیڑیوں کے اک انسان آ گیا

(۸۵)

مارا کسی نے نیزہ کسی کا تبر چلا
خنجر سے وار کرنے لگا کوئی بے حیا
چلنے لگے جو تیر تو سینہ سپر کیا
ماری سناں کسی نے تو پہلو بدل لیا
کچھ بد گہر جو دور سے پتھر چلاتے ہیں
مولا فرس کی پشت پہ تھرائے جاتے ہیں

(۸۶)

دم لینے کو فرس پہ سنبھلتے ہیں آپ جب
اک ساتھ شہ پہ وار چلاتے ہیں سب کے سب
مارا کسی نے سینے پہ نیزہ، ارے غضب
سنبھلا گیا نہ راکبِ دوشِ نبیؐ سے اب
گردن میں راہوار کی بانہوں کو ڈال کے
مقتل کی سمت بڑھنے لگے دل سنبھال کے

(۸۷)

دیکھو ادھر نشیب کی جانب بچشمِ دل
جس سمت بڑھ رہا ہے وہ رہوار مضمحل
رونے کی اک صدا ہے فضاؤں میں مستقل
دل سوز سسکیاں ہیں تو آہیں ہیں جاں گسل
جہد عمل میں الٹے ہوئے آستین کو
بالوں سے کوئی جھاڑ رہا ہے زمین کو

(۸۸)

نزدیک اس نشیب کے پہنچا جو راہوار
کچھ اور تیز ہوگئے اہل جفا کے وار
نیزے ہزار ۔ گرز بہت ۔ تیر بے شمار
زخموں سے چور پیاس کی شدت سے بے قرار
مظلوم جب سنبھل نہ سکا پشت زین پر
رہوار گھٹنے ٹیک کے بیٹھا زمین پر

(۸۹)

لو آ گیا زمیں پہ وہ مظلوم کربلا
لو سجدۂ خدا میں وہ سر کو جھکا دیا
لو گھٹ رہا ہے خنجر و گردن کا فاصلہ
بی بی وہ اک تڑپ کے نکل آئی بے ردا
مقتل کی راہ ٹھوکریں کھانے میں کٹ گئی
آکر بہن شقی کی چھری سے لپٹ گئی

(۹۰)

کہنے لگی تڑپ کے یہ ظالم سے ۔ ٹھہر جا
للہ ۔ اب تو ظلم و تعدی سے ہاتھ اٹھا
اس وقت تو خدا کے لیئے یہ ستم نہ ڈھا
بھیا کو میرے چھوڑ دے ۔ مجھ پر چھری چلا
بھائی ہے میرا مادرِ ذی‌شان کی گود میں
بیٹے کو تو شہید نہ کر ماں ن گود میں

(۹۱)

ظالم نے ایک بھی نہ سنی اس غریب کی
لو آستیں الٹ کے جفا کو بڑھا شقی
لو زلزلہ وہ آنے لگا ۔ وہ چھری چلی
فریاد یا محمدؐ و فریاد یا علیؑ
زہراؑ پکاریں ۔ ہائے مرا لال مر گیا
انسانیت کے قلب میں خنجر اتر گیا

(۹۲)

ساحر ۔ بس اب خدا کے لیئے روک لے زباں
للہ ۔ اب نہ اور سنا غم کی داستاں
درگاہِ شاہِ دیں میں دعا کر بصد فغاں
یہ مرثیہ قبول ہو یا شاہِ انس و جاں
اس راہ میں مراتبِ اعلیٰ نصیب ہوں
ہر سال مجھ کو مرثیے کہنا نصیب ہوں

مرثیہ

انسانیت اور مذہب

تعدادِ بند......۱۰۸

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انسانیت اور مذہب

(۱)

جب آج کا یہ تمدن عروج پر آیا
بنالِ گلشنِ تہذیب میں ثمر آیا
جلا شعور نے پائی ، عمل نکھر آیا
کمالِ علم کی حد پر بشر نظر آیا
خرد کی بزم میں فطرت کے راز کھلنے لگے
علومِ نو کی ترازو میں ذہن تلنے لگے

(۲)

وہ برق و باد کی منہ زوریاں وہ طراری
وہ سوزِ مہر ، وہ ذرے کے دل کی چنگاری
جو قوتیں تھیں رگِ کائنات میں جاری
وہ آدمی کے تصرف میں آگئیں ساری
یہ جتنے دیو قوی تھے ، انھیں کمند کیا
علومِ تازہ کی بوتل میں جن کو بند کیا

(۳)

نئے جو وادیٔ ایجاد میں کھلے رستے
زمیں نئی ہوئی دریافت آسمان نئے
فروغ پائے جو ابلاغ کے ذرائع نے
زمیں سکڑنے لگی ۔ فاصلے سمٹنے لگے
یہ فصلِ وصل رقیبوں کے کچھ نہ کام آیا
اُدھر سلام گیا ، اِس طرف پیام آیا

(۴)

نتیجتاً ہوئے قوموں میں ربط قائم جب
دیا شعورِ سیاسی نے سوچنے کا یہ ڈھب
کسی کا کوئی عقیدہ ہو ۔ کوئی ہو مذہب
نہ بننے پائے یہ باہم منافرت کا سبب
تعلقات میں مذہب سے ہٹ کے بات کرو
سیاسیات میں چاہو تو ڈٹ کے بات کرو

(۵)

انھیں روابطِ باہم دگر کے زیرِ اثر
غریب قوموں نے بیچی متاعِ فکر و نظر
بنامِ آدمیت آئے لے کے صاحبِ زر
وہ نقد سب کی نظر جم کے رہ گئی جن پر
ہزار رنگ کے جلووں میں کھو گئیں آنکھیں
چمک سے ان کی چکا چوند ہو گئیں آنکھیں

(۶)

تھی اب یہ فکر کہ یہ سب تخی ۔ یہ اُن داتا
ہمارے دین کے پیرو نہ آشنائے ولا
برائے نام ہے مذہب سے کوئی وابستا
کسی نے توڑ لیا ہے خدا سے بھی رشتا
کہیں عقیدہ و مسلک انھیں خفا نہ کرے
یہ بت ملول ہوں عشاق سے ۔ خدا نہ کرے

(۷)

عجیب منزل دشوار تھی یہ فکر مفاد
کہ باغبان ہو ناخوش نہ ہو خفا صیاد
کہا سیاست زر نے کہ جھولیاں آباد
ضمیر سر جو اٹھائے ۔ ضمیر مردہ باد
جو مصلحت سے بھری ہوں وہ تھیلیاں لاؤ
ضمیر و مسلک و مذہب کو کیوں یہاں لاؤ

(۸)

ادھر وہ حلقۂ دانشوران دہر پسند
جو اک عقیدۂ الحاد کے عقیدت مند
وہاں سے ڈلتے تھے طائر خرد پہ کمند
جہاں تھیں فکر کی مذہب اساس راہیں بند
یہ اقتضائے سیاست تھا دیں سے عار انھیں
یہ زعم تھا کہ ہے انسانیت سے پیار انھیں

(۹)

وہ اپنے دین سیاست کے عام کرنے کو
اٹھے یہ کہہ کے کہ دنیا کو فکر تازہ دو
وہاں جہاں میں جہاں غربت و جہالت ہو
بجائے دین کے انسانیت کی بات کرو
کہو کہ جتنے بھی انساں ہیں ۔ بھائی بھائی ہیں
ز روئے نسبت آدم سب اک اکائی ہیں

(۱۰)

کہو کہ دین کی بنیاد ہے تعصب پہ
جبھی تو آج جو ہر سمت آرہا ہے نظر
فساد و بغض و عداوت عناد و فتنہ و شر
یہ آدمی پہ ہے مذہب کی قوتوں کا اثر
بشر کو تنگ نگاہی یہی سکھاتا ہے
خدا کے نام پہ انسان کو لڑاتا ہے

(۱۱)

جہان نو کے وسیع النظر بشر کے نام
ہم آج آئے ہیں انسانیت کا لے کے پیام
ہمارے دین سیاست میں کوئی رب ہے نہ رام
ہماری فکر کا مسلک ہر آدمی پہ سلام
کسی کو کوئی نہ سمجھے کبھی غلام اپنا
یہی پیام ہے ہر آدمی کے نام اپنا

(۱۲)

بڑا حسین تصور ہے یہ بشر کے لیئے
مگر ہے شرطِ وفا ہر گروہ انساں سے
نہ اختلافِ عقائد سے اس میں فرق آئے
خلوصِ فکر ہمیشہ بروئے کار رہے
اگر نظر سے نہاں یہ اصول اساسی ہیں
برابری کے یہ دعوے فقط سیاسی ہیں

(۱۳)

یہ فکر جس کی بِنا ہے سیاست دنیا
ہے اہلِ حق کے لیئے اک کھلا ہوا دھوکا
جہاں میں دین و شریعت سے اور بڑھ کے بھلا
ہے قدرداں کوئی انسانیت کی قدروں کا
اگر حقیقتِ مذہب نہ درمیاں ہوتی
تو بزمِ دہر میں انسانیت کہاں ہوتی

(۱۴)

ہے امتیاز سے انسانیت اگر عاری
صفت ہے اس کی مساوات ، عدل ، غم خواری
جہاد فقر سے منہم ، سخاوت جاری
تو لے کے آیا ہے مذہب یہ نعمتیں ساری
وہ ایک بوند ہے اور بحرِ بے کراں مذہب
کہاں تصور انسانیت ، کہاں مذہب

(۱۵)

یہ کائنات جو ہے وسعتوں میں لامحدود
ہے اس کا چھوٹا سا اک جزو آدمی کا وجود
مگر ہے دو جہتوں سے بشر کی ہست و بود
جو ایک سمت ہیں بندے تو اک طرف معبود
جو لوگ دم یہاں انسانیت کا بھرتے ہیں
وہ صرف ایک ہی رشتے کی بات کرتے ہیں

(۱۶)

بقول ان کے اہم ہیں تمدنی رشتے
کہ بس سماج ہی سب کچھ ہے آدمی کے لیئے
غرض ہے صرف رواداری و اخوت سے
ہیں اس کے ساتھ ہی کچھ حریت کے بھی نعرے
یہ بات ٹھیک بھی ہے ظلم کے خلاف بھی ہے
مگر خدا کی خدائی سے انحراف بھی ہے

(۱۷)

نظر میں ان کی اہم زہد ہے نہ ہے کردار
نہ علم و فضل، نہ عدل و صداقت و ایثار
نہ حق شناس نگاہیں، نہ حق پسند شعار
جہاد نفس کسوٹی نہ ق رسی معیار
فقط شعور سیاسی ہے فیصلہ ٹھہرا
عمل ہر ایک کا ذاتی معاملہ ٹھہرا

(۱۸)

ادھر یہ نعرۂ انسانیت اُدھر مذہب
جو کچھ سیاست دنیا کی مصلحت کے سبب
تو کچھ جہالت و ملائیت کے سہہ کے تعب
بنا ہے اب ہدف دشمنان مسلک رب
محیط ظاہر و باطن ہے نظم و ضبط اس کا
خدا سے بھی ہے ، خدائی سے بھی ہے ربط اس کا

(۱۹)

خلوص و عشق و وفا کا پیام ہے مذہب
حیات حق کا مکمل نظام ہے مذہب
سیاستوں سے بلند اک مقام ہے مذہب
درا صل فرض شناسی کا نام ہے مذہب
دلوں میں درد کا احساس یہ جگاتا ہے
یہ اہل دل کی طرح سب کے کام آتا ہے

(۲۰)

بشر نے پائی ہیں مذہب سے جراتیں کیا کیا
جفا و جور کو دی ہیں ہزیمتیں کیا کیا
صنم کدوں کی بگاڑی ہیں صورتیں کیا کیا
روایتوں سے ہوئی ہیں بغاوتیں کیا کیا
رخ حیات بشر کا نکھار ہے مذہب
عجیب نعمت پروردگار ہے مذہب

(۲۱)

جب اس بشر نے قدم اس زمیں پہ رکھا تھا
سوائے جامۂ فطرت اسے نصیب تھا کیا
نہ پیرہن کوئی تہذیب اور تمدن کا
نہ معرفت کا عمامہ، نہ آگہی کی قبا
بشر کو جامۂ انسانیت پنھانا تھا
کہ آدمی کو ابھی آدمی بنانا تھا

(۲۲)

جہانِ نو میں بشر کی یہ پہلی منزل تھی
محیط تھی رہِ انسانیت میں تاریکی
نہ کوئی بزم و ادارہ نہ انجمن کوئی
نہ بر بنائے سیاست بشر سے ہمدردی
نہ اسلحوں کی دھمک امن کی خدائی میں
نہ سیم و زر کی کھنک کاسۂ گدائی میں

(۲۳)

بشر کو خلق کیا تھا خدائے برحق نے
اسی نے اس کی ہدایت کے انتظام کیے
برائے تربیتِ فکر انبیاؑ بھیجے
جنھوں نے ذوقِ تمدن کے اس کو درس دیئے
ہوا تھا علم مقدم جو آدمی کے لیئے
کیئے تھے لوح و قلم اس نے خلق اسی کے لیئے

(۲۴)

بڑا وسیع و ہمہ گیر تھا وہ حق کا نصاب
نہ جانے کتنے مضامین ، کس قدر ابواب
ہر ایک باب حیاتِ بشر کی ایک کتاب
ہر اک کتاب تھی انسانیت کا لبِ لباب
تھا اس نصاب کا مقصد حق آشنا کرنا
بشر کو عظمتِ انسانیت عطا کرنا

(۲۵)

تھی اس نصاب کی وحدت میں علم کی کثرت
علومِ منزلتِ رب ، مقامِ عبدیت
شہود و شاہد و مشہود و غائب و غیبت
خدا کی معرفت ، انساں کی اپنی ذات کا علم
فقط زمیں کا نہیں ، ساری کائنات کا علم

(۲۶)

نصابِ مذہبِ حق کی کتاب کے عنواں
وفا ، خلوص ، ادب ، نظم ، ضبط ، صبر ، ایماں
یقین ، صدق ، عبادت ، خود آگہی ، عرفاں
جہادِ نفس ، شجاعت ، جہاد سیف و زباں
معاشیات و زر و اقتصاد کی باتیں
حقوق رب کی ، حقوقِ عباد کی باتیں

(۲۷)

علیؑ سے دین کا مطلب کسی نے جب پوچھا
ملا جواب بصد اختصار صرف اتنا
بغیرِ چوں و چرا پیرویٔ حکمِ خدا
تمام خلق کو پیغام پھر محبت کا
ہے بند کوزہ میں دریا، جواب نقطے میں
کہ جس طرح سمٹ آئے کتاب نقطے میں

(۲۸)

مگر جہاں میں مذاہب نہیں ہیں سب برحق
کئی کے راہبروں نے پڑھا نہ حق کا سبق
خدا سے ان کا نہیں کوئی رابطہ مطلق
ہے دن کو لب پہ جو حق حق تو رات کو ہو حق
نہ حق سے ان کو غرض رات کو، نہ کچھ دن کو
کئی نے مل کے بہ اجماع چن لیا جن کو

(۲۹)

نبوت اور امامت کسی کو تم کیوں دو
ہے اختیار سے باہر اگر کسی کو چنو
غلط ہے پھر بھی گر اجماعِ کلِ انساں ہو
یہ منصب ان کے خدا مصطفیٰ کرے جن کو
کسی زمانے میں انساں نے یہ غضب نہ کیا
کبھی نبی کوئی بندوں سے منتخب نہ کیا

(۳۰)

کبھی عوام کی جانب سے یہ چنے نہ گئے
کسی بھی قوم نے رہبر یہ منتخب نہ کیئے
یہ اور بات کہ کچھ بن گئے نبی خود سے
کچھ اور بڑھ کے خدائی کے کر گئے دعوے
سب ان کے مذہب و دین و اصول جھوٹے ہیں
بنے ہوئے یہ خدا و رسول جھوٹے ہیں

(۳۱)

یہاں مراد ہے مذہب سے وہ طریقِ حیات
جو ہو خدا کی طرف سے بشر کو راہِ نجات
ہوں جس سے آئینۂ انسانیت کی جملہ صفات
اس آئینہ میں جھلکنے لگے خدا کی ذات
جہان سے جس کے گلستاں میں پھول آئے ہیں
وہ جس کو لے کے خدا کے رسول آئے ہیں

(۳۲)

یہ اہتمامِ ہدایت خدا کو تھا منظور
دیا جو پہلے بشر کو زمیں پہ حکمِ ظہور
اسی کو اپنی خلافت پہ کر دیا مامور
بس اب خدا کی طرف سے یہ بن گیا دستور
ہدایتِ بشری انتظامِ قدرت ہے
ملے جو حق سے بلافصل وہ خلافت ہے

(۳۳)

زمیں پہ صبح کی پہلی کرن تھی جس کی جھلک
ہے آج تک اسی خورشید دین حق کی چمک
اسی کے دائرہ حق میں ہیں سما و سمک
وہی ہے سلسلہ آدمؑ سے لے کے خاتمؐ تک
اسی نے راہ تمدن ہمیں دکھائی ہے
اسی نے ہم کو یہ انسانیت سکھائی ہے

(۳۴)

نگاہِ حق میں ہے مذہب تو بس یہی اسلام
سلامتی کا جو دنیا کو دے رہا ہے پیام
ہر اک نبیؑ نے کیا ہے اسی پیام کو عام
یہی پیام ہے ہر عہد کے بشر کے نام
اسی پیام میں انسانیت کی عظمت ہے
خدا کی دی ہوئی نعمت، خدا کی نعمت ہے

(۳۵)

پیام یہ ہے کہ خالق ہے واحد و یکتا
نہ وہ شریک، نہ کوئی شریک ہے اس کا
سوائے اس کے نہ معبود دوسرا، نہ خدا
ہر اک بشر ہے اس لاشریک کا بندا
بنائے دوستی توحید پہ اگر ہوگی
وہ قومیت کی حدوں سے وسیع تر ہوگی

(۳۶)

خدائے واحد و یکتا و لاشریک کا ڈر
نکال دیتا ہے دل سے تمام خوف و خطر
ہو بارگاہِ خدا میں جو سجدہ ریز بشر
وہ سر جھکا نہیں سکتا کسی کی چوکھٹ پر
یہ ایک سجدہ جو انساں پسند کرتا ہے
یہی بشر کی خودی کو بلند کرتا ہے

(۳۷)

اسی پیام کا اک جزو ہے عدالت بھی
نظامِ عدل پہ قائم ہے زندگی ساری
یہی ہے شرط اساسی نظامِ مذہب کی
خدا ہے عادل و منصف ۔ وہ ظلم سے ہے بری
جو ظالموں میں ہیں ۔ رحمت سے بہرہ مند نہیں
خدا کو ظلم کسی حال میں پسند نہیں

(۳۸)

عطا جو کی تھی خلافت زمیں کی حق نے
خلیلِ حق نے یہ پوچھا تھا اپنے خالق سے
دیا ہے تو نے جو یہ عہدۂ جلیل مجھے
اب اس میں حکم ہے کیا میری ذریت کے لیئے
زروئے عدل تحمل نہ تھا جو سہل اس کا
ملا جواب کہ ظالم نہ ہوگا اہل اس کا

(۳۹)

یہ قولِ حق ہے ، اسی کو بنائیے معیار
اگر خلافتِ حق کا ہو کوئی دعوےدار
تو پہلے دیکھیئے آپ اس کی سیرت و کردار
پھر اس کے بعد کوئی فیصلہ نہیں دشوار
کسوٹی اس کی نہ اجماع ہے ، نہ بیعت ہے
سندِ خلافتِ حق کی فقط عدالت ہے

(۴۰)

نہیں پسند جو مذہب کو ظلم و زور و ضرر
کتابِ حق میں مذمت ہے اس کی سر تا سر
جہاں پہ آگیا قرآں میں ذکرِ فتنہ و شر
وہاں " اشدّ من القتل " کہہ دیا کھل کر
اسی کتاب میں " لا تفسدوا فی الارض " بھی ہے
اسی کتاب میں ظالم پہ لعن فرض بھی ہے

(۴۱)

یہ وہ کتاب ہے لائے جسے رسولِ انام
رسول وہ جسے کہتی ہے روحِ عصر سلام
پھر اس کے بعد امامت ہے ایک جزوِ پیام
جو ہے بعدِ رسالت محافظِ اسلام
معاد آخری جزوِ پیامِ باری ہے
شک اس میں بھی ہے ، قیامت ابھی تو ساری ہے

(۴۲)

یہ دیں ہے فلسفۂ زندگیٔ عدل نہاد
مٹانے آیا ہے دنیا سے جو عناد و فساد
ہیں ایک دین کے چھ رکن از رہِ تعداد
نماز و روزہ و حج و زکوٰۃ و خمس و جہاد
انھیں سے سیرت و کردار کی طہارت ہے
جہاں ہو ان پہ عمل ۔ وہ زمین جنت ہے

(۴۳)

نماز ، پیشِ خدا سر کے ساتھ دل کا جھکاؤ
نماز ، حسنِ ازل کی طرف نظر کا کھنچاؤ
نماز ، قلب و زباں کا بہم خدا سے لگاؤ
نماز ، فطرتِ خودسر میں عبدیت کا رچاؤ
نماز کبر کی رد ، عجز و انکسار کا نور
جبیں پہ مہرِ وفا ۔ دل میں کردگار کا نور

(۴۴)

نماز ، قول و قرار الست دہرانا
نماز ہی سے تو بندے نے رب کو پہچانا
نماز ، خلوت محبوب میں جگہ پانا
نماز ، جلوۂ نورِ خدا میں کھو جانا
نماز یوں نہ ہوئی گر تو معتبر نہ ہوئی
کہ تیر پاؤں سے کھینچا گیا ، خبر نہ ہوئی

(۴۵)

وہ جس کی جائے ولادت بنے نماز کا گھر
کرے نماز میں جو ساری ساری رات بسر
مگر بہ مرضیٔ رب ، بہرِ حفظِ پیغمبر
نمازِ عشق پڑھے سو کے فرشِ ہجرت پر
اسی کو اصل میں طاعت گزار کہتے ہیں
اسی کو عابدِ شب زندہ دار کہتے ہیں

(۴۶)

نماز وہ جو عبادت کا مدعا ہو جائے
نماز وہ ، سرِ مقتل بھی جو ادا ہو جائے
نماز وہ کہ نمازی بھی خود فدا ہو جائے
نماز وہ جو شہادت کا منتہا ہو جائے
ہو زیرِ تیغِ قضا ، زندگی طراز نماز
نفس کی آمد و شد کی صدا نماز نماز

(۴۷)

نماز ہی کی طرح رکنِ دیں ہے روزہ بھی
مآل جس کا ہے انسانیت سے ہمدردی
یہ بھوک پیاس کی تکلیف دے کے چند گھڑی
جگاتا رہتا ہے احساسِ دردِ ناداری
جہادِ نفس بھی ، ایثار بھی ہے ، فرض بھی ہے
خدا کا حکم بھی ہے ، عبدیت کا قرض بھی ہے

(۴۸)

مگر قبول تو روزہ وہی ہے پیشِ خدا
اِدھر ہو ساعتِ افطار، اُدھر یہ آئے صدا
کہ اک فقیر و یتیم و اسیر ہے بھوکا
تو دے کے روٹیاں روزے پہ رکھ لے خود روزہ
سخا ہو ایسی کہ حاتم کا دل بھی جل جائے
عطا ہو وہ کہ سندِ ہل اتیٰ کی مل جائے

(۴۹)

ہے رکنِ سومِ اسلام حجِ بیتِ اللہ
نہ رنگ و نسل، نہ قوم و وطن کو جس میں ہے راہ
عمل، لباس، مقاصد، سب ایک پیشِ نگاہ
جو اس حقیقتِ مذہب اساس پہ ہیں گواہ
سیہ سفید و بعید و قریب ایک سے ہیں
نگاہ دیں میں امیر و غریب ایک سے ہیں

(۵۰)

نظامِ زر کے لیئے خمس بھی زکوٰۃ بھی ہے
نبیؐ کی آلؑ کا حق ہے تو حق کی بات بھی ہے
فلاحِ ذات بھی ہے، قوم کی حیات بھی ہے
یہ حلِ مسئلۂ اقتصادیات بھی ہے
اسی سے دجلۂ غربت عبور ہوتا ہے
اسی سے قوم کا افلاس دور ہوتا ہے

(۵۱)

زکوٰۃ و خمس ہے تقسیمِ زر کا ایسا نظام
مٹا دے ملتِ بوذز سے بےزری کا جو نام
نہ اس پہ صدقے کی تہمت، نہ بھیک کا الزام
یہ حق ادا ہو تو ہو قوم کا بخیر انجام
بحکمِ شرع جو تقسیمِ زر شعوری ہو
معاشرے کی ہر اک احتیاج پوری ہو

(۵۲)

جہاد آخرِ ارکان دیں بشرط و شروط
نظامِ عدل سے اس کے اصول میں مربوط
حدِ دفاع سے آگے کھنچے ہیں اس کے خطوط
اسی سے قلعۂ اسلام ہو گیا مضبوط
اسی کو ہیبتِ باطل شکار کہتے ہیں
اسی کو قوت پروردگار کہتے ہیں

(۵۳)

جہاد، جبر و تعدی سے صبر کی پیکار
جہاد، رزم گہ حق میں تیغ کی جھنکار
معاشرے کی حفاظت کو فرد کا ایثار
زباں پہ حق کی گواہی، گلے پہ تیغ کی دھار
جہاد عہد وفا رب مشرقین کے ساتھ
جہاد شانِ وغا جرأت حسین کے ساتھ

(۵۴)

جہاد نشۂ ایماں ۔ جہاد حق کی ترنگ
جہاد موت کے پردے میں زندگی کی امنگ
جہاد شیشۂ پندار شر پہ ضربتِ سنگ
جہاد ظلم و ستم کے خلاف عدل کی جنگ
جو تھے تلے ہوئے حق سے فساد کرنے کو
حسین اٹھے تھے انھیں سے جہاد کرنے کو

(۵۵)

وہ زر پرست ، وہ انساں کے دشمنِ جانی
ملوکیت کے وہ بندے ، وہ ظلم کے بانی
خود اپنی ذات کے قیدی ، ہوس کے زندانی
خیال اسیر ۔ نظر کور ۔ عقل دیوانی
خدا کے دین کی ذلت شعار تھا ان کا
امیرِ شام ہی پروردگار تھا ان کا

(۵۶)

سیاہ فکر ۔ سیہ دل ۔ سیہ نظر شامی
رخوں سے جن کے عیاں قلب کی سیہ فامی
درندگی میں زبردست ۔ ظلم میں نامی
خلافِ حکمِ خدا کام ۔ نام اسلامی
نہ آدمی تھے ، نہ کردار میں وہ انساں تھے
جو نام کے تھے تو کس کام کے مسلماں تھے

(۵۷)

نہ علم و فضل ، نہ تقویٰ ، نہ سیرت و کردار
نہ لطف و رحم و مروت ، نہ شفقت و ایثار
جفا و جور و شقاوت میں بربر و تاتار
درندہ خو ، ستم ایجاد ، بھیڑیئے ، خوں خوار
غلام زینت دنیا کے زیب وزین سے تھے
یہ ایں صفات وہ بیعت طلب حسین سے تھے

(۵۸)

حسین عظمتِ انساں کا مہرِ تابندہ
حسین دہر میں اللہ کا نمائندہ
حسین ملکِ دلِ مصطفیٰ کا باشندہ
حسین دیں کا سہارا کل ، آج ، آئندہ
حسین جانِ عمل ، پیکرِ صداقت ہے
حسین حریتِ فکر کی علامت ہے

(۵۹)

حسین گوہرِ بطحا ، حسین درِ نجف
حسین وارثِ اوصاف ، مالکِ رف رف
حسین سلسلۂ پنجتن کی حد شرف
حسین پانچ صحیفوں کا آخری مصحف
ہر ایک قافلۂ عشق کا امام ، حسین
ہر ایک عہد میں انسانیت کا نام ، حسین

(۶۰)

حسین لعل و گہر ہیں ، یزید خاک و خزف
یہ ذوالفقار کے وارث ، وہ اہلِ ساغر و دف
یزید کفر کی جانب ، حسین حق کی طرف
حسین بعد محمدؐ کے سازشوں کا ہدف
یزید فطرتِ سفیانیت کا پیکر ہے
حسین تربیتِ مصطفیٰؐ کا جوہر ہے

(۶۱)

حسین دیکھتے کیسے ، بگڑ رہا تھا سماج
ملوکیت میں ڈھلا جا رہا تھا دیں کا مزاج
رذیل صاحبِ ثروت ، شریف تھے محتاج
سگانِ دہر بھی شیروں سے مانگتے تھے خراج
نبیؐ کی تھی یہ صدا ، میرے دل کے چین ، اٹھو
خدا کے دین کی فریاد تھی ، حسین ، اٹھو

(۶۲)

حسین گوشہ نشیں ، شاہِ دیں ، مگر بے کس
خدا کے شکر میں مصروف ایک ایک نفس
برائے رشتۂ جاں چند جَو کے لقمے بس
نہ اقتدار کی خواہش ، نہ مال و زر کی ہوس
اٹھے تو ملک نہ مال و منال کی خاطر
فقط تحفظِ حق کے سوال کی خاطر

(۶۳)

چلے تو قافلۂ اہلِ دل بھی ساتھ چلا
دلاورانِ علی ، ضیغمانِ شیرِ خدا
مخدراتِ طہارت ، رسولؐ کا کنبا
صغیر بن گئی ، ایک ، ایک ماہ کا بچّا
تڑپ کے رہ گئی صغراؑ بھی ساتھ جانے کو
اکیلی رہ گئی بیمار غم اٹھانے کو

(۶۴)

یہ حق کا قافلہ جب منزلِ شرف سے بڑھا
ہلالِ ماہِ محرم حسینؑ نے دیکھا
علی الصباح جو شہؑ نے وہاں سے کوچ کیا
کثیر فوج لیئے حرؑ نے راستہ روکا
بڑی خطا تھی کہ شبیرؑ کو ملال دیا
لجامِ توسنِ مولاؑ پہ ہاتھ ڈال دیا

(۶۵)

ادھر یہ حر کی جسارت ، ادھر یہ فوج کا حال
کئی پہر سے تھا پانی کی بوند بوند کا کال
زبانیں خشک ، کلیجوں میں آگ ، زیست وبال
دلوں میں حوصلۂ جنگ تھا نہ جوشِ جدال
کچھ ایسے وقت کی شبیرؑ کو تلاش نہ تھی
وگرنہ حرؑ کے لیئے کیا شکست فاش نہ تھی

(۶۶)

حسین سا بشریت نواز و دیں پرور
وقار و عظمت انسانیت کا پیغمبر
دلِ رسولِ خدا ، جانِ ساقیٔ کوثر
گوارا کرتا وہ دشمن کی تشنگی کیونکر
اب اس کے فیض کی رن میں سبیل جاری ہے
وہ جس کو دشمنِ جانی کی جاں بھی پیاری ہے

(۶۷)

یہ حکم بھائی کو ہے کوئی تشنہ لب نہ رہے
بشر تو کیا ہیں ، ہر اک جانور بھی ڈٹ کے پیئے
عدو ہی ، کوئی انسان پیاس سے نہ مرے
خود اپنے واسطے پانی بچے بچے نہ بچے
حسین کا یہ عمل آج بھی بتاتا ہے
یہ دین ہی ہے جو انسانیت سکھاتا ہے

(۶۸)

ہوا حسین کا جب کربلا میں حرؑ مہمان
نبی کے لال تھے خود تین دن سے تشنہ دہاں
قریب در کے گئی فاطمہؑ کی راحتِ جان
نظر جھکائے ، خجل ، شرمسار و اشک افشاں
کنیز حرؑ سے بصد احترام کہتی ہے
تمھیں نبیؐ کی نواسی سلام کہتی ہے

(۶۹)

وہ حُر جو حق کا مخالف تھا ایک دن پہلے
تھا ناشناس وہ انسانیت کی قدروں سے
ملی جو دین کی دولت حسین تک آ کے
وہ پائی منزلِ انسانیت کہ کیا کہیئے
وفاؤں کا سرِ مقتل جو امتحاں ٹھہرا
بجی دلیر تھا جو میرِ کارواں ٹھہرا

(۷۰)

حسین آئے تھے لے کر محبتوں کے پیام
مگر تلے تھے جفا پہ یزیدیت کے غلام
ابھی نمازِ سحر کو کھڑے ہوئے تھے امام
کہ حکمِ عام ہوا یہ برائے لشکرِ شام
ابھی سے دین پہ دنیا یہ تنگ ہو جائے
چلاؤ تیر کہ آغازِ جنگ ہو جائے

(۷۱)

اُدھر تھیں پاؤں میں نمرودیت کی زنجیریں
ادھر تھیں خوابِ خلیلِ خدا کی تعبیریں
اُدھر جفا کی ، ادھر تھیں وفا کی تصویریں
اُدھر سے تیر چلے ، اس طرف سے تکبیریں
انھوں نے راستہ امن و اماں کا بند کیا
انھیں نے عظمتِ یزداں کا سر بلند کیا

(۷۲)

اٹھے جہادِ وفا کو اب امیرِ عرب
صفیں جمانے چلے رن کو جاں نثار بھی سب
نسیے تلے ہوئے قدموں کا زیر و بم تھا غضب
قدم قدم سے ہم آہنگ نعرۂ - رب رب
نظر نظر کی تڑپ بجلیاں گراتی تھی
نفس نفس سے صدا یا علیؑ کی آتی تھی

(۷۳)

وہ کفر و حق کی لڑائی ، وہ خیر و شر کی ستیز
وہ ضیغموں کا جھپٹنا ، وہ بزدلوں کا گریز
وہ راکبوں کی جھجک ، مرکبوں کی وہ مہمیز
وہ دشت حشر بداماں ، وہ رن قیامت خیز
یہ بات عزتِ اجداد تک جو آئی تھی
غضب کی جنگ تھی ، گھمسان کی لڑائی تھی

(۷۴)

ادھر عدو نے بپا عرصۂ جدال کیا
حسینیوں کے لہو سے زمیں کو لال کیا
جفا و جور سے انسان کا یہ حال کیا
حرام کر دیا پانی ، لہو حلال کیا
خیامِ آلِ نبیؐ تک نہ جا سکا پانی
ستم کی حد ہے کہ اصغرؑ نہ پا سکا پانی

(۷۵)

یہ کربلا کوئی اک حادثہ نہیں تھی حضور
بروئے کار تھا پیہم ملوکیت کا شعور
تھا روزِ بدر سے باطل کے قلب میں ناسور
عناد و بغض دلوں میں تھا اس قدر بھرپور
اسی طرح ہدف خنجر و سناں ہوتے
حسینؑ کیا ہیں ، محمدؐ بھی گر یہاں ہوتے

(۷۶)

حسینؑ خوب سمجھتے تھے اس حقیقت کو
مگر تھی فکر کہ دعویٰ ہو تو دلیل بھی ہو
ملوکیت کو بہر طور بے نقاب کرو
کسی بھی رخ سے اسے عذر کا نہ موقع دو
جبھی تو بھیج دیا رن میں اپنا لال ایسا
نبیؐ زمانے کو یاد آ گئے ، جمال ایسا

(۷۷)

گیا جو رن میں شبیہِ رسول عرش جناب
درود پڑھنے لگے دیکھ کر وہ خانہ خراب
مگر ستم بھی وہ ڈھائے کہ جن کی حد نہ حساب
ملایا خاک میں تصویرِ مصطفیٰؐ کا شباب
بن نمیر نے ماری سناں جو سینے میں
نبیؐ کی قبر لرزنے لگی مدینے میں

(۷۸)

سناں نے جب دلِ اکبر کے کر دیئے پارے
بجائے فتح کے فوجِ لعیں نے نقارے
پسر کے سینہ سے چھوٹے لہو کے فوارے
پکڑ کے رہ گیا دل باپ درد کے مارے
خبر ہوئی دلِ زینب کو آپ سے پہلے
پھوپھی پہنچ گئی لاشے پہ باپ سے پہلے

(۷۹)

چڑھا ہوا تھا ابھی رن میں جنگ کا پارا
حسن کے لال نے ازرق سے دیو کو مارا
علی کے شیر نے ساحل جھپٹ لیا سارا
عدو تبسمِ اصغر سے بے طرح ہارا
امام رن پہ چڑھے تو عدو سے چڑھ کے لڑے
حسین تشنہ لبی میں علی سے بڑھ کے لڑے

(۸۰)

مگر جہادِ حسینی فقط دفاعی تھا
کسی کو اذن نہ تھا قتلِ عام کرنے کا
مقابلے پہ اگرچہ تھے دشمنانِ خدا
مگر بس اتنی اجازت، دفاعِ ہو اپنا
ثبوتِ اہلیتِ فتح سر بسر دے دیں
تو سربلندیٔ مذہب کو اپنا سر دے دیں

(۸۱)

کسے مجال کہ حکمِ امام رد کر دے
بصدقِ دل سرِ تسلیم خم کیئے سب نے
لڑے تو یوں وہ وفائی حدود ہی میں لڑے
نہ دیں پہ حرف ، نہ انسانیت پہ آنچ آئے
وہ جنگ کی کہ عدو بوکھلا کے بھاگ اٹھا
پھر اس کے بعد شہادت کا شوق جاگ اٹھا

(۸۲)

سبھی کو فکر کہ قربان کردیں زر . گھر . سر
خدا کی راہ میں سب کچھ لٹا دیں جی بھر کر
جبھی تو وہب ہوئے جب نثار سروز پہ
کھڑی تھی خیمہ کے در پہ شہید کی مادر
قضا کے پنجے میں اس نونہال کو دیکھا
شہید ہوتے ہوئے اپنے لال کو دیکھا

(۸۳)

یہ کہہ کے ماں کی طرف سر وہ پھینکا قاتل نے
امیرِ شام کا تحفہ سمجھ کے رکھ لے اسے
کیا نہ پیار ، نہ اس کو لگایا سینے سے .
پھر اس کو پھینک دیا ماں نے رن میں یہ کہہ کے
تمہیں رکھو کہ یہ صدقہ شہِ امام کا ہے
مرا نہیں ہے یہ ہدیہ خدا کے نام کا ہے

(۸۴)

ادھر وہ جور و جفا و ستم ، وہ بے رحمی
ملے گی جس کی نہ تاریخ میں مثال کوئی
وہ قتلِ آلِ محمدؐ ، وہ شامیوں کی خوشی
نبیؐ کے گھر میں عزا ، ان کے گھر میں عید آئی
بھری پڑی تھی جو کل کربلا درندوں سے
کوئی بچا نہ ان انساں نما درندوں سے

(۸۵)

ہر اک جفا پہ ادھر شکر کی ادا ایسی
کسی نے صبر کی دیکھی نہ انتہا ایسی
خدا کی راہ میں دی جان تک ، سخا ایسی
پہنچ کے نہر پہ پیاسے رہے ، وفا ایسی
بچا سکے نہ جو مشکیزہ نہر سے لا کے
وہ ہاتھ پھینک دیئے بازوؤں سے کٹوا کے

(۸۶)

جب آئے عونؑ و محمدؑ کے دشت سے لاشے
بصد خلوص کیئے ماں نے شکر کے سجدے
بہن کے پاس جو پرسے کو شاہِ دیں آئے
کہا یہ بیٹوں کی لاشوں پہ ماں نے خوش ہو کے
زہے نصیب ، شہِ مشرقین آئے ہیں
اٹھو سلام کو بچو حسینؑ آئے ہیں

(۸۷)

پھر آیا لاشۂ قاسمؑ بھی بعدِ پامالی
نہ لاش لاسکے عباسؑ کی شہِ عالی
ربابؑ کی بھی ہوئی گود عصر تک خالی
مگر حسینؑ نے بھی اپنی بات منوالی
بھلا یزید کہاں ، شاہِ مشرقین کہاں
سوالِ بیعتِ لاحق کہاں ، حسینؑ کہاں

(۸۸)

جب اہلِ دیں میں ہر اک دینِ حق کے کام آیا
عدو کی سمت سے پھر جنگ کا پیام آیا
بہن سے لے کے رضا رن میں اب امامؑ آیا
ہزاروں خون کے پیاسوں میں تشنہ کام آیا
نشستِ رخش پہ دلدلؑ سوار کی صورت
کمر میں تیغ شہِ ذوالفقار کی صورت

(۸۹)

تمام کرنا تھی حجت جو شہؑ کو آخر کار
عدوئے دیں کو نصیحت کیا کیئے سرکار
مگر تلی تھی جفاؤں پہ قومِ ناہنجار
تمامؑ ہو گئی حجت تو کھینچ لی تلوار
کھنچی تو تن کے چلی تیوریاں چڑھا کے چلی
لپک کے طیش میں بل کھا کے تلملا کے چلی

(۹۰)

غضب کی تیغ تھی تیغ حسین ابن علی
علی کے گھر میں جو کفار کے لہو سے پلی
نہ منتوں سے رکی وہ نہ منتوں سے ٹلی
چلی تو قہر خدائے جلیل بن کے چلی
وہ ہول جول مچی ہاتھ پاؤں پھول گئے
ملک بھی نادِ علی پڑھتے پڑھتے بھول گئے

(۹۱)

نیام میں تھی تو مشغول یہ درود میں تھی
کھنچی جو رن میں، عبادات کے حدود میں تھی
عدو کے سر پہ جو بیٹھی تو یہ قعود میں تھی
جو سر سے آئی زمیں پر تو پھر سجود میں تھی
سجود اس کا نہ کیوں وجہِ امتیاز بنے
نماز کو پرِ جبریل جانماز بنے

(۹۲)

جنود شام میں ہیبت بھی اس کی، دھاک بھی ہے
عدو سے جھک کے یہ ملتی ہے، پر تپاک بھی ہے
مزے سے چپتی ہے خوں مے کشی سے باک بھی ہے
لہو سے غسل بھی کرتی ہے اور پاک بھی ہے
یہ رازدانِ شریعت کمال کرتی ہے
حرام کو کھلے بندوں حلال کرتی ہے

(۹۳)

خلش میں خارِ حسد ہے، جلن میں نارِ سعیر
چبھن میں نشترِ ابروئے شاہِ خیبرگیر
جبینِ دشمنِ ایماں پہ موت کی تحریر
ہمارے ہاتھ میں آئے تو زندگی کی لکیر
نصیبِ دشمنِ اسلام میں رقم تھی بھی
ازل میں کاتبِ تقدیر کا قلم تھی بھی

(۹۴)

سوادِ شام میں چمکی رخِ سحر کی طرح
دلوں پہ بیٹھ گئی نقشِ کالحجر کی طرح
ہوا میں اڑتی تھی فطرس کے بال و پر کی طرح
تمام فوج میں پھرتی تھی اپنے گھر کی طرح
رکے جو خود و سپر سے وہ اس میں نوک نہ تھی
کہیں یہ اس کے لیئے کوئی روک ٹوک نہ تھی

(۹۵)

ادھر یہ تیغ، اُدھر راہوارِ صرصردم
حشم میں اپنے کو رف رف سے جانتا تھا نہ کم
جبھی تو ناز سے رکھتا نہ تھا زمیں پہ قدم
تھا دعوے دار کہ بس وارثِ براق ہیں ہم
ثبوت ساتھ ہے جس سے بڑا دلاسہ ہے
کہ پشت پر شہِ معراج کا نواسہ ہے

(۹۶)

اسدجلالت و ضیغم نگاہ و برخصال
جھپٹ عقاب کی ، رم آہوؤں کا ، شیر کی چال
تھی روندنے میں مہارت ، جھنجھوڑنے میں کمال
وہ شیر دل تھا کہ گھوڑوں کو کر دیا پامال
فرس کے سائے سے منھ دشمنوں کا کالا تھا
جو اس کے منھ پہ چڑھا ، موت کا نوالا تھا

(۹۷)

یہ جاں لڑا کے لڑا جانِ حیدرِ کرار
کہ رن میں شور مچا ، رحم کیجیئے سرکار
سنی جو نفس نے ہاتف سے ارجعی کی پکار
تو بس - رضا بالقضا کہہ کے روک لی تلوار
ہوا ہجوم یداللہ کی نشانی پہ
سپاہ ٹوٹ پڑی فاطمہؑ کے جانی پہ

(۹۸)

وہ اک حسینؑ غریب اور لاکھ دشمنِ جاں
کوئی چبھوتا ہے خنجر تو کوئی نوکِ سناں
کوئی لگاتا ہے پتھر تو کوئی گرزِ گراں
زمیں پہ خونِ محمدؐ کی ندیاں ہیں رواں
بتولؑ دیکھ رہی ہیں لہولہاں اس کو
جو بس چلے تو کلیجے میں رکھ لے ماں اس کو

(۹۹)

امامِ وقت کو کر کے شہیدِ تیغِ جفا
سپاہِ شام نے شہ کے خیام کو لوٹا
گہر سکینہؑ کے کھینچے ، اتارنا کیسا
تڑپ کے درد سے چلا اٹھی وہ بائے چچا
بس اس خطا پہ ستم اور بھی وہ ڈھانے لگے
طمانچے مار کے بچی کو چپ کرانے لگے

(۱۰۰)

اسیر ہو کے گئے جب حرمؑ سوئے دربار
وہاں بھی موردِ تحقیر دین اور دیندار
وہی یزید وہی اس کی پستیٔ کردار
وہی سیاست باطل ملوکیت کا شعار
خدا کے دیں کا تمسخر ، کتاب کی تذلیل
حسینؑ کیا کہ رسالت مآبؐ کی تذلیل

(۱۰۱)

عجیب طرح کا دربار میں تھا ظلم و ستم
تھے مجرموں کی طرح بے کس و اسیر حرمؑ
یزید تختِ حکومت پہ تھا بہ جاہ و حشم
سرِ حسینؑ تھا طشتِ طلا میں زیرِ قدم
شہیدِ ظلم پہ یہ ظلم نابکار ، افسوس
لبِ حسینؑ پہ چوبِ ستم ، ہزار افسوس

(۱۰۲)

ستم یہ باپ پہ دیکھا گیا نہ عابدؑ سے
کہا یزید سے ، ظالم یہ کیا کیا تو نے
چھڑی حسینؑ کے لب سے ہٹا خدا کے لیئے
یہ لب وہی تو ہیں جن کو رسولؐ چومتے تھے

حساب ظلم کا یومِ حساب کیا دے گا
نبیؐ کو حشر میں ظالم جواب کیا دے گا

(۱۰۳)

کہا یزید نے ، کیسے رسولؐ ، کیسا دیں
خوش آج ہوں گے وہ مقتول بدر تھے جو حزیں
علیؑ کے مارے ہوئے کیوں نہ پائیں اب تسکیں
ذلیل ہو گئے جب تم خدا پہ کر کے یقیں

کہا یہ فخر سے عابدؑ نے ، شکر نعمت ہے
خدا کی راہ میں ذلت ہماری عزت ہے

(۱۰۴)

وہ بولا ، مذہب و وحی و کتاب و حکم اللہ
یہ سب کا سب بنی ہاشم کا ڈھونگ تھا واللہ
ادھر یہ دیں کی تھی تکذیب اور لب گمرہ
ادھر اذاں نے کہا لا الٰہ الا اللہ

اِدھر یہ فتح کا اعلان اہل دیں کے لیئے
اُدھر یہ منھ پہ طمانچہ تھا اس لعیں کے لیئے

(۱۰۵)

یہ چوٹ کھائی جو اب اس ذلیل و ظالم نے
دیا یہ حکم کہ عابدؑ کو کوئی قتل کرے
یہ سن کے آ گئیں زینبؑ امامؑ کے آگے
کہا کہ پہلے مجھے قتل کر خدا کے لیئے
امام دیں ہے رسولؐ خدا کا جانی ہے
یہ میرے بھائی کی بس آخری نشانی ہے

(۱۰۶)

سکینہؑ سن کے یہ بھائی سے دوڑ کے لپٹی
رسن گلے کی اچانک کھنچی تو چیخ اٹھی
پدر کے سر کی طرف ہاتھ اٹھا کے یہ بولی
قسم ہے آپ کو بابا میری محبت کی
مجھے چھڑاتے ہیں ظالم یہ میرے بھائی سے
مرے چچا کو بلا دیجیئے ترائی سے

(۱۰۷)

یزید بولا، ہے الفت حسینؑ کو تم سے
کہا کہ سینہ پہ اپنے مجھے سلاتے تھے
وہ بولا، اچھا تو سر خود سے گود میں آئے
پکاری باپ کی جانب وہ ہاتھ پھیلا کے
یہ امتحاں ہے نیا غم کی مبتلا کے لیئے
ہماری گود میں آ جائیے خدا کے لیئے

(۱۰۸)

یہ سن کے طشت سے اٹھ کر سرِ حسین چلا
چہیتی بیٹی کی گودی میں بڑھ کے آ پہنچا
خوشی سے اس نے پدر کے لبوں کو چوم لیا
مگر سکینہ نے زنداں میں جب یہ سر پایا
وہاں غضب ہوا ساحر، گزر گئی بچی
لبوں کو چوم کے بابا کے مر گئی بچی

قطعہ

گردشِ وقت نے ہر چیز کو پلٹایا ہے
راہِ گم کردہ نے منزل کا پتہ پایا ہے
بڑھ کے سینے سے لگا لیجئے حُر کو مولاؑ
شام کا بھولا ہوا صبح کو گھر آیا ہے

مرثیہ

قطب شاہ سے ساحر تک

تعدادِ بند...... ۱۰۳

بیاں اپنا

برصغیر کے مشہور خانوادۂ علم و ادب یعنی خاندانِ اجتہاد کے ایک نامور فرد نواب مولوی سید اصغر حسین صاحب فاخر اعلی اللہ مقامہٗ ایک مانے ہوئے شاعر اور اتنے بلند مرتبہ مرثیہ گو تھے کہ خاندانِ انیس میں ان کو احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا کثیر التلامذہ اور صاحبِ دواوین تھے۔ کم سے کم پانچ دیوان غزلیات کے شائع ہوئے۔ ہر صنفِ سخن پر قادر تھے۔ زیادہ توجہ غزل اور مرثیہ کی جانب تھی۔

لکھنؤ کے ایک اور باکمال ذی شرف شاعر نواب سید محمد ذکی علی صاحب ہاتف اعلی اللہ مقامہٗ کی صاحب زادی حضرتِ فاخر اعلی اللہ مقامہٗ کے پوتے نواب سید اختر حسین صاحب مصور اعلی اللہ مقامہٗ سے منسوب ہوئیں۔ یہ دونوں بزرگوار میرے محترم والدین ہوئے۔

۶ ستمبر ۱۹۳۱ء کو زیارتِ مقاماتِ مقدسہ کے سفر کے دوران کراچی میں اس دنیا میں قدم رکھا، بچپن ہی میں زیارات سے مشرف ہوا۔ ہجرت سے پہلے لکھنؤ ہی میں بسر ہوئی۔ وہیں سے میٹرک کا امتحان فرسٹ کلاس میں پاس کر کے کراچی آگیا۔ یہاں اسلامیہ کالج سے بی۔اے اور ایس۔ایم لا کالج سے قانون میں درجۂ اول کی سند لی۔ کراچی یونیورسٹی سے اردو میں ایم۔اے کیا۔ صنعتی اور مزدور قوانین کے ڈپلومہ کے امتحان میں پورے پاکستان میں اول آیا۔

لکھنؤ میں گھر کی ادبی فضا نے بچپن ہی میں ذوقِ شعری کو پروان چڑھایا۔ والدِ مرحوم کے علاوہ میرے دونوں چچا یعنی نواب سید افسر حسین صاحب افسر مدظلہ العالی اور نواب سید افخر حسین افخر مدظلہ العالی، پھوپھا یعنی کنور حسن عباس صاحب عباس مدظلہ العالی رئیس ٹانڈہ حتیٰ کہ والدۂ گرامی قدر اور بعض دوسری خواتین بھی شعر کہتی تھیں۔ تقریباً ہر روز شام کو ایک نشست ہوتی اور جس جس نے جو کچھ کہا ہوتا، وہ سنا دیتا۔ اس ماحول نے شعر کہنے پر مجبور کردیا۔ ابتداً اسلام سے کی اور اصلاح کے لیئے عم محترم لسان الشعرا مولوی سید اولاد حسین صاحب عرف مولوی للن صاحب شاعر اعلیٰ اللہ مقامہ کی خدمت میں پیش کیا۔ جب انھوں نے لکھنؤ کی سکونت ترک کی تو اس کے بعد جب تک لکھنؤ میں رہا، حسینی شاعر حضرت فضل نقوی مدظلہ العالی مدیر "نظارہ" سے اصلاح لیتا رہا۔ یہ دونوں بزرگوار حضرتِ فاخر اعلیٰ اللہ مقامہٗ کے بھانجے اور جانشین یعنی دعیلِ ہند حضرتِ ذاکر اعلیٰ اللہ مقامہٗ کے نامور فرزند اور شاعری میں ملک گیر شہرت کے مالک ہوئے۔ حضرتِ فضل نقوی مدظلہ العالی رشتہ میں میرے چچا بھی تھے اور پھوپھا بھی اور شاعری میں ایک انتہائی شفیق اور محبت کرنے والے استاد بھی۔ اگر ان کی مشفقانہ رہنمائی نصیب نہ ہوتی تو میری زندگی کا یہ باب شروع ہوتے ہی ختم ہوجاتا۔

کراچی آنے کے بعد تقریباً ۱۹۶۸ء تک شاعری کا سلسلہ منقطع رہا۔ بالآخر میرے ایک انتہائی کرم فرما اور اس عہد کے ایک بلند پایہ شاعر حضرتِ ظفر جون پوری مدظلہ العالی لکچرار کراچی یونیورسٹی نے بقول شخصے مار مار کر مجھ سے شعر کہلوانا شروع کیا۔ اس طرح تقریباً بارہ برس کے تعطل کے بعد میری شاعری کا دوسرا دور شروع ہوا۔ اس دور میں رہنمائی اور مشورۂ سخن کے لیئے شاعرِ آلِ محمدؐ حضرتِ نسیم امروہوی مدظلہ العالی سے استفادہ کیا۔ ان کی ذاتِ گرامی شعروادب خصوصاً مرثیہ کے میدان میں کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔

اس دوسرے دور میں بنیادی طور پر توجہ قصیدہ کی طرف رہی۔ ۱۹۷۵ء میں

علاوہ اور بزرگوں اور دوستوں کے اپنے ایک انتہائی شفیق اور محبت کرنے والے بزرگ اور اعلیٰ درجہ کے شاعر اور مرثیہ نگار حضرت عزم جون پوری مرحوم کی پیہم ہمت افزائی اور حضرتِ نسیم امروہوی مدظلہٗ کے ایماپر مرثیہ کہنے کی جسارت کی، چنانچہ زیرِ نظر مرثیہ میرا پہلا مرثیہ ہے جو پہلی مرتبہ ۲۴ جنوری ۱۹۷۶ء مطابق ۲۱ محرم الحرام ۱۳۹۶ھ بروزِ شنبہ جامعۂ امامیہ کراچی میں پیش کیا۔ اس کے بعد دبستانِ انیس اور ڈاکٹر اجمل مرحوم کی کوٹھی پر راولپنڈی کی ان دو مجالس میں اور قصرِ حسینی خیرپور میں نذرِ سامعین کرنے کے علاوہ متعدد جگہوں پر پڑھا۔

الحمد للہ کہ یہ مرثیہ ۱۹۷۷ء میں شائع ہو گیا۔ یہ میرے لیئے باعثِ تشکر و امتنان تو ہے ہی لیکن مرثیہ کے موضوع سے دلچسپی رکھنے والے طالبانِ علم کے لیئے بھی اس کی کچھ نہ کچھ افادیت ضرور ہے۔ اس کا موضوع "مرثیہ" ہے۔ میں نے اس میں اپنے طور پر یا اپنے لفظوں میں مرثیہ کی تعریف کی ہے۔ دیگر اصنافِ سخن کے مقابلہ میں اس کی اہمیت، مختصر تاریخ اور اسی ذیل میں مختلف ادوار اور مقامات کے کوئی ۱۲۰ مرثیہ گو شعراؑ کا ذکر کیا ہے۔

اس سلسلہ میں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ یہ ایک کلام منظوم ہے، نثر نہیں۔ ظاہر ہے کہ اس میں اتنی گنجائش نہیں کہ قلی قطب شاہ سے لے کر اس عہد تک جو سیکڑوں مرثیہ گو شعرا گزرے ہیں، ان سب کے نام اس میں شامل کیئے جا سکیں۔ لہٰذا ان تمام مرثیہ گو شعرا اور ان کے مداحین سے جو پاک و ہند کے کسی بھی علاقے سے علاقہ رکھتے ہوں، دست بستہ یہ گزارش ہے کہ کسی نام کی عدم شمولیت کو دل شکنی کا باعث نہ سمجھیں اور ہرگز یہ خیال نہ فرمائیں کہ متعلقہ مرثیہ گو کے مرتبہ کو نظرانداز کرنے کی جسارت کی گئی ہے۔ اس کی وجہ محض نظم کی تنگ دامنی اور میرا اجمال ہے۔

اس مرثیہ میں جن مرثیہ نگاروں کے نام آئے ہیں، ان کے مختصر حالات پر مشتمل ایک اشاریہ مرثیہ کے آخر میں حروفِ تہجی کے اعتبار سے شامل کر دیا گیا ہے جس سے طالبانِ علم کے لیئے اس مرثیہ کی افادیت خاطر خواہ طور پر بڑھ گئی ہے۔ یہ

اشاریہ ڈاکٹر ہلال نقوی نے مرتب کیا ہے جو اس وقت مرثیہ کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کے لیئے ریسرچ کر رہے تھے اور اس لیئے یہ اشاریہ مرتب کرنا انھیں کے لیئے موزوں تھا میں ان کی اس زحمت کے لیئے تہِ دل سے شکر گزار ہوں۔

یہ مرثیہ صاحبانِ نقد و نظر کے معیار پر پورا اترتا ہے یا نہیں، اس کا فیصلہ تو وہ خود کریں گے، میرے لیئے کچھ عرض کرنا بے محل ہے۔ البتہ اس عہد کے ایک عظیم صحافی، شاعر، نقاد اور مشہور ادیب رئیس اعظم جناب رئیس امروہوی مدظلہ العالی نے جو اب بد قسمتی سے اس دنیا میں نہیں ہیں، اپنی شدید مصروفیات کے باوجود اس مرثیہ کے متعلق لکھنے کی زحمت فرمائی۔ گو کہ وہ مجھ سے اس حد تک ناواقف تھے کہ صورت آشنا بھی نہ تھے۔ یہ زحمت میرے لیئے وجہ افتخار بھی تھی اور سپاس گزاری کی متقاضی بھی۔

والسلام

(سید قائم مہدی نقوی) ساحر لکھنوی

دانش منزل، ۳۲-اے، بلاک ۱۳، گلشن اقبال، کراچی

نوٹ: یہ پیش لفظ اس مرثیہ کی اشاعت اول کے لیئے لکھا گیا تھا۔ امتداد زمانہ کے باعث اب اس میں کچھ ترامیم ناگزیر ہو گئیں جو کر دی گئی ہیں۔ ساحر

رئیس امروہوی

رثائی ادب میں نادر اضافہ

" ادب " آفاق بھی ہے اور آفاقی بھی ۔ ہر زبان کے لیئے اس کا آفاقی ادب سرمایۂ نازش اور مبدءِ تخلیق ہوا کرتا ہے ۔ اردو میں مرثیہ نگاری کی صنفِ سخن بھی آفاقی حیثیت رکھتی ہے اور اپنے موضوع کی وسعت اور تنوع کے لحاظ سے امتیازِ خاص کی حامل ہے ۔ اردو کی تمام اصنافِ سخن پر عربی و فارسی اثرات کی گہری چھاپ نظر آتی ہے ، البتہ مرثیہ نگاری وہ تنہا صنفِ سخن ہے جس نے غزل اور قصائد کی طرح فارسی و عربی اسالیبِ شعر کے اثرات کو قبول نہیں کیا ۔ اس حقیقت کا ثبوت وہ ابتدائی مرثیے ہیں جن کا آغاز قلی قطب شاہ اور ان کے معاصرین کے عہد میں ہوا اور بعد میں انیس و دبیر جیسے قادر الکلام شعراء نے انھیں (اردو مراثی کو) معراجِ کمال تک پہنچا دیا ۔ یہ مرثیے اپنے مزاج ، مذاق اور اسالیبِ ابلاغ کے اعتبار سے کسی طرح فارسی و عربی اثرات کے مرہونِ منت نہیں ۔ انیس و دبیر کے ہاتھوں درجۂ تکمیل پر فائز ہونے کے بعد اردو مرثیہ نے ہر صنفِ سخن کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا اور اس طرح ہماری زبان کی شاعری میں ایک ایسی صنفِ سخن وجود میں آئی جس کی مثال کسی زبان کے ادب میں نہیں ملتی ۔ اردو مرثیہ کا ایپک (EPIC) اور ٹریجڈی (TRAGEDY) سے تقابل کرنے والے یہ تو صحیح کہتے ہیں کہ اردو مرثیہ نہ ایپک سے تعلق رکھتا ہے نہ ٹریجڈی سے اس لیئے کہ یہ خود ایک مکمل ، مستقل اور منفرد صنفِ سخن ہے ۔ البتہ ایپک ہو یا ٹریجڈی ، ان دونوں کی

خصوصیات اردو مرثیہ میں موجود ہیں۔

اردو مرثیہ کے متعلق اس گفتگو کا سبب یہ ہے کہ ساحر لکھنوی کے زیر نظر مرثیہ کا موضوع ہی اردو مرثیہ ہے۔ اردو مرثیہ کیا ہے؟ لغوی اور اصطلاحی تعریف کے ساتھ ساتھ شاعرانہ فکر کے اعتبار سے مرثیہ کی تعریف کیا ہے؟ اردو مرثیہ کی ابتدا کس نے کی؟ اس کے ارتقائی سفر کی منزلیں کیا تھیں؟ مرثیہ کے ابتدائی دور سے عہدِ جدید تک مختلف ادوار کے نمائندہ مرثیہ نگار کون کون تھے؟ ساحر نے اس مرثیہ میں ان سب حقائق پر بڑے محققانہ انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ اس طرح یہ مرثیہ ایک تاریخی دستاویز بن گیا ہے۔ آپ اس کو مرثیہ کی اجمالی تاریخ کہہ سکتے ہیں۔ یہ ایک تاریخ ساز کام کیا گیا ہے جس کی اہمیت کو صرف طالبانِ علم اور مرثیہ سے دلچسپی رکھنے والے عام قارئین ہی نہیں بلکہ اس موضوع پر تحقیق کرنے والے بھی محسوس کریں گے۔ یقیناً یہ مرثیہ ایک ریفرنس بک (REFERENCE BOOK) کے طور پر کام آسکتا ہے۔

ساحر لکھنوی جس خانوادۂ علم و ادب سے تعلق رکھتے ہیں، اس میں نہ صرف جناب غفراں مآب علیہ الرحمہ اور سلطان العلماءؒ سے لے کر اب تک متعدد جید مجتہدین اور علمائے کرام پیدا ہوئے بلکہ شعر و ادب میں بھی مہدی حسین ماہر، اصغر حسین فاخر، ذاکر، بندۂ کاظم جاوید، چھنگا صاحب حُسین، خورشید، امید، عقیل، فہیم، اولاد حسین شاعر، ظفر عباس فضل اور اختر حسین مصور جیسے بلند پایہ مرثیہ نگار اور نوحہ گو شاعر پیدا ہوئے جن میں سے بعض صاحبِ دواوین بھی ہیں۔ اس لحاظ سے شاعری اور مرثیہ نگاری ان کا خاندانی ورثہ ہے۔ سونے پر سہاگہ، انھیں دورِ حاضر کے منفرد مرثیہ گو شاعر آلِ محمدؐ حضرتِ نسیم امروہوی کے مشورہ اور رہنمائی کا شرف بھی حاصل ہے۔

ساحر کا زیرِ نظر مرثیہ اپنے عنوان کے اعتبار سے جدید اور اپنے اجزائے ترکیبی کے اعتبار سے کلاسیکی انداز کا مرثیہ ہے۔

کلاسیکی مرثیہ کو انیس و دبیر نے اس بلندی پر پہنچا دیا تھا کہ اس کے بعد بظاہر کوئی منزل نہ تھی۔ کلاسیکی مرثیہ کے دو اہم اجزا یعنی تلوار اور گھوڑے کی تعریف میں

کوئی گوشہ چھوڑا نہیں گیا جس کی وجہ سے اس بارے میں کوئی نئی بات کہنا تقریباً ناممکن ہوتا ہے اور عام طور پر جو کچھ کہا جاتا ہے، وہ محض انیس و دبیر کی صدائے بازگشت معلوم ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس عہد کے مرثیہ نگاروں نے کلاسیکی مرثیہ کے ان اجزا کو تقریباً ترک کر دیا ہے اور اب پورے برصغیر میں سوائے دو چار اساتذہ کے کوئی اس موضوع پر قلم نہیں اٹھاتا۔ ساحر نے اس مرثیہ میں تلوار اور گھوڑے کی تعریف میں نہایت کامیابی کے ساتھ بعض نئی تشبیہات استعمال کی ہیں جن کو بجا طور پر اس باب میں ایک اضافہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ مثلاً تلوار کی تعریف میں:

کھنچ کر مقابلے پہ جو باطل کے تن گئی
چینِ جبینِ حیدرِ کرّار بن گئی

گھوڑے کی تعریف میں:

اسپِ فلک نورد کی رفتار کی مثال
رف رف، براق، برق، تجلّی، نظر، خیال

اسی طرح:

اک جست میں زمین سے خلا تک سفر کرے
اک ثانیے میں چاند کی منزل کو سر کرے

بالکل عہدِ جدید کی بات ہے اور خلائی سفر کے اس دور میں ہی کہی جاسکتی تھی۔ یا:

اس کو جو آپ ہٹ کے نہ رستہ پہاڑ دے
ٹاپوں سے مار مار کے صورت بگاڑ دے

نہ صرف نیا انداز اور نیا آہنگ لیئے ہوئے ہے بلکہ جذبہ کی توانائی کی بھرپور عکاسی بھی کرتا ہے۔

اس مشکل اور پامال موضوع پر اتنی کامیابی سے قلم اٹھانا ساحر کی ندرتِ خیال قوتِ فکر اور قدرتِ نظم کی روشن دلیل ہے۔

مرثیہ کے حصہ اما حسینؑ کے اٹھا کے نو نظر علی

اکبرؑ کا حال نظم کیا گیا ہے جو رخصت، آمد، رجز، جنگ اور شہادت پر مشتمل ہے۔ اسی اعتبار سے میں نے اس کو کلاسیکی طرز کا مرثیہ بھی کہا ہے۔ رخصت اور شہادت کے حصے نہایت دل گداز اور اثر انگیز ہیں۔ حضرت علی اکبرؑ کی جنگ اور میدان جنگ کی منظر نگاری کے حصے رنگ و آہنگ کا حسین امتزاج ہیں جن کو پڑھ کے بے ساختہ منھ سے واہ نکل جاتی ہے۔ یہ بند ملاحظہ کیجیے:

حضرت علی اکبرؑ فوج شام پر حملے کر رہے تھے اور ان کی شمشیر جو ہر وار دشمن پر قہر خدا بن کر گر رہی تھی:

یہ تیغ اور کیا تھی جو قہر خدا نہ تھی
باطل سے اس کے دل میں مروّت ذرا نہ تھی
سچ مچ ہلاک کرتی تھی، عشوہ نما نہ تھی
ہم شانِ ذوالفقار تھی، تیغِ ادا نہ تھی
جھونکے چلے جو دشت میں ایسی حسام کے
بجھنے لگے چراغ سویرے سے شام کے

نتیجہ یہ ہوا کہ دشمن کے قدم اکھڑ گئے، فوج شام بھاگ کھڑی ہوئی اور میدان جنگ میں بلا کی افراتفری مچ گئی:

ہلچل یہ تھی کہ تیغ کہیں تھی، سپر کہیں
رہرو کہیں تھے، راہ کہیں، راہبر کہیں
بھائی کہیں تھا، باپ کہیں اور پسر کہیں
بھگدڑ مچی تھی، پاؤں کہیں تھے، نظر کہیں
پیدل تو کیا، سوار گرے اضطراب میں
سر خاک پر تھے، پاؤں معلق رکاب میں
محشر سے ہم کنار تھا میدان کارزار
نقارہ و دہل کی گرج، شور گیر و دار

چیخیں وہ زخمیوں کی وہ کڑکیت کی پکار
گھوڑوں کی جست و خیز سے اڑتا ہوا غبار
لاشے نظر کی آخری حد تک پڑے ہوئے
اکبرؑ کی تیغِ تیز کے جھنڈے گڑے ہوئے
بکھرے پڑے تھے دشتِ وغا میں اِدھر اُدھر
ہتھیار ، چار آئینے ، زرہیں ، جھلم ، سپر
دل ، ہاتھ ، پاؤں ، سینہ ، جگر ، سب تر بتر
گھوڑوں کی ٹھوکروں میں تھے خیرہ سروں کے سر
جھکتے نہ تھے جو کبر سے اک آن کے لیئے
گیندیں بنے تھے موت کی چوگان کے لیئے

ان بندوں میں زورِ بیان عروج پر ہے، منظر نگاری اتنی خوب صورت ہے کہ ذرا سے تصور کے سہارے میدان جنگ کا پورا حال اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں۔ حسبِ محل مرثیہ کی کلاسیکی زبان بھی استعمال کی گئی ہے مگر مصرعوں کی بندشیں، خیالات اور اندازِ بیان بالکل منفرد اور اچھوتا ہے۔ دوڑتے ہوئے گھوڑوں کی ٹھوکروں میں آنے والے بریدہ سروں کے لیئے یہ کہنا کہ

گیندیں بنے تھے موت کی چوگان کے لیئے

ندرتِ خیال اور پروازِ تخیل کی ایک حسین مثال ہے۔

مختصر یہ کہ ساحر لکھنوی کا یہ مرثیہ اردو کے رثائی ادب میں ایک خوب صورت اضافہ بھی ہے اور ایک مفید دستاویز بھی۔

آخر میں یہ کہنا بے محل نہ ہوگا کہ جدید مرثیہ کی ضرورت اور اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے ساتھ ساتھ کلاسیکی انداز کے مرثیے بھی کہے جاتے رہیں تاکہ اردو رثائی ادب کے شان دار ماضی سے بھی ہمارا رشتہ استوار رہے اور ہم اس عظیم کلاسیکی ورثہ سے محروم نہ ہونے پائیں اور جدید مرثیہ کی ترقی کی

کوششوں میں ان چراغوں سے روشنی حاصل کرتے رہیں جو اردو رثائی ادب کے آسمان پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمک رہے ہیں۔

دستخط (رئیس)

۷ دسمبر ۱۹۷۷ء

رباعی

ساحر پہ جو مولاؑ کا کرم عام ہوا
ہر مرثیہ ہم رتبۂ الہام ہوا
اللہ رے نصیب ، آتے ہی منبر پہ قدم
توقیر ملی ، اوج بڑھا ، نام ہوا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قطب شاہ سے ساحر تک

(۱)

ذوقِ سخن تجلیٔ ایوانِ زندگی
شانہ کشِ عروسِ شبستانِ زندگی
زیبائشِ بہارِ خیابانِ زندگی
عطرِ حیات ، روحِ نفس ، جانِ زندگی
سارا شرف کلام کی شائستگی سے ہے
انسان کائنات میں افضل اسی سے ہے

(۲)

شیریں کلام لہجۂ عجز و نیاز میں
جیسے صدا بلال کی صحنِ حجاز میں
ناواقفانِ رمزِ سخن ، بزمِ ناز میں
ایسے ہیں جیسے ٹوٹے ہوئے تار ساز میں
گونگے ہیں ، خوفِ جہل سے لب کھولتے نہیں
منھ میں زبان رکھتے ہیں اور بولتے نہیں

(۳)

لطفِ حیات لذّتِ شعر و سخن میں ہے
تاثیرِ ذکر فکر ہی کے بانکپن میں ہے
بوئے لباسِ حور اسی پیرہن میں ہے
رعنائیٔ خیال اسی انجمن میں ہے
اہلِ نظر کی بزم میں اس کا گزر نہیں
جس کو یہاں سلیقۂ عرضِ ہنر نہیں

(۴)

عرفانِ کردگار ہے عنوانِ شاعری
خالق کی حمد ، مطلعِ دیوانِ شاعری
نعتِ رسولؐ منزلِ ایمانِ شاعری
پھر اس کے بعد مدحِ علیؑ جانِ شاعری
زہرا کی ہو ثناء کہ صفت ان کے لال کی
تطہیر نفس کی ہے طہارت خیال کی

(۵)

وہ حمد ہو کہ نعت ۔ وہ مدحت ہو یا ثنا
ہر ایک کا ہے اپنی جگہ اپنا مرتبا
لیکن یہ کہہ رہے ہیں تنوّع ، اثر ، ادا
ہر ایک صنفِ شعر پہ حاوی ہے مرثیا
میدان اس کا اتنا وسیع و بسیط ہے
اصنافِ کل سخن پہ یہ تنہا محیط ہے

(۶)

اس میں غزل کا حسن ، قصیدے کی دل کشی
مدحت کی آن بان ، عقیدت کی چاشنی
حمدِ خدا کا لطف بھی ، نعتِ رسولؐ بھی
پھیلاؤ میں ہے نظم ، تسلسل میں مثنوی
غم بھی ہے ، بزم و رزم بھی ہے ، ہمہمہ بھی ہے
یہ داستانِ درد بھی ہے ، زمزمہ بھی ہے

(۷)

مومن کے حق میں رحمتِ باری ہے مرثیہ
گوشِ ستم پہ ضربتِ کاری ہے مرثیہ
دربارِ فن میں پنج ہزاری ہے مرثیہ
ملکِ سخن میں لاکھ پہ بھاری ہے مرثیہ
اک ضربِ عشق ہے دلِ بیدار کے لیئے
اک سان ہے ضمیر کی تلوار کے لیئے

(۸)

دریائے فکر و فن کی روانی ہے مرثیہ
تیغِ زبانِ شعر کا پانی ہے مرثیہ
لیلائے شاعری کی جوانی ہے مرثیہ
تاریخ نے کہی وہ کہانی ہے مرثیہ
ہے فردِ جرمِ فوجِ ضلالت شعار بھی
کردارِ اہلِ بیتؑ کا آئینہ دار بھی

(۹)

میّت کا ذکرِ خیر لغت میں ہے مرثیا
لیکن یہ اصطلاح میں ہے ذکرِ کربلا
وہ کربلا جو سب سے بڑا حق کا معرکا
وہ معرکہ جو معرکۂ صدق و کذب تھا
حق پر نثار ہونے کا جس نے سبق دیا
عزت کے ساتھ جینے کا انساں کو حق دیا

(۱۰)

وہ شام کے اندھیرے سے نورِ خدا کی جنگ
اہلِ دغا و مکر سے اہلِ وفا کی جنگ
طاغوتیت کے اوج سے عرشِ عُلا کی جنگ
اسلام کی بقا کے لیئے کربلا کی جنگ
وہ صرصر و سموم سے پھولوں کی جنگ تھی
نیکی میں اور بدی میں اصولوں کی جنگ تھی

(۱۱)

اک سمت تھا یزیدِ بد اطوار و بد قماش
بے دین و بے اصول و بد اخلاق و بد معاش
اسلام دستِ ظلم سے جس کے تھا پاش پاش
کاندھے پہ رکھ کے عظمتِ انسانیت کی لاش
ٹھوکر کتابِ پاک پہ بھی مارتا ہوا
آیا تھا حق کے سامنے للکارتا ہوا

(۱۲)

اور دوسری طرف تھا محمدؐ کا نورِ عین
قرآن و وحی و دین و شریعت کی زیب و زین
انسانیت کی آنکھوں کی ٹھنڈک ، جگر کا چین
ایثار و صبر و عشق و صداقت کا دل ، حسینؑ
حق کی بقا کا عزمِ مصمم کیئے ہوئے
انسانیت کے اوج کا پرچم لیئے ہوئے

(۱۳)

انسانیت کا دل ، جگر سرورِ نجف
زہراؑ کی جان ، احمدِ مختار کا خلف
کعبہ کا افتخار ، براہیمؑ کا شرف
آیا جو کارزارِ شہادت میں سربکف
سب خاک میں غرورِ حکومت ملا دیا
مظلومیت کے نام کا سکّہ چلا دیا

(۱۴)

تاریخ ساز وہ سرِ میدانِ کربلا
ظلم و ستم کے منھ پہ طمانچہ حسینؑ کا
آئینِ سرفرازیٔ انساں جو بن گیا
تشریحِ معتبر ہے اسی کی یہ مرثیا
فرقِ ملوکیت کے لیئے ضربِ سنگ ہے
ہر ظلم کے خلاف یہ اعلانِ جنگ ہے

(۱۵)

اس جنگ کا نقیب ، قطب شاہِ حق پناہ
مولا کا وہ فقیر ، دکن کا وہ بادشاہ
اردو ادب میں اس نے نکالی نئی یہ راہ
کی ابتدائے مرثیہ گوئی بہ اشک و آہ
یہ گلشنِ سخن میں نئی داغ بیل تھی
ورنہ غزل ازل سے تماشہ تھی ، کھیل تھی

(۱۶)

لے کر اٹھے تھے جس کو قطب شاہِ ذی حشم
تاریخ آگے بڑھنے لگی لے کے وہ علم
اس کے تلے گداؔ و سکندرؔ ہوئے بہم
بڑھتا رہا وہ جانبِ منزل قدم قدم
مسکینؔ فن کی شمعِ فروزاں لیئے ہوئے
چشم و نظر میں عترت و قرآں لیئے ہوئے

(۱۷)

جذبے نے تجربات کی گودی میں پال کے
تیور جوان کر دیئے اس نونہال کے
ہیئت بدل کے ، اک نئے سانچے میں ڈھال کے
تنقید کے بھنور سے نکالا سنبھال کے
میرؔ اس کو زیب میری و درائی کر گئے
سوداؔ تو اک زمانے کو سودائی کر گئے

(۱۸)

اس صنف میں کمالِ فصاحت تو دیکھیئے
لہجے کے بانکپن میں متانت تو دیکھیئے
منظر کشی میں ذہن کی جودت تو دیکھیئے
جذبات کے بیاں میں حقیقت تو دیکھیئے
مضمونِ حرب و ضرب ہے اس آن بان کا
آہنگ ہے سخن میں کڑکتی کمان کا

(۱۹)

آغاز میں کلام کے شاعر بہ آب و تاب
چہرے سے مرثیے کے اٹھاتا ہے جب نقاب
چشمِ خیال دیکھتی ہے کچھ عجیب خواب
یہ ہے چمن، وہ دشت، یہ دریا تو وہ سراب
تڑکا یہ نور کا، وہ سیاہی ہے شام کی
وہ لشکرِ یزید تو یہ فوج امامؑ کی

(۲۰)

منظور ہو نمودِ سحر کا اگر بیاں
کھینچے کچھ ایسے حُسن سے وہ صبح کا سماں
بانگِ صریرِ کلک بنے نعرۂ اذاں
انگڑائی لے کے جاگ اٹھے پیر آسماں
لیلائے شب نقاب سے منھ ڈھانکنے لگے
گھونگھٹ سے صبحِ نو کی دلھن جھانکنے لگے

(۲۱)

گرمی کا ہو بیاں تو لرز جائے ہر نظر
نقطوں پہ ہو گمان کہ اڑ کر گرے شرر
لفظیں ہوں سب سیاہ یہ سوزش کا ہو اثر
لکھے ۰ سقر ۰ تو دیکھنے والا پڑھے ۰سقر۰
حدّت سے کھول جائے سیاہی دوات کی
عشرے کو جیسے دھوپ سے موجیں فرات کی

(۲۲)

رنگِ وغا جو بزم میں یہ اہلِ فن جمائیں
کانوں میں گونجنے لگے تیروں کی سائیں سائیں
سن سن سے تیغِ فکر کی جی سب کے سنسنائیں
کمزور دل تو چیخ اٹھیں کہہ کے "بائیں ہائیں"
دستِ خیال بندِ نظر کھولنے لگے
گوشِ تصورات میں رن بولنے لگے

(۲۳)

چھڑ جائے ذکرِ غم تو فضائیں ہوں سوگوار
نکلے جو آہِ سرد ، ہوائیں ہوں بے قرار
نوحے کی جو بلند صدائیں ہوں بار بار
پامالیٔ چمن پہ گھٹائیں ہوں اشک بار
آنسو امڈ کے آئیں خیالات کی طرح
بارش ہو اشکِ درد کی برسات کی طرح

(۲۴)

قدرت یہ فکر و فن پہ، قلم پر یہ اختیار
افضال پنجتن ہے بتائید کردگار
اس رتبۂ بلند پہ ہے مرثیہ نگار
ملکِ سخن پہ اس کا مکمل ہے اقتدار
دنیائے شاعری پہ حکومت اسی کی ہے
دینِ سخنوری میں امامت اسی کی ہے

(۲۵)

دلگیر سے ہوئی اس امامت کی ابتدا
پہلے بھی مرثیہ تھا مگر یہ مزہ نہ تھا
پھر فیض ہے فصیحؔ و خلیقؔ و ضمیرؔ کا
وہ جن سے مرثیے کو ملا دبدبہ نیا
بخشا صلہ انھیں یہ جنابِ امیرؑ نے
چمکا دیئے ہیں نام انیسؔ و دبیرؔ نے

(۲۶)

دونوں نے مرثیے کو عجب مرتبا دیا
جیسے گدا کو خلعتِ شاہی پنھا دیا
چیونٹی کو اوج دے کے سلیماں بنا دیا
ایک بوریا نشیں کو فلک پر بٹھا دیا
یہ نظم صنفِ شعری سرتاج ہوگئی
گویا براقِ فکر کو معراج ہوگئی

(۲۷)

ان کی روش پہ اور بھی اہلِ ہمم چلے
عشقِ سخن میں انسؔ و تعشقؔ بہم چلے
مونسؔ بہت نفیسؔ روش دم بدم چلے
کاملؔ بھی تھے رشیدؔ بھی جو ذی حشم چلے
ایسا وحیدِؔ عصر جو ہر راہبر ہوا
اوجِؔ سخن پہ فکر و نظر کا گزر ہوا

(۲۸)

پھولا پھلا جو اور یہ مولاؑ کا گلستاں
پہنچی صدائے مرثیہ گوئی کہاں کہاں
ہر قوم، ہر قبیلے میں کیا کیا تھے خوش زباں
ناطقؔ، ریاضؔ، شادؔ، فلقؔ، وحشیؔ و بیاںؔ
خوشبو شمیمؔ کی چمنستانِ فن میں تھی
برجیسؔ کی ضیاؔ بھی اسی انجمن میں تھی

(۲۹)

فائقؔ تھا ہر چمن سے چمن زارِ لکھنؤ
تھا کیا رفیعؔ طرۂ دستارِ لکھنؤ
فائزؔ اس اوجِ فکر پہ سرکارِ لکھنؤ
اخترؔ کا فیض جلوۂ دربارِ لکھنؤ
مثلِ قطبؔ قدیمؔ روش پہ سجا ہوا
ایسا عروجِؔ حسن کہ دولھا بنا ہوا

(۳۰)

کیسی بہار پر تھا گلستانِ لکھنؤ
اپنے پرائے سب تھے ثنا خوانِ لکھنؤ
ثابت کہ اک ستارۂ تابانِ لکھنؤ
وہ آرزو کہ حاصلِ ارمانِ لکھنؤ
ایسے خبیر بابِ خبر جن پہ باز تھا
ایسے ذکی کہ جن پہ فراست کو ناز تھا

(۳۱)

تہذیبِ مرثیہ سے مہذب وہ باشعور
ہوکے مؤدب آئے تھے اس بزم کے حضور
عارف کے روئے فکر پہ تھا معرفت کا نور
آشفتہ و جلیل کا شہرہ تھا دور دور
ہر ایک اپنے فن میں جو فردِ فرید تھا
اس نظم کے بیان میں اثر بھی شدید تھا

(۳۲)

ہیں ان کے ماسوا بھی کئی سو وہ نیک نام
جن کو ملی ہے مرثیے سے عظمتِ دوام
کچھ فن کے مقتدی ہیں جو ان میں تو کچھ امام
کچھ نجم ہیں فلک کے تو کچھ ہیں مہِ تمام
ہیں پاس کے بھی ، دور سے آئے بھی ہیں بہت
اپنے ہی سب نہیں ہیں ، پرائے بھی ہیں بہت

(۳۳)

اپنے ہوں یا پرائے ، سب اس بزم کے جلیسؔ
یا پیروِ دبیرؔ ہیں یا پیروِ انیسؔ
افکار پاک و صاف ، زباں سادہ و سلیسؔ
مضمون پُرشکوہ ، سخن نادر و نفیسؔ
یوں ہے نگاہِ شوق میں ان کے سخن کا حسن
دولھا نے جیسے دیکھ لیا ہو دلھن کا حسن

(۳۴)

اک میرے جد ، وہ حضرتِ فاخرؔ سے ذی وقار
میرے لیئے شرف تو بزرگوں کا افتخار
ماہر تھے فنِ شعر میں ماہرؔ کی یادگار
مداح ان کے لاکھ تو شاگرد بے شمار
چلتی تھی ان کی تیغِ قلم ہر زمین میں
جبریلِ فن کے ڈھونڈتی تھی پر زمین میں

(۳۵)

میرے بزرگ اور بھی تھے شاد و بامراد
امیدگاہِ علم و ہنر جن کا اجتہاد
خورشیدؔ سے عقیلؔ و فہیمؔ و ادب نہاد
ذاخرؔ ، حسینؔ ، شاعرؔ و جاویدؔ حق نژاد
میں نے مذاقِ شعر جو پایا ، انھیں کا ہے
ورثہ یہ ہاتھوں ہاتھ جو آیا ، انھیں کا ہے

(۳۶)

کچھ اور بھی یہاں تھے ثناخوانِ باہنر
اب گوشۂ مزار ہے تا حشر جن کا گھر
شوکت ، ظریف ، اطہر و بنیادِ مقتدر
زیبا ، محب ، ندیم ، ثمر ، نجم اور قمر
آغا کہ خود سخن بھی ثناء و صفت کرے
منظور اور وصی کی خدا مغفرت کرے

(۳۷)

محبوب اور فارغ و زائر سے بے بدل
صابر ، نسیم ساکن معمورۂ اجل
اصغر ، شہید ، حب ، نظر و حر ہیں آج کل
جوہر ہیں اور عظیم سخندانِ باعمل
یہ سب بفیضِ آلِ محمدؐ وحید ہیں
حسبِ مذاق و فکر قدیم و جدید ہیں

(۳۸)

رائق ، جمیل و فیضی و شاداں سے اہلِ فن
سردار و اعظمی و اثر ، نیر و حسن
دانش ، رئیس ، صفدر و حسانِ خوش سخن
قیصر ، قسیم ، امید ، رضی ، سب کا یہ چلن
تابش الگ ہے مگر نور ایک ہے
اس آسماں پہ جو بھی ستارہ ہے ، نیک ہے

(۳۹)

خاکیؔ و ہاشمیؔ و ہنرؔ بدرؔ اور ہلالؔ
فیضؔ و صباؔ و نوریؔ و کرارِ خوش خیال
یاورؔ ، نفیسؔ ، شاہدؔ و منظرِ شکر مقال
جوشؔ و رضاؔ و عزمؔ و ظفرؔ جیسے باکمال
مرشد مرے نسیمؔ حقیقت نگار ہیں
یہ گلشنِ ادب میں نسیمِ بہار ہیں

(۴۰)

صد شکر ، آج ان میں مرا بھی شمار ہے
ناچیز پر یہ رحمتِ پروردگار ہے
فکر جواں جو حسنِ سخن کا نکھار ہے
عزمِ ثنائے اکبرِ عالی تبار ہے
اس میں مرا معین جو حق کا حبیب ہو
بزمِ سخن میں نور کا منبر نصیب ہو

مطلعِ ثانی

اکبرؑ ریاضِ حسنِ پیمبرؐ کے پھول ہیں
نخلِ شباب یہ ہیں ، وہ اصلِ اصول ہیں
یوسف دعائے حسن ، یہ حسنِ قبول ہیں
صورت میں ، چال ڈھال میں بالکل رسولؐ ہیں
اس آئینے میں دیکھیے جلوہ رسولؐ کا
قامت کے رنگ روپ میں سایہ رسولؐ کا

(۴۲)

ان کو اگر بٹھائیں محمدؐ کے رو برو
بالکل حضور ہی کا سراپا ہے مو بمو
شہرہ بھی ہے سارے زمانے میں کو بکو
یہ ہم شبیہِ احمدِ مرسل ہیں ہو بہو
باتوں میں معرفت کے گہر رولتی ہوئی
تصویر ہے رسولؐ کی منھ بولتی ہوئی

(۴۳)

منھ بولتی ہوئی ہے یہ تصویرِ بے گماں
گویا دہن میں ان کے محمدؐ کی ہے زباں
عاشور کی وہ صبح ، تقدس کا وہ سماں
صحرا میں گونجتی ہوئی پر کیف وہ اذاں
ایک موج بن کے اشہدُ ان لا الہٰ کی
آواز آ رہی تھی رسالت پناہؐ کی

(۴۴)

جب دے چکا اذان وہ بانوؑ کا مہ لقا
بڑھ کر نمازیوں نے مصلّیٰ بچھا دیا
مولا نے کی امامتِ انصارِ باوفا
اتنے میں فوجِ شر سے چلے تیر بے خطا
کیا کیا خوشی نہ تھی سپہِ فتنہ ساز میں
کچھ ناصروں نے پائی شہادت نماز میں

(۴۵)

فارغ ہوئے نمازِ سحر سے جو تشنہ کام
روئے حسینؑ دیکھ کے ظلمِ سپاہِ شام
مڑ کر کہا ۔ " دفاع کا جلدی ہو انتظام "
پا کر امامِ وقت کی جانب سے اذنِ عام
انگڑائی لے کے ، جوشِ شجاعت میں جھوم کے
عباسؑ اٹھے حضورؑ کے قدموں کو چوم کے

(۴۶)

جھپٹے جلال میں صفتِ شیرِ خشمگیں
تیوری پہ بل ، نگاہ میں غصہ ، جبیں پہ چیں
الٹی ہوئی وہ غیظ میں کہنی تک آستیں
حکمِ امامؑ ہو تو الٹ دیں ابھی زمیں
تیور بتا رہے ہیں جلالت پناہ کے
یہ ہیں ہژبر بیشۂ شیرِ الٰہ کے

(۴۷)

اکبرؑ یہ دیکھ کر ہوئے بے چین جو کمال
آئے حضورِ سرورؑ دیں صورتِ سوال
کی عرض ہاتھ جوڑ کے ، اے سیدہ کے لال
اب وقت آ گیا ہے کہ آغاز ہو جدال
خادم یہ اوج پائے جو لطفِ امامؑ سے
ہو ابتدائے نصرتِ مولا غلام سے

(۴۸)

بیٹے نے باپ سے جو کہا دل کا مدعا
دھچکا لگا یہ شاہ کو ، جی سن سے ہوگیا
خود کو مگر سنبھال کے مظلوم نے کہا
ہمت کو آفریں ہے ، شجاعت کو مرحبا
ورثہ ہے یہ جلالِ شہِ قلعہ گیر کا
پوتا ہے میرا شیر جنابِ امیرؑ کا

(۴۹)

لیکن یہ امر ہم کو قیامت سے کب ہے کم
پیری میں کس سے اٹھتا ہے کڑیل جواں کا غم
نانا کی یادگار ہو تم ، میرے ذی حشم
اہلِ حرم ہوں ، دوست ہوں ، انصار ہوں کہ ہم
نازاں ہیں اپنی خوبیٔ تقدیر دیکھ کر
جیتے ہیں سب رسولؐ کی تصویر دیکھ کر

(۵۰)

انصار و اقربا ہیں شجاع و وفاشعار
زیدؑ و حبیبؑ و عابسؒ و مسلمؒ سے باوقار
پھر سب سے بڑھ کے قاسمؑ و عباسؑ نامدار
جانے نہ دے گا رن کو تمھیں کوئی جاں نثار
تصویرِ مصطفیٰؐ سے کنارا کرے گا کون
تم سے جواں کی موت گوارا کرے گا کون

(۵۱)

اکبرؑ یہ سن کے چپ ہوئے، پھر ماں کے پاس آئے
سینے پہ ہاتھ، آنکھوں میں اشکِ الم چھپائے
پہلے تو چپ کھڑے رہے کچھ دیر سر جھکائے
آیا خیالِ خاطرِ مادر تو مسکرائے
منظر جو ماما کے نگاہوں میں پھر گئے
کچھ کہہ نہ پائے، دوڑ کے قدموں پہ گر گئے

(۵۲)

گھبرا گئی یہ دیکھ کے وہ غم کی مبتلا
بے تاب ہو کے چیخ اٹھی، ہیں! یہ کیا، یہ کیا
اے میرے لال، میرے قمر، میرے مہ لقا
جلدی کہو کہ پھٹتا ہے سینے میں دل مرا
باتوں سے یاس کی مری جاں، میری جاں نہ لو
اس دورِ ابتلا میں مرا امتحاں نہ لو

(۵۳)

اکبرؑ نے ہاتھ جوڑ کے مادر سے یہ کہا
آلِ نبیؐ کے خون کی پیاسی ہے کربلا
ہَل مِن مُبارِزٍ کی اب آنے کو ہے صدا
دل چاہتا ہے پہلے میں بابا پہ ہوں فدا
لیکن پدر سے جنگ کی رخصت نہیں ملی
اماں، امامِ دیں سے اجازت نہیں ملی

(۵۴)

کیا ہو ، خدا نخواستہ جو شہ پہ آنچ آئے
کیا ہو ، زمینِ دشت جو اک تازہ گل کھلائے
کیا ہو ، جو مجھ سے پہلے کوئی دوست رن کو جائے
کیا ہو ، جو یہ خبر کوئی اس ڈھنگ سے سنائے
اکبر سے بڑھ کے اور کوئی کیا عزیز تھا
دنیا کہے گی باپ کو بیٹا عزیز تھا

(۵۵)

یہ ماجرا سنا تو وہ گھبرا کے رہ گئی
صورت پسر کی قلب کو تڑپا کے رہ گئی
چہرے کا رنگ دیکھ کے تھرّا کے رہ گئی
آیا اندھیرا آنکھوں میں ، چکرا کے رہ گئی
سنبھلی تو اٹھ کے گردِ پسر گھومنے لگی
رخ کی بلائیں لے کے جبیں چومنے لگی

(۵۶)

سینے سے پھر لگا کے کہا ، ماں نثار ہو
اتنا نہ اشکبار ، نہ یوں بے قرار ہو
رخصت تمہاری کیوں نہ شہِ دیں پہ بار ہو
اے میری جاں ، رسولؐ کی تم یادگار ہو
ڈھارس بہت ہے تم سے شہِ مشرقین کو
پیارے بہت ہو لال مرے تم حسینؑ کو

(۵۷)

اچھا ، چلو ، پھوپھی سے اجازت دلائیں ہم
رخصت ملے تو لال کو دولھا بنائیں ہم
جوڑا شہانہ ہاتھ سے اپنے پنھائیں ہم
تم روٹھ جاؤ ماں سے تو تم کو منائیں ہم
بیٹا ، پھوپھی کے حق سے مرا حق سوا نہیں
میں کیسے اذن دوں جب انھوں نے دیا نہیں

(۵۸)

اتنے میں آئیں زینبِ ناشاد خود وہاں
دیکھا تو رُوئے بانوئے شہ تھا دھواں دھواں
اک درد ، ایک کرب سا چہرے سے تھا عیاں
گھبرا کے پوچھنے لگی اکبرؑ سے نیم جاں
کیا بات ہوگئی ؟ مرے بھائی کی خیر ہو
اماں کی عمر بھر کی کمائی کی خیر ہو

(۵۹)

اکبرؑ سے کچھ کہا نہ گیا ، چپ کھڑے رہے
بانوؑ یہ عرض کرنے لگیں ہاتھ جوڑ کے
آقا سے جنگ پہ ہیں ستم گر تُلے ہوئے
اذنِ جہاد چاہتے ہیں اب یہ آپ سے
اللہ شہؑ کے سر سے بلاؤں کو رد کرے
بیٹا جواں ہے ، کیوں نہ پدر کی مدد کرے

(۶۰)

زینبؑ تڑپ کے بولیں کہ اکبرؑ، نہیں نہیں
اے میرے لال، میرے گلِ تر، نہیں نہیں
یہ عمر اور نرغۂ لشکر، نہیں نہیں
پالا تھا تم کو اس لیئے دلبر، نہیں نہیں
اس ان گنے برس کا تصدّق اتار دوں
تم پر میں اپنے عونؑ و محمدؑ کو وار دوں

(۶۱)

اکبرؑ یہ بات سنتے ہی مایوس ہو گئے
اور اس طرف حسینؑ کے جاں باز منچلے
ایک ایک کر کے طالبِ اذنِ وغا ہوئے
وہ جنگ کی کہ فوج کے چھکے چھڑا دیئے
وہ باگ روکنے سے جو حرؑ شرمسار تھا
دینے کو اپنی جان بہت بے قرار تھا

(۶۲)

پہلے اُسی نے جان فدا کی حسینؑ پر
تھے اس کے ساتھ بھائی، غلام اور اک پسر
پھر اُن کے بعد شاہؑ کے انصارِ خوش سیَر
پہنچے حضورِ شاہؑ میں ہاتھوں پہ لے کے سر
سب نے شہید ہو کے سعادت حصول کی
ہر نذرِ پُر خلوص خدا نے قبول کی

(۶۳)

انصار ذبح ہو گئے ، پیاروں نے جان دی
اک پھول پر چمن کی بہاروں نے جان دی
اک جانِ گلستاں پہ ہزاروں نے جان دی
خورشیدِ حق پہ چاند ستاروں نے جان دی
فرقت میں سب کی حال جو شہؑ کا تباہ تھا
مظلوم کی نظر میں زمانہ سیاہ تھا

(۶۴)

جب دوست کام آئے ، عزیزوں نے کی مدد
کی اقرباؑ نے نصرتِ مولا میں جدّ و کد
لاکھوں سے ایک ایک لڑا یوں بہ شدّ و مد
فوجِ عدو کے کشتوں کی کوئی رہی نہ حد
گنتی میں پیدلوں نہ سواروں کی بات ہے
ہے سیکڑوں کا ذکر ، ہزاروں کی بات ہے

(۶۵)

لیکن وہ بے شمار ، یہ کم اور بہت ہی کم
اور پھر یہ خستہ حال و پریشاں ، وہ تازہ دم
پیاسے یہ تین دن کے ، وہ غرقِ مئے حشم
یہ بھوک سے نڈھال ، وہ سیراب و پُر شکم
سر دے کے نام کر گئے سب مشرقین میں
بس اب جوان بیٹا ہے فوجِ حسین میں

(۶۶)

اکبر پھوپھی کے پاس پھر آئے پئے رضا
بانوؑ نے بھی پسر کی سفارش کو یہ کہا
اکبر سے پہلے عونؑ و محمدؑ ہوئے فدا
اب تک انھیں فدا نہ کیا ۔ یہ مری خطا
طالب یہ اذن کے ہیں ۔ میں عفو قصور کی
یہ آپ کے غلام ۔ میں لونڈی حضورؑ کی

(۶۷)

زینبؑ کلیجہ تھام کے چلائی ۔ بی بیو
جاتا ہے رن کو باپ کا شیدائی ۔ بی بیو
مرنے کی نوجوان نے قسم کھائی ۔ بی بیو
گھر میں دلھن نہ آئی ۔ اجل آئی ۔ بی بیو
رخصت ہے اب شبیہ رسالت مآب کی
لٹتی ہے حق کی راہ میں دولت شباب کی

(۶۸)

یہ سن کے اہل بیت میں کہرام مچ گیا
وہ گریہ و بکا تھا کہ اک حشر تھا بپا
رخ کر کے سوئے نہر سکینہؑ نے دی صدا
بھیا چلے ہیں مرنے کو ۔ جلد آئیے چچا
روکا اگر نہ ان کو تو محشر اٹھاؤں گی
اب بھی اگر نہ آئے تو میں روٹھ جاؤں گی

(۶۹)

سن کر بہن کے بَین شبیہِ رسولؐ نے
اک سرد سرد آہ بھری دل کو تھام کے
گودی میں لے کے پیار کیا اتنے پیار سے
بچّی بھی روئی ، خود علی اکبرؑ بھی رو دیئے
ساری فضا کو غم میں ڈبوتے ہوئے چلے
ننھے گلے کو چوم کے روتے ہوئے چلے

(۷۰)

چلنے لگے تو ماں نے کہا ضبط توڑ کے
جاتے ہو میرے لال مجھے بن میں چھوڑ کے
اکبرؑ نے ماں سے عرض یہ کی ہاتھ جوڑ کے
صغرأ سے بھی تو آئے تھے ہم منھ کو موڑ کے
نرغہ ہے دشمنوں کا امامِ انام پہ
ہم کو نثار کیجیئے امّت کے نام پہ

(۷۱)

ماں نے کہا کہ جاؤ ، مبارک سدھارنا
بیٹا ، کسی بھی حال میں ہمت نہ ہارنا
نیزہ لگے جو سینہ پہ ، اس کو سہارنا
بابا کو وقتِ بد میں نہ لیکن پکارنا
کڑیل جواں ہو تم تو ، وہ پیرانہ سال ہیں
لونڈی کے تم پسر ہو ، وہ زہرأ کے لال ہیں

(۷۲)

اکبرؑ یہ کہتے پیشِ پدر آئے شاد شاد
بابا ، خدا کا شکر کہ بر آگئی مراد
سب سے ملی ، اب آپ بھی دیں رخصتِ جہاد
راضی رضائے حق پہ ہوئے شاہِؑ خوش نہاد
اکبرؑ جو اذن پا کے بہ عزمِ وغا چلے
شبیرؑ پیچھے پیچھے کمر تھام کر چلے

(۷۳)

اس شان سے تھا پشتِ فرس پر وہ مہ لقا
رف رف پہ جس طرح شبِ معراج مصطفیٰؐ
سر پر جو تھا عمامۂ سردارِ انبیاءؑ
بالکل نبیؐ کی شان تھی ، بالکل وہی ادا
دھوکہ ہوا جو رن میں نبیؐ کے ورود کا
غل پڑ گیا زمین و زماں میں درود کا

(۷۴)

جیسا سوار ویسا ہی رہوارِ خوش خصال
سرعت کو اس کی پائے ، تخیّل کی کیا مجال
اسپِ فلک نورد کی رفتار کی مثال
رف رف ، براق ، برق ، تجلّی ، نظر ، خیال
اک جست میں زمیں سے خلا تک سفر کرے
اک ثانیے میں چاند کی منزل کو سَر کرے

(۷۵)

ضیحہ کرے تو شیر کا پتّا بھی پھاڑ دے
فوجوں میں رم کرے تو صفوں کو اجاڑ دے
اس کو جو آپ ہٹ کے نہ رستہ پچھاڑ دے
ٹاپوں سے مار مار کے صورت بگاڑ دے
فرطِ غضب میں اس کی جبیں پہ جو بل پڑیں
دہشت سے ہیلِ مست کی آنکھیں نکل پڑیں

(۷۶)

تلوار میان میں ہے کہ بجلی ہے ابر میں
شہرہ ہے اس کی کاٹ کا ترسا و گبر میں
رکھتی ہے اختیار پہ بھی خود کو جبر میں
اکبڑ کی یہ کنیز بھی فتنہ ہے صبر میں
واقف جو ہے جہاد کے آدابِ عام سے
بے اذن کیا مجال جو نکلے نیام سے

(۷۷)

پہنچا اس آن بان سے رن میں جو وہ جری
دہشت سے پڑ گئی دلِ اعدا میں تھرتھری
ڈالی نگاہِ غیظ جو لشکر پہ سرسری
شاہی کے اقتدار کے بت بول اٹھے ہری
نظروں کو تھا گماں کہ خدا کا حبیب ہے
نکلے نبیؐ لحد سے ، قیامت قریب ہے

(۷۸)

اک اک سے کہہ رہا تھا کہ تعظیم کو بڑھو
حضرت کی پیشوائی کو، تکریم کو بڑھو
اٹھو، ادائے فرض میں تقدیم کو بڑھو
آداب کو، سلام کو، تسلیم کو بڑھو
سر رکھ دو اب قدم پہ رسولِ انام کے
موتی لٹاؤ بڑھ کے درود و سلام کے

(۷۹)

یہ سن کے فوج کیں سے پرے کے پرے بڑھے
سینوں میں آلِ پاک سے کینہ بھرے بڑھے
تیغ و تبر پہ دست نحوست دھرے بڑھے
جھجکے، چلے، لرز گئے، بہے، ڈرے، بڑھے
پہچانی پاس آ کے جو صورت دلیر کی
پھر تیغیں کھینچنے میں نہ ٹھٹھکے، نہ دیر کی

(۸۰)

اکبرؑ بھی بہرِ جنگ فرس پر سنبھل گئے
اعدائے دیں جلال سے ان کے دہل گئے
تیور جو ان کے دیکھے تو چتون کے بل گئے
ضیغم کے آگے بزدلوں کے دم نکل گئے
نعرہ کیا کہ تن کے بڑھو گر دلیر ہو
آنکھیں ملاؤ، سامنے آؤ جو شیر ہو

(۸۱)

ہم ہیں شجاع شہؑ کے علمدار کی طرح
بازو ملے ہیں جعفرِ طیارؑ کی طرح
باطل شکن ہیں حیدرِؑ کرار کی طرح
تلوار توڑ دیتے ہیں زنّار کی طرح
ہم ہیں ہژبرِ شیرِ خدا ، دیکھ لو ہمیں
تصویرِ مصطفیؐ ہیں ، ذرا دیکھ لو ہمیں

(۸۲)

اعدٰی یہ سن کے فوجِ ستم گر جو بے حساب
اک قہر بن کے ٹوٹ پڑا جانِ بوترابؑ
نکلے جری سے جنگ کو جو خانماں خراب
ان پر خدا کی مار تھی ، اللہ کا عذاب
تھی بھاگنے کی راہ ، نہ موقع لڑائی کا
ہر سمت ایک شور مچا تھا دُہائی کا

(۸۳)

تلوار شیر کی تھی کہ قتّالِ دہر تھی
اس کو چھوؤ تو آگ تھی ، چکھو تو زہر تھی
دریائے خوں کی موج تھی ، طوفاں کی لہر تھی
بھونچال تھی ، بلا تھی ، قیامت تھی ، قہر تھی
کھنچ کر مقابلے پہ جو باطل کے تن گئی
چینِ جبینِ حیدرِؑ کرّار بن گئی

(۸۴)

یہ تیغ اور کیا تھی جو قہرِ خدا نہ تھی
باطل سے اس کے دل میں مروّت ذرا نہ تھی
بچ بچ ہلاک کرتی تھی ۔ عشوہ نما نہ تھی
ہم شانِ ذوالفقار تھی ، تیغِ ادا نہ تھی
جھونکے چلے جو دشت میں ایسی حسام کے
بجھنے لگے چراغ سویرے سے شام کے

(۸۵)

ہلچل یہ تھی کہ تیغ کہیں تھی ، سپر کہیں
رہرو کہیں تھے ، راہ کہیں ، راہبر کہیں
بھائی کہیں تھا ، باپ کہیں اور پسر کہیں
بھگدڑ مچی تھی ، پاؤں کہیں تھے ، نظر کہیں
پیدل تو کیا ، سوار گرے اضطراب میں
سر خاک پر تھے ، پاؤں معلق رکاب میں

(۸۶)

محشر سے ہم کنار تھا میدانِ کارزار
نقارہ و دہل کی گرج ، شورِ گیر و دار
چیخیں وہ زخمیوں کی ، وہ کڑکیت کی پکار
گھوڑوں کی جست و خیز سے اڑتا ہوا غبار
لاشے نظر کی آخری حد تک پڑے ہوئے
اکبر کی تیغِ تیز کے جھنڈے گڑے ہوئے

(۸۷)

بکھرے پڑے تھے دشتِ وغا میں اِدھر اُدھر
ہتھیار ، چار آئینے ، زرہیں ، جھلم ، سپر
دل ، ہاتھ ، پاؤں ، سینہ ، جگر ، سب تر بتر
گھوڑوں کی ٹھوکروں میں تھے خیرہ سروں کے سر
جھکتے نہ تھے جو کبر سے اک آن کے لیئے
گیندیں بنے تھے موت کی چوگان کے لیئے

(۸۸)

چھینٹوں سے تھا لہو کی رخِ آفتاب سرخ
ہوتا ہے جیسے عکسِ شفق سے سحاب سرخ
جسموں پہ زخم تھے کہ کھلے تھے گلاب سرخ
بہتی تھی ہر سبوئے شکم سے شراب سرخ
فوارے چھُٹ رہے تھے ۔ فضا لالہ زار تھی
دشتِ خزاں میں جوش پہ فصلِ بہار تھی

(۸۹)

برپا ابھی تھا دشت میں وہ شورِ دار و گیر
چلتے تھے چار سمت سے گرز و سنان و تیر
ناگہہ بن نمیر ستم گار و بے ضمیر
لے کر سنانِ ظلم چلا گھات میں شریر
چلّائے انبیاءؑ یہ کلیجے سنبھال کے
تصویرِ مصطفیٰؐ ہے ، ذرا دیکھ بھال کے

(۹۰)

تھا وہ تو بے ضمیر و ستم گار و پُر دغل
نیزہ چلایا ایسے کہ تھرّا گئی اجل
سینے میں گڑ کے رہ گیا موذی سناں کا پھل
اکبرؑ گرے زمین پہ گھوڑے سے منھ کے بل
جو آرزو تھی دل میں ، لہو بن کے بہہ گئی
مادر کلیجہ تھام کے ڈیوڑھی پہ رہ گئی

(۹۱)

گرتے ہی شاہ کو یہ صدا دی پکار کر
صد شکر ، کامیاب ہوا آپ کا پسر
خادم کو اب نہیں ہے تمنّا کوئی ، مگر
بس دل یہ چاہتا تھا کہ مرنے سے پیشتر
دیدارِ شاہِ دیں کی سعادت حصول ہو
بابا ، سلامِ آخری میرا قبول ہو

(۹۲)

شبیرؑ نے سنی جو یہ آوازِ دل فگار
دوڑے یہ کہہ کے جانبِ میدانِ کارزار
لو ، الوداع ، اے مرے نانا کی یادگار
ہم سمجھے ، اس سلام کا مطلب ہے آشکار
کیسی جھجک یہ آخری زحمت کے واسطے
حاضر ہے باپ آپ کی خدمت کے واسطے

(۹۳)

یہ کہہ کے شاہ اشک بہاتے ہوئے چلے
بیٹے کے غم میں خاک اڑاتے ہوئے چلے
اک اک قدم پہ ٹھوکریں کھاتے ہوئے چلے
فوجوں کو سامنے سے ہٹاتے ہوئے چلے
کھویا تھا نورِ چشم تو کچھ سوجھتا نہ تھا
منزل کہاں ہے ، راہ کدھر ، کچھ پتا نہ تھا

(۹۴)

ہر گام پہ صدا تھی کہ اکبرؑ ، کہاں ہو تم؟
آؤں میں کس طرف ؟ مرے دلبر ، کہاں ہو تم؟
جائے کدھر یہ بے کس و مضطر ؟ کہاں ہو تم؟
بولو تو ہم شبیہِ پیمبرؐ ، کہاں ہو تم؟
جلدی ہمیں پکار کے مشکل کو رد کرو
بیٹا ، غریب باپ کی کچھ تو مدد کرو

(۹۵)

آئی صدا کہ آتے ہیں کیوں شاہِ کربلا
الجھا ہوا ہے قلب میں نیزہ تو کیا ہوا
نکلے گا آپ اور جو تڑپیں گے ہم ذرا
زحمت نہ آپ کیجیے ہم آپ پہ فدا
کیا کیجیے گا آ کے یہاں اتنی دور سے
میت ہماری اٹھ نہ سکے گی حضور سے

(۹۶)

سن کر صدا جو شہؑ کو پسر کا پتا ملا
مقتل میں ہم شبیہِ رسولِؐ خدا ملا
اس حال میں حسینؑ کو وہ مہ لقا ملا
کڑیل جواں زمیں پہ تڑپتا ہوا ملا
گہرا سناں کا زخم تھا دل میں دلیر کے
نیزہ گڑا ہوا تھا کلیجے میں شیر کے

(۹۷)

رو کر کہا حسینؑ نے ، اکبرؑ ، ہم آئے ہیں
اٹھو مرے شبیہِ پیمبر ، ہم آئے ہیں
تم تک ہزار ٹھوکریں کھا کر ہم آئے ہیں
زینب نے ہم کو بھیجا ہے دلبر ، ہم آئے ہیں
ماں کے ، پھوپھی کے پاس تمھیں لے کے جائیں گے
پیری میں اپنی قوتِ دل آزمائیں گے

(۹۸)

بیٹھے زمیں پہ ، گود میں بیٹے کا سر لیا
سینے سے پھر نکالنے کو نیزہ جب بڑھا
کھینچی سناں ، سنبھال کے دل یا علیؑ کہا
کھینچ کر سناں کے ساتھ کلیجہ نکل پڑا
اک آہ کر کے باپ کی گودی میں مر گئے
مولا تڑپ کے رہ گئے ، اکبرؑ گزر گئے

(۹۹)

مظلوم نے شہیدوں کو آواز دی کہ آؤ
مسلمؑ ، حبیبؓ ، حُرؑ مرے اکبر کی لاش اٹھاؤ
قاسمؑ ، کہاں ہو ؟ عونؑ و محمدؑ کو ساتھ لاؤ
عباسؑ ، آ کے بھائی کی ہمت تو کچھ بڑھاؤ
مشکل کشائی کیجیے ، مشکل کشاؑ علی
ٹوٹی کمر پہ لاش اٹھاتا ہوں ، یا علی

(۱۰۰)

زینبؑ یہ سن کے خیمے سے نکلیں برہنہ پا
مقتل کی سمت دوڑ پڑیں دے کے یہ صدا
بھیّا ، میں آ رہی ہوں ، توقف کریں ذرا
عباسؑ سا وہ بھائی نہیں ہے تو کیا ہوا
میں رن سے اپنے لال کو خیمے میں لاؤں گی
ساتھ آپ کے جوان کی میّت اٹھاؤں گی

(۱۰۱)

دیکھا بہن کو رن میں جو بے مقنع و ردا
شبیرؑ نے لرز کے کہا ، کیا غضب کیا!
زینبؑ ، یہ کیا ، ابھی تو ہے زندہ یہ بے نوا
ہم کو ابھی سے شام کا منظر دکھا دیا
خیمے میں جاؤ ، بنتِ پیمبرؐ کا واسطہ
زینبؑ ، تمھیں جوانیٔ اکبرؑ کا واسطہ

(۱۰۲)

پلٹی جو رن سے خیمے کو زہرا کی نورِ عین
لاشِ پسر اٹھا کے چلے شاہِ مشرقین
عباسؑ ہیں نہ قاسمؑ و سعدؑ و زہیرؑ قین
فریاد از غریبی و بے یاری حسینؑ
اٹھو، چلیں کہ ہم ابھی زندہ ہیں، دوستو
مولا جواں کی لاش پہ تنہا ہیں، دوستو

(۱۰۳)

ساحر، بس اب خموش کہ ہے جوش پہ بکا
پہلا یہ مرثیہ مرے مولاؑ کی ہے عطا
دستِ طلب بڑھا کے سوئے شاہِ کربلا
کیجیئے زبانِ لاغرِ مغفور میں دعا
مطلب یہی ہے آپ سے بس اس حقیر کا
یا شاہ دیںؑ، قبول ہو ہدیہ فقیر کا

ہلال نقوی

مرثیہ گو شعرا کا تعارف

نوٹ: یہ تعارف ہلال نقوی صاحب نے تقریباً چوبیس برس پہلے لکھا تھا جب اس مرثیہ میں مذکور بہت سے مرثیہ گو زندہ تھے مگر اب رخصت ہو چکے ہیں۔ اس لیئے میں نے ان کے ناموں کے آگے ان کی وفات کے بارے میں لکھ دیا ہے۔ ساحر

جن مرثیہ گو شعرا کا جناب ساحر لکھنوی نے اپنے مرثیہ کے چہرہ میں اشارتاً یا صراحتاً ذکر کیا ہے، ان کا مختصر تعارف حروفِ تہجی کی ترتیب سے سطورِ ذیل میں ملاحظہ فرمایئے۔

اثر: جعفر علی خان اثر لکھنوی شاعر و نقاد کی حیثیت سے شہرت رکھتے ہیں۔ ۱۲ جولائی ۱۸۸۵ء میں لکھنؤ میں ان کی ولادت ہوئی۔ ۱۹۳۲ء میں اثر نے جدید طرز کا پچاس بندوں پر مشتمل ایک مرثیہ کہا جو اہمیت کا حامل ہے۔

اثر جلیلی: اثر جلیلی ریڈیو پاکستان کوئٹہ سے متعلق ہیں، قدیم رنگ کا مرثیہ کہتے ہیں، ہر سال مرثیہ پڑھنے کے لیئے کراچی تشریف لاتے ہیں اور ڈاکٹر یاور عباس کے یہاں مرثیہ پڑھتے ہیں۔ (افسوس اب دنیا سے رخصت ہو چکے۔ ساحر)

اختر: اودھ کے آخری تاجدار نواب واجد علی شاہ اختر۔ ان کے چار ضخیم دیوان موجود ہیں جن میں مرثیے بھی ملتے ہیں، اس کے علاوہ مرثیوں کی تین جلدیں بھی ہیں مرزا دبیر کے شاگرد تھے۔ ان کا شعر ہے:

بچپن سے ان کے دامِ سخن میں اسیر ہوں
میں کم سنی سے عاشقِ نظمِ دبیر ہوں

اصغر: اصغر رضوی۔ نسیم امروہوی کے شاگرد ہیں، عزیز آباد بلاک ۸ فیڈرل بی ایریا میں مقیم ہیں۔ پانچ مرثیے کہے ہیں جواب تک قلمی ہیں۔ (یہ اُس وقت کی بات ہے۔ ساحر)

اطہر: سید علی اطہر جعفری ۱۹۰۷ء میں بمقام ڈیگ ریاست جون پور میں پیدا ہوئے۔ نسیم امروہوی کے شاگرد تھے۔ ۱۹ اگست ۱۹۶۵ء کو وفات پائی۔ ان کے مرثیوں کا مجموعہ "گلدستۂ اطہر" ۱۹۷۳ء میں شائع ہوا، ۱۹۷۷ء میں "گل دستۂ اطہر پر ایک نظر" (مصنف راقم الحروف ہلال نقوی) طبع ہوئی۔

امید: امید میر انیس کے ہم عصر تھے۔ ان کا نام سید محمد جعفر تھا، ۱۲۹۳ھ ان کا سنہ وفات ہے۔ امام باڑہ غفراں مآب کے دالان میں ان کی قبر ہے۔ ان کے بڑے صاحب زادہ محمد کاظم جاوید بھی مرثیہ گو تھے۔ (ان کی شہرت ان کی عرفیت بندۂ کاظم جاوید کے نام سے ہے۔ ساحر)

امید: امید فاضلی ڈبائی ضلع بلند شہر کے باشندہ ہیں۔ بنیادی طور پر غزل کے مشاق شاعر ہیں۔ ۱۹۷۳ء یا ۱۹۷۴ء سے مرثیہ کہنا شروع کیا ہے۔ کراچی کے ایک ادبی رسالہ "الفاظ" سے وابستہ ہیں۔

اُنس: ایک اُنس وہ تھے جو عشق و تعشق کے والد تھے، ان کا پورا نام سید میرزا اُنس لکھنوی تھا (متوفی ۱۸۸۷ء)۔ لیکن اس مرثیہ میں جن اُنس کا ذکر ہے، وہ انیس کے بھائی اور میر وحید کے والد میر مہر علی اُنس ہیں، ان کا سنہ وفات ۱۸۹۰ء ہے۔

انیس: ببر علی انیس وہ شاعر ہیں جن کا اثر انیسویں اور بیسویں صدی کے شعرا پر گہرا ہوا۔ جس شاعر پر سیکڑوں مقالے اور اتنی ہی کتابیں لکھ دی گئی ہوں، اس کا تعارف کیا کرایا جائے۔ سنہ وفات ۱۸۷۴ء ہے، سنہ ولادت پر البتہ تحقیق جاری ہے۔ ضمیر اختر نقوی نے "ماہِ نو" انیس نمبر ۱۹۷۲ء میں صفحہ ۳۵ پر ۱۸۰۱ء لکھا ہے۔ اس سنہ کو کئی محققین نے تسلیم کیا ہے۔

اوج: مرزا محمد جعفر اوج، مرزا دبیر کے صاحب زادہ اور میر انشاء اللہ انشاؔ کے

نواسے تھے۔ ۱۵ فروری ۱۸۵۳ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے، ۱۸ اپریل ۱۹۱۷ء کو انتقال ہوا۔ "معراج الکلام" مرثیوں کی جلد شائع ہو چکی ہے۔

آرزو: سید آلِ رضا کے استاد علامہ انور حسین آرزو کے پانچ مرثیے "خمسۂ متحیرہ" چھپ چکے ہیں۔ پاکستان میں انھوں نے مرثیہ کی دو اہم مجلسیں پڑھیں، ایک زیڈ۔اے۔بخاری کے مکان پر اور ایک خیرپور میں جو نسیم امروہوی کی منعقدہ مجلس تھی۔ ۱۹۵۱ء میں کراچی میں انتقال ہوا، علی باغ میں دفن ہیں۔

آشفتہ: حکیم آشفتہ کا تعلق خاندان اجتہاد سے تھا۔ انھوں نے مرثیہ میں نفسیاتی پہلوؤں کو ابھارنے پر زیادہ توجہ دی۔

اعظمی: مشہور صحافی حسین اعظمی آج کل روزنامہ "اعلان" سے منسلک ہیں تین مرثیے "حرف حق"، "مشعل حق" اور "کشور قلم" طبع ہو چکے ہیں۔ ان کا سنہ ولادت ۱۹۲۳ء ہے۔ (افسوس کہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ ساحر)

آغا: آغا سکندر مہدی رائے بریلی میں پیدا ہوئے۔ "مرثیہ معلیٰ" کے نام سے تین جلدیں چھپ چکی ہیں۔ "جامعۂ امامیہ" میں ہر سال مرثیہ پڑھنے کراچی تشریف لاتے تھے۔ ۱۲ اپریل ۱۹۷۶ء کو بہاول پور میں انتقال ہوا۔

بدر: بدر الہ آبادی ۱۹۰۹ء میں الہ آباد میں پیدا ہوئے، ۱۹۷۶ء میں کراچی میں انتقال ہوا۔ نسیم امروہوی کے شاگرد تھے۔ ۱۹۷۷ء میں ان کے مرثیوں کی ایک جلد "بدر کامل" چھپ چکی ہے۔

برجیس: عصر حاضر کے نامور مرثیہ گو شاعر نسیم امروہوی کے والد اور شمیم امروہوی کے صاحب زادہ اور شاگرد بھی ہیں۔ کم و بیش ۱۲ مرثیے کہے ہیں۔ خواندگی میں بے مثل تھے۔ سنہ وفات ۱۹۱۲ء۔

بنیاد: بنیاد تیموری ۱۳۰۱ھ میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ پڑھت کلاسیکل اور مقبول تھی۔ ۱۹۷۱ء میں کراچی میں وفات پائی۔

بیاں: سید محمد مرتضیٰ ابن سید گوہر علی رضوی، اردو میں "بیاں" تخلص

کرتے تھے اور فارسی میں یزدانی۔ قصبہ جارچہ ضلع بلند شہر سے تعلق تھا۔ تین مرثیوں کی جلد "رنگِ شہادت" ۱۹۷۴ء میں ڈاکٹر صفدر نے شائع کی۔

تعشق: سید میرزا نام اور تعشق تخلص۔ میرزا انس کے صاحب زادہ تھے۔ ۱۸۹۱ء میں انتقال کیا۔ مرثیہ میں تغزل کا رنگ و آہنگ ان کی خاص ایجاد ہے۔ یہ انیس کے ہم عصر تھے:

اگرچہ اور تعشق ہیں کہنے کو ہم عصر
مگر انیس سا کوئی نہ خوش بیاں دیکھا

ثابت: سید افضل حسین ثابت لکھنوی ۱۸۶۲ء میں لکھنو میں پیدا ہوئے "حیات دبیر" اور "دربارِ حسین" ان کی مشہور تصانیف ہیں۔ مرزا اوج کے شاگرد تھے ۱۹۴۱ء میں انتقال ہوا۔ ان کے مراثی کی ایک جلد "صبرِ جمیل المعروف بہ برقِ غم" ۱۹۲۴ء میں طبع ہو چکی ہے۔

ثمر: بادشاہ مرزا ثمر ۱۸۹۳ء میں لکھنو میں پیدا ہوئے۔ تقریباً ۳۰ مرثیے کہے جو قدیم رنگ پر ہیں۔ کراچی میں ۱۹۷۰ء میں انتقال ہوا۔

جاوید: سید محمد کاظم ان کا نام تھا۔ یہ اوج کے ہم عصر تھے۔ ان کے والد سید محمد جعفر امید انیس و دبیر کے دور کے شاعر تھے۔ ان کا تعلق خاندان اجتہاد لکھنو سے تھا۔

جدید: جدید لکھنوی شدید لکھنوی کے شاگرد ہیں۔ ان دنوں لکھنو میں قیام پذیر ہیں۔ جدید انداز کے مرثیے کہتے ہیں۔ (افسوس کہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں ساحر)

جلیس: میر انیس کے پوتے اور میر سلیس کے صاحب زادہ جلیس بھی مرثیہ گو شاعر تھے۔ ۱۹۰۳ء میں عالم شباب میں انتقال ہوا۔

بنیاد: بنیاد تیموری ۱۳۰۱ھ میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ پڑھت کلاسیکل اور مقبول تھی۔ ۱۹۷۱ء میں کراچی میں وفات پائی۔

بیاں: سید محمد مرتضیٰ ابن سید گوہر علی رضوی، اردو میں "بیاں" تخلص

کرتے تھے اور فارسی میں یزدانی۔ قصبہ جارچہ ضلع بلند شہر سے تعلق تھا۔ تین مرثیوں کی جلد "رنگِ شہادت" ۱۹۷۴ء میں ڈاکٹر صفدر نے شائع کی۔

تعشق: سید میرزا نام اور تعشق تخلص۔ میرزا انس کے صاحب زادہ تھے۔ ۱۸۹۱ء میں انتقال کیا۔ مرثیہ میں تغزل کا رنگ و آہنگ ان کی خاص ایجاد ہے۔ یہ انیس کے ہم عصر تھے:

اگرچہ اور تعشق ہیں کہنے کو ہم عصر
مگر انیس سا کوئی نہ خوش بیاں دیکھا

ثابت: سید افضل حسین ثابت لکھنوی ۱۸۶۲ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے "حیات دبیر" اور "دربارِ حسینؑ" ان کی مشہور تصانیف ہیں۔ مرزا اوج کے شاگرد تھے ۱۹۳۱ء میں انتقال ہوا۔ ان کے مراثی کی ایک جلد "صبر جمیل المعروف بہ برقِ غم" ۱۹۲۴ء میں طبع ہو چکی ہے۔

ثمر: بادشاد مرزا ثمر ۱۸۹۳ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ تقریباً ۳۰ مرثیے کہے جو قدیم رنگ پر ہیں۔ کراچی میں ۱۹۷۰ء میں انتقال ہوا۔

جاوید: سید محمد کاظم ان کا نام تھا۔ یہ اوج کے ہم عصر تھے۔ ان کے والد سید محمد جعفر امید انیس و دبیر کے دور کے شاعر تھے۔ ان کا تعلق خاندان اجتہاد لکھنؤ سے تھا۔

جلد نید: جدید لکھنوی شدید لکھنوی کے شاگرد ہیں۔ ان دنوں لکھنؤ میں قیام پذیر ہیں۔ جدید انداز کے مرثیے کہتے ہیں۔ (افسوس کہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ ساحر)

جلیس: میر انیس کے پوتے اور میر سلیس کے صاحب زادہ جلیس بھی مرثیہ گو شاعر تھے۔ ۱۹۱۰ء میں عالم شباب میں انتقال ہوا۔

جلیل: ایک جلیل لکھنوی تھے اور ایک جلیل مانک پوری۔ جلیل مانک پوری امیر مینائی کے شاگرد تھے۔ جلیل لکھنوی کا انتقال لکھنؤ میں اور جلیل

مانک پوری کا حیدر آباد دکن میں ہوا۔ دونوں مرثیہ کے شاعر تھے۔ جلیل لکھنوی کا تعلق خاندان انیس سے تھا۔

جمیل: علامہ جمیل مظہری یکم جنوری ۱۹۰۵ء (یا ستمبر ۱۹۰۴ء) کو پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ "عرفان جمیل" چھ مرثیوں کا مجموعہ ہے جو ڈاکٹر صفدر حسین کے مقدمہ کے ساتھ ۱۹۶۹ء میں لاہور سے شائع ہوا۔ جمیل مظہری نے ۱۹۳۰ء میں پہلا مرثیہ کہا۔ انھیں جدید مرثیہ کی اہم کڑی سمجھنا چاہیئے۔

جوش: شبیر حسن خاں جوش ملیح آبادی ۱۸۹۴ء میں پیدا ہوئے۔ اپنی منفرد اسلوب کی نظموں کے باعث شاعرِ انقلاب کے نام سے شہرت پائی۔ ۱۹۱۸ء میں پہلا مرثیہ کہا لیکن ۱۹۴۰ء کے مرثیہ "حسین اور انقلاب" کی اشاعت سے ممتاز مرثیہ گو شاعروں میں شمار کیئے گئے۔ اب پاکستان میں مقیم ہیں۔ تقریباً ۹ مرثیے کہے ہیں۔ آج کل حکومت کی وزارتِ تعلیم سے وابستہ ہیں۔ (افسوس کہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ ساحر)

جوہر: جوہر نظامی (لاڑکانے والے) یہ پہلے حنفی المذہب تھے۔ اب اثنا عشری ہیں۔ مرثیہ کہتے ہیں۔

حب: مہاراج کمار امیر حیدر خان آف محمود آباد کے بھائی۔ شیعہ پولٹیکل کانفرنس لکھنؤ کے صدر۔ مرثیہ کہتے ہیں اور حب تخلص کرتے ہیں۔

حر: امیر امام حر، راجہ صاحب محمود آباد کے داماد بھی ہیں اور بھانجے بھی۔ امداد امام اثر ان کے دادا تھے۔ حر ۱۹۲۵ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ آپ نے پانچ مرثیے کہے ہیں۔ "سلسلۂ فکر و عمل" کے عنوان سے ایک طویل مسدس (رزمیہ نظم) لکھ رہے ہیں جس کے تقریباً دو ہزار اشعار رسالہ "ارشاد" کراچی میں اب تک چھپ چکے ہیں۔ بیشتر زبانوں کے ادب کا گہرا مطالعہ کیئے ہوئے ہیں۔

حسان: حسان جون پوری ذوالقدر بہادر، شاگردِ میر انیس کے پوتے ہیں۔ جون پور (بھارت) میں رہتے ہیں۔ ایک سال پہلے کراچی تشریف لائے تھے اور مرثیہ کی

کئی مجالس پڑھ گئے۔ان کی پڑھت قابلِ توجہ ہے۔(اُس وقت کی بات ہے، اب نہیں ہیں۔ساحر)

حسن: ضیاءُالحسن موسوی، جناب ناصر الملت کے نواسے ہیں۔عربی علوم کے باکمال شاعر ہیں ۱۹۲۳ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔۱۹۴۶ء میں پہلا مرثیہ "خطبہ شقشقیہ" کہا۔ان کے بارے میں وحید الحسن ہاشمی کی رائے ہے:" تمام جدید مرثیہ نگاروں میں نسیم امروہوی کے بعد بَین نظم کرنے میں خاص ملکہ رکھتے ہیں"(عظمتِ انسان، ص ۲۸۳)۔(افسوس کہ اب رخصت ہو چکے۔ساحر)

حُسین: چھنگا صاحب حُسین خاندان اجتہاد کے ایک فرد تھے۔فدا علی خنجر نے اپنے ایک مقالہ میں لکھنؤ کے ان پڑھ شعراٗ میں ان کا بھی ذکر کیا ہے۔یہ مرثیہ کے پہلے شاعر ہیں جو پیدائشی نابینا تھے۔ان کی ایک صاحب زادی نارتھ کراچی میں مقیم ہیں۔(یہ تحقیق بالکل غلط ہے۔وہ میرے بزرگ تھے۔میں جانتا ہوں کہ پیدائشی نابینا ہونا تو درکنار، زندگی کی آخری سانس تک ان کی بصارت متاثر نہیں ہوئی تھی۔ساحر)

خاکی: ڈاکٹر مسعود رضا خاکی ۱۹۲۹ء میں میرٹھ میں پیدا ہوئے۔"سرشار کی ناول نگاری" پر ۱۹۴۸ء اور ۱۹۵۲ء کی درمیانی مدت میں پنجاب یونیورسٹی سے پی ایچ۔ڈی کیا۔سیماب اکبرآبادی ان کے استاد تھے۔دو مرثیے چھپ چکے ہیں۔

خبیر: مرزا اوج کے شاگردوں میں خبیر لکھنوی نے بڑی شہرت پائی۔۳۰ اکتوبر ۱۸۹۷ء کو ولادت ہوئی، ۷ جون ۱۹۶۵ء میں انتقال ہوا۔"بدرِ کامل" ان کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔یہ مجموعۂ مراثی دو جلدوں میں شائع ہو چکا ہے۔اس میں چودہ معصومین کے حال میں ۱۴ مرثیے ہیں۔

خلیق: میر مستحسن خلیق خود بھی نامور شاعر اور نامور شاعر میر انیس کے والد اور میر حسن کے بیٹے۔نائب حسن نقوی نے نئی دہلی کے رسالہ "آج کل" کے انیس نمبر (۱۹۷۵ء) میں صفحہ ۵۷ پر ان کے مرثیوں کی ۳۲۲ تعداد کا ذکر کیا ہے۔سنہ ولادت ۱۱۸۱ھ ہے۔

خورشید: نام سید اصطفیٰ حسین، عرفیت مولوی لڈن صاحب اور تخلص خورشید۔ سید محمد جعفر امید کے بھانجے اور مولوی دلدار علی صاحب مجتہد العصر کے نواسے۔ ۱۹۰۱ء میں انتقال ہوا۔ (اس تحقیق میں یہ غلطیاں ہیں: (۱) نام سید محمد اصطفیٰ تھا نہ کہ اصطفیٰ حسین (۲) عرفیت لڈن صاحب تھی نہ کہ مولوی لڈن (۳) حضرت امید کے بھانجے نہیں تھے، سگے چچازاد بھائی اور شاگرد تھے (۴) مولوی دلدار علی صاحب (حضرت غفراں مآب) کے نواسے نہیں تھے، پرپوتے تھے اور حضرت سلطان العلماء کے پوتے تھے۔ ساحر)

دانش: صفی حیدر دانش راولپنڈی میں ہر سال مرثیہ پڑھتے ہیں، تقریباً ۵ مرثیے کہے ہیں۔

دبیر: مرزا سلامت علی دبیر ۲۹ اگست ۱۸۰۳ء کو دہلی کے محلہ بلّی ماران میں پیدا ہوئے۔ ضمیر کے نامور شاگرد، انیس کے ہم عصر اور مدِ مقابل تھے۔ کثرت سے مرثیے کہے ہیں۔ ۱۸۷۵ء میں انتقال ہوا۔

دلگیر: فصیح، خلیق اور ضمیر کے ہم عصر چھنولال دلگیر کے مرثیوں کی سات ضخیم جلدیں مطبع نول کشور سے چھپ چکی ہیں۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے "لکھنؤ کا دبستان شاعری" میں ان کے شعروں کی تعداد ۹۲ ہزار ۵ سو بتائی ہے۔ دلگیر کا سنہ ولادت تقریباً ۱۷۸۳ء ہے۔

ذاخر: سید فرزند حسین ذاخر، میر وارث کے صاحب زادہ تھے۔ ان کا انتقال ۱۹۳۲ء میں ہوا۔ تعلق خاندان اجتہاد سے تھا۔ مرثیہ نگاری کے علاوہ نوحہ گوئی کو اس منزل کمال پر پہنچایا کہ "دعبل ہند" مشہور ہوئے۔

رائق: کیکا بھائی صالح بھائی بوہرہ اجین کے رہنے والے اور وہاں بواہر کی گلشن نجمی انجمن کے منتظم ہیں۔ مرثیہ خواں بھی ہیں اور مرثیہ گو بھی، عمر تقریباً ۷۰ سال ہے۔

رشید: سید مصطفیٰ مرزا عرف پیارے صاحب رشید انیس کے نواسے اور عشق اور تعشق کے بھتیجے تھے۔ مرثیہ میں "ساقی نامے" انھوں نے بہت کثرت سے نظم کیئے ہیں۔ ۱۹۱۷ء میں انتقال ہوا۔

رضا: سید آل رضا جون ۱۸۹۵ء میں نیوتنی ضلع اناؤ میں پیدا ہوئے۔ بنیادی طور پر غزل گو شاعر تھے۔ ۱۹۳۹ء میں پہلا مرثیہ کہا۔ ۲۰ مرثیے کہہ چکے ہیں (دیکھیئے "جدید مرثیہ کے تین معمار")۔ بقول فاضل لکھنوی "جدید مرثیہ" کے نقیبوں میں شامل ہیں (دیکھیئے۔ نفس مطمئن")۔

رضی: ۱۹۱۷ء میں کھیری تل میں پیدا ہوئے۔ دو مرثیے کہہ چکے ہیں۔ یہ دونوں مرثیے نسیم امروہوی کے اصلاح کردہ ہیں۔ ان کی پڑھت میں دبیریت کے تیور نمایاں ہیں۔

رفیع: مرزا اوج لکھنوی کے صاحب زادہ اور مرزا دبیر کے پوتے مرزا محمد طاہر رفیع ۲۴ جنوری ۱۸۶۷ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور ۱۹۲۸ء میں انتقال ہوا۔ دربار رام پور سے مرثیہ گو کے طور پر وابستہ تھے۔

رئیس: رئیس امروہوی دنیائے صحافت وادب کی مشہور شخصیت ہیں۔ ان کا ایک مرثیہ "حسینؑ اور حسینیت" شائع ہو چکا ہے۔ یہ اردو میں سب سے پہلا مختصر مرثیہ ہے جو منظرِ عام پر آیا اور بعد میں اس نمونہ کے مختصر مرثیہ کا رواج ہوا۔ آپ کسی کے شاگرد نہیں مگر تین سو کے قریب آپ کے شاگرد ہیں۔ ("گلزار خاص" ص ۱۷: خلش پیر اصحابی)

ریاض: میر ریاض الدین ریاض بارہہ کے باکمال شاعروں میں شمار کیئے جاتے ہیں۔ میر انیس کے شاگرد تھے۔ فن تحت خوانی میں بھی بے مثل تھے۔

زائر: سید محمد اطہر زائر سیتاپوری ۱۹۱۲ء میں پیدا ہوئے۔ انتقال ۱۹۹۹ء میں ہوا۔ انھوں نے جدید طرز کے مرثیے کہہ کر مرثیہ کے ارتقائی سفر میں نمایاں حصہ لیا ہے ان کے بھائی نادم سیتاپوری نے مجھے زائر کے مرثیوں کی تعداد ۱۸ بتائی ہے۔

زکی: منے آغا صاحب زکی میر انیس کی نواسی کے بیٹے، پیارے صاحب رشید کے شاگرد اور داماد، تقسیم کے بعد لکھنؤ میں انتقال ہوا۔

زیبا: نجم آفندی کے شاگردوں میں زیبا ردولوی انتہائی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کے صاحب زادہ کے پاس ان کے چھ قلمی مرثیے موجود ہیں۔ ان کا سنہ ولادت ۱۹۰۷ء ہے۔ انتقال جولائی ۱۹۶۸ء میں کراچی میں ہوا۔

سردار: مشہور ترقی پسند شاعر علی سردار جعفری مشہور شاعر و نقاد ہیں، ہندوستان کی فلمی دنیا سے وابستہ ہیں۔ انھوں نے مرثیے بھی کہے ہیں۔ انھوں نے اپنی تصانیف "لکھنؤ کی پانچ راتیں" میں یہ اظہار کیا ہے کہ انھوں نے انیس کے زیر اثر مرثیے کہے۔ (افسوس کہ اب نہیں ہیں۔ ساحر)

سردار: سردار نقوی کا تعلق امروہہ سے ہے۔ فرزدقِ ہند حضرت شمیم امروہوی کی نواسی کے بیٹے ہیں۔ تقریباً دس بارہ مرثیے کہہ چکے ہیں۔ جیالوجی کے ایم۔ اے ہیں اور ایک مقامی کالج میں لکچرار ہیں۔ بورڈ آف انٹرمیڈیٹ کراچی کے سکریٹری بھی رہ چکے ہیں۔

سکندر: "تذکرۂ میر حسن"، "تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا" اور "تذکرۂ ہندی" وغیرہ میں سکندر کا ذکر ملتا ہے۔ خلیفہ محمد علی سکندر کا تعلق پنجاب سے تھا۔ ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی نے تعارف مرثیہ میں صفحہ ۱۸ پر اسے مسدس کی ہیئت میں مرثیہ کہنے والا شاعر قرار دیا ہے۔ اس کا سنہ وفات ۱۸۰۰ء ہے۔ اس کا ایک بہت مشہور مرثیہ آج بھی شہرت رکھتا ہے: ہے روایت شترا سوار کسی کا تھا رسول

سلیس: میر سلیس انیس کے صاحب زادے ہیں، عمر میں نفیس سے چھوٹے تھے۔ ان کے تین صاحب زادے میر جلیس، میر قدیم اور نواب محمد غیور شاعر تھے۔

سودا: مرزا محمد رفیع سودا کا دور ۱۷۱۳ء سے ۱۷۸۱ء تک ہے۔ رام بابو سکسینہ نے انھیں مسدس کی شکل میں مرثیہ کہنے والا پہلا شاعر لکھا ہے (تاریخ ادب اردو، ص ۳۱۲)۔

مرثیہ کو اہم صنفِ سخن کا درجہ دے کر اس کا وقار قائم کرنے میں سودا کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ **شاد:** شاد عظیم آبادی کا انتقال ۱۹۲۷ء میں ہوا۔ شاد نہ صرف مرثیہ گو بلکہ غزل کے بھی بہترین شاعر تھے، تنقیدی ذہن کے مالک تھے۔ مرثیہ گو شعرأ کے حالات اور کلام پر انھوں نے قابلِ قدر سرمایہ چھوڑا ہے۔

شاداں: شاداں کا تعلق دہلی سے ہے۔ چھ یا سات مرثیے کہہ چکے ہیں۔ کراچی میں مقیم ہیں اور اسٹیٹ بینک آف پاکستان میں ملازم ہیں۔

شاعر: مولوی سید اولاد حسین شاعر لکھنوی حضرت ذاکر لکھنوی کے صاحب زادہ تھے، خطیبِ اعظم شمس العلمأ سید سبط حسن کے بھتیجے، نہایت بلند پایہ مرثیہ گو، ہمہ رنگ شاعر، اعلیٰ مرتبہ کے نثرنگار، بے مثل خطیب، مؤرخ اور صحافی تھے۔

شاہد: شاہد نقوی ۱۹۱۷ء میں شکارپور ضلع بلند شہر میں پیدا ہوئے۔ ہر سال رضویہ امام بارگاہ میں مرثیہ پڑھتے ہیں۔ ان کے ۸ مرثیوں کی جلد "نفسِ مطمئن" ۱۹۷۹ء میں شائع ہو چکی ہے۔

شدید: پیارے صاحب رشید کے نواسے سجاد حسین شدید لکھنوی لکھنؤ میں قیام پذیر ہیں۔ یہ میر انیس کے شاگرد خلد لکھنوی کے بیٹے ہیں۔ "ریاضِ شدید" کے نام سے تین جلدیں چھپ چکی ہیں۔ ۱۹۵۴ء یا ۱۹۵۵ء میں ڈاکٹر یاور عباس کے مکان پر ایک مجلس پڑھ چکے ہیں اور ایک محفل شاہِ خراسان کراچی میں۔

شمیم: "خمخانۂ جاوید" میں لالہ سری رام نے شمیم امروہوی کا سنہ پیدائش ۱۸۳۹ء لکھا ہے لیکن شمیم امروہوی کے پوتے نسیم امروہوی نے مجھے ۱۸۳۹ء بتایا ہے۔ ان کا فرمان ہے کہ لالہ سری رام کی تحقیق غلط ہے۔ انتقال ۱۹۱۳ء میں ہوا۔ "ریاضِ شمیم" ۱۷ مرثیوں کی جلد ہے جو اب نایاب ہے۔ شمیم اوج کے ہم عصر تھے۔ ان کے صاحب زادہ اور نسیم امروہوی کے والد برجیس بھی مرثیہ گو تھے۔

شوکت: شوکت تھانوی کا نام محمد عمر تھا، بندرابن ضلع متھرا میں ۱۹۰۶ء میں پیدا ہوئے۔ صرف ایک مرثیہ "شہادتِ عظمیٰ" لکھا جو ڈاکٹر یاور عباس کے مکان پر

ایک مجلس میں پیش کیا گیا۔

شہید: شہید لکھنوی کا انتقال نومبر ۱۹۷۷ء میں ہوا۔ شدید لکھنوی کے شاگرد تھے۔ ابتدائی مرثیوں پر نسیم امروہوی سے اصلاح لی تھی۔

شہید صفی پوری: مرثیہ گو شاعر ہیں۔ شیعہ کالج لکھنو میں پروفیسر ہیں۔ نقاد و ادیب کی حیثیت سے شہرت رکھتے ہیں۔

صابر: صابر تھاریانی ۱۹۰۷ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۷۲ء میں کراچی میں انتقال ہوا۔ بمبئی میں کئی گجراتی اور اردو اخبارات کے اڈیٹر تھے۔ گجراتی کے مستند شاعر تھے۔ جوش نے گجراتی نظموں کا اردو میں ترجمہ کیا۔ نسیم امروہوی کے صاحب دیوان شاگرد تھے۔

صبا: صبا اکبر آبادی ۱۴ اگست ۱۹۰۸ء کو آگرہ میں پیدا ہوئے۔ ان کا نام خواجہ محمد امیر ہے۔ کئی مرثیے کہہ چکے ہیں۔ (افسوس کہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ ساحر)

صفدر: ڈاکٹر سید صفدر حسین کاظمی ۱۲ مئی ۱۹۱۹ء کو سادات باہرہ کے قصبہ تسہ ضلع مظفر نگر میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۵۷ء میں پنجاب یونیورسٹی سے پی ایچ۔ ڈی کیا۔ ان کے مرثیے جو الگ الگ چھپتے رہے ہیں، اب ۱۹۷۹ء میں مجموعہ کی شکل میں "لبِ فرات" میں شائع ہوئے ہیں۔ اردو ادب خصوصاً اردو مرثیہ پر ہمہ وقت تحقیق کرنے والوں میں نمایاں حیثیت کے مالک ہیں، کئی کتابوں کے مصنف اور مؤلف ہیں۔ ان کی پڑھت کا انداز مشہور ہے۔ آج کل ڈائرکٹر توسیع تعلیم و تخصیصی تعلیم پنجاب کے طور پر کام کر رہے ہیں، لاہور میں مقیم ہیں۔ (افسوس کہ اب اس دنیا سے رخصت ہو چکے۔ ساحر)

ضمیر: واجد علی شاہ کے عہد سلطنت میں میر ضمیر کا انتقال ۶ نومبر ۱۸۵۵ء میں ہوا۔ مرثیہ کے اجزا پہلی بار باقاعدہ طور پر مرثیہ میں ایک تنظیم کے ساتھ پیش کرنے میں ضمیر کا نام مرثیہ گویوں کی فہرست میں سب سے اوپر ہے۔

ظریف: ریاست الور کے رہنے والے تھے۔ جبل پور میں ملازم ہوئے، چنانچہ جبل پوری مشہور ہوئے۔ اصلاً مزاح گو شاعر تھے۔ ایک یا دو مرثیے کہے ہیں۔

۱۹۶۴ء میں کراچی میں انتقال ہوا۔

ظفر: ظفر جون پوری ۱۹۲۷ء میں پیدا ہوئے۔ چھ سات مرثیے کہے ہیں جو غیر مطبوعہ ہیں۔ ان دنوں جامعۂ کراچی کے شعبۂ معارفِ اسلامیہ سے منسلک ہیں۔ آلِ رضا کے شاگرد رہے ہیں۔ (افسوس کہ اب اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔ ساحرؔ)

عارف: عارف میر نفیس کے نواسے، والد کا نام سید محمد حیدر تھا۔ جنگِ آزادی کے دو برس بعد ۱۸۵۹ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے ایک صاحب زادہ سید یوسف حسین ناظم آباد کراچی میں مقیم ہیں۔ موصوف نے ایک بار مجھ سے فرمایا تھا کہ ڈاکٹر صفدر حسین، عارف کے مرثیے شائع کرنے والے ہیں۔ عارف کا انتقال ۱۹۱۹ء میں ہوا۔

عروج: میر خورشید حسن عرف دولھا صاحب عروج، میر انیس کے پوتے اور نفیس کے صاحب زادہ تھے۔ ۳۱ مئی ۱۹۳۱ء کو انتقال ہوا۔ ان کی پڑھت بڑی شہرت رکھتی ہے۔

عزم: عزم جون پوری سید آلِ رضا کے شاگرد تھے۔ ۱۹۰۷ء میں جون پور میں پیدا ہوئے اور ۱۹۷۶ء میں کراچی میں انتقال ہوا۔ ۱۹۵۹ء میں پہلا مرثیہ کہا۔ مراثی اب تک غیر مطبوعہ ہیں۔

عشق: سید محمد میرزا انس کے صاحب زادہ اور تعشق کے بھائی ۱۸۸۷ء میں انتقال ہوا۔ دو جلدیں چھپ چکی ہیں۔ ڈاکٹر مسیح الزماں نے عشق کا ذکر "اصلاحِ زبان کی تحریک کے سربراہ" کہہ کر کیا ہے ("اردو مرثیہ کا ارتقا،" ص ۳۱۹)۔

عظیم: عظیم امروہوی ۹ اپریل ۱۹۳۶ء کو امروہہ میں پیدا ہوئے اور اب وہیں محلہ مجاپوتہ میں رہتے ہیں۔ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ ۱۹۷۴ء میں مرثیہ پر بھی توجہ دی۔ اب تک چار مرثیے کہہ چکے ہیں۔ امروہہ کے مشہور بزرگ عالم مولوی عبادت صاحب عظیم کے استاد ہیں۔

عقیل: نام سید صادق حسین۔ نفیس اور فاخر کے ہم عصر تھے۔ خاندانِ اجتہاد سے تعلق تھا۔ نوحے بھی کہتے تھے۔ کئی مرثیے کہے لیکن کوئی مرثیہ شائع نہیں

ہوا۔

فاخر: نواب اصغر حسین فاخر جناب مہدی حسین ماہر کے شاگرد بھی تھے اور بھتیجے بھی۔ نفیس کے ہم عصر تھے اور کثیر التلامذہ تھے۔ پانچ دیوان غزلوں کے شائع ہوئے لیکن مرثیے غیر مطبوعہ ہیں۔ ذاکر صاحب کے استاد بھی تھے اور ماموں بھی تعلق خاندان اجتہاد سے تھا۔

فارغ: سید محمد افضل ابن سید طاہر علی، فارغ تخلص۔ ۲۷ جنوری ۱۸۴۳ء کو پیدا ہوئے۔ سیتاپور سے تعلق تھا۔ ڈاکٹر صفدر آہ کی ان سے متعلق ایک تصنیف "فردوسِ ہند" ہے۔ فارغ سیتاپوری میر انیس کے شاگرد تھے۔ ۱۹ صفر ۱۳۱۸ھ میں انتقال ہوا۔

فائز: خورشید حسن نام، للن عرفیت، فائز تخلص۔ میر انیس کے سلسلۂ نسب کے آخری چشم و چراغ اور دولھا صاحب عروج کے بیٹے۔ گیارہ مرثیے غیر مطبوعہ ہیں۔ جب تک زندہ رہے، میر انیس کی سالانہ ۲۵ رجب والی مجلس ناظم صاحب کے امام باڑہ (لکھنؤ) میں پڑھتے رہے۔

فائق: سید ظفر حسن بابو صاحب فائق عارف کے صاحب زادہ اور شاگرد بھی تھے۔ ۱۹۴۴ء میں انتقال ہوا۔ مزار انیس کے پہلو میں دفن ہیں۔ ان کے صاحب زادہ اصغر حسین ناظم آباد کراچی میں مقیم ہیں (تھے۔ ساحر)۔ تقریباً گیارہ مرثیے کہے جو غیر مطبوعہ ہیں۔

فراست: سید فراست حسین فراست زیدپوری ۲۶ جون ۱۸۷۱ء کو زیدپور ضلع بارہ بنکی میں پیدا ہوئے۔ ان کے مرثیوں کی تین جلدیں "ماہِ کامل"، "تصویرِ وفا" اور "ماہِ ناتمام" چھپ چکی ہیں۔ "ماہِ کامل" (۱۹۲۱ء) میں دو ہزار بند ہیں جن میں پوری تاریخ اہل بیتؑ نظم کی گئی ہے۔ اکتوبر ۱۹۵۲ء میں انتقال ہوا۔

فرید: سلطان صاحب فرید۔ میر انس کے پوتے، اور وحید کے بھتیجے تھے۔ ان کے مرثیے غیر مطبوعہ ہیں۔

فصیح: فصیح کا سنہ پیدائش مصحفی نے "ریاض الفصحا" میں ۱۷۸۲ء میں لکھا ہے فصیح کی زبان بہت منجھی ہوئی ہے۔ شاد عظیم آبادی نے ان کی چار جلدوں کا تذکرہ "پیغمبرانِ سخن" میں کیا ہے۔ فصیح کے بھائی مرزا نجف علی بلیغ کے پروتے جناب نجم آفندی اس عہد کے نامور شاعر تھے۔

فہیم: سید ساجد حسین نام، فہیم تخلص۔ جاوید اور ذاخر کے ہم عصر تھے۔ خاندان اجتہاد سے تعلق تھا۔ ریاض جنتری میں ان کے مرثیوں کا ذکر ہے اور بعض مرثیوں کے مطلعے بھی درج ہیں۔

فیض: فیض بھرت پوری، نسیم امروہوی کے شاگرد ہیں۔ ۱۱ نومبر ۱۹۱۱ء کو بھرت پور میں پیدا ہوئے۔ "مراثیِ فیض" طبع ہو چکی ہے۔ شہدائے ٹھیری سے متعلق ان کا ایک مرثیہ "داستان قلم" ۱۹۷۷ء میں شائع ہوا ہے جس میں نیا انداز اور نئی سمت ہے۔

فیض: فیض احمد فیض ۱۹۱۲ء میں سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ عربی میں ایم۔ اے کیا۔ غزل اور نظم کے پانچ مجموعے چھپ چکے ہیں۔ ۱۹۷۲ء میں ان کا ایک مرثیہ "اخبارِ جہاں" میں شائع ہوا ہے اور ایک غیر مطبوعہ ہے۔

فیضی: فیضی راولپنڈی میں مقیم ہیں۔ ہر صنفِ سخن پر طبع آزمائی کرتے ہیں چند مرثیے بھی کہے ہیں۔

قدیم: نبیرگانِ میر انیس میں خاص شہرت کے مالک تھے۔ بہت زود گو اور خوش فکر شاعر تھے۔ مزاج میں انکسار، سادگی اور متانت تھی۔ توکل کی زندگی بسر کرتے تھے۔ دولھا صاحب عروج کے ہم عصر تھے۔

قسیم: نسیم امروہوی کے صاحب زادہ قسیم ابن نسیم ۱۹۲۲ء میں خیالی گنج لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ اب تک چار مرثیے کہہ چکے ہیں۔ ۱۹۴۲ء سے مرثیہ گوئی شروع کی "اتحادِ ملت" کے نام سے ایک مرثیہ چھپ چکا ہے جس میں ابراہیم جلیس اور راقم الحروف (ہلال نقوی) کا مقدمہ شامل ہے (ناشر: سید علی سید امروہوی)۔

قطب: قلی قطب شاہ گولکنڈہ کے چوتھے حکمراں ابراہیم قلی کا بیٹا اور جانشین تھا۔اس کا دور ۱۵۸۰ء سے ۱۶۱۱ء تک کا ہے۔ قطب شاہ کی کلیات مجلس اشاعتِ دکنی مخلوطات حیدر آباد نے ۱۹۴۰ء میں شائع کی جس میں مرثیے بھی ملتے ہیں۔ یہ نہ صرف اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر ہے بلکہ پہلا مرثیہ گو بھی ہے۔

قلق: مولانا حکیم شیخ مولا بخش قلق میرٹھ کے رہنے والے تھے اور طب میں نقشبند خاں دہلوی کے شاگرد تھے۔ مومن خاں اور امام بخش صہبائی سے شعرو سخن میں استفادہ کیا۔ ۵ اگست ۱۸۸۳ء کو انتقال ہوا۔

قمر: غزل کے مشہور شاعر۔ انھیں "استاد" کے نام سے مخاطب کیا جاتا تھا۔ جلالی کے باشندہ تھے۔ انیس کے انتقال سے دو سال قبل ۱۸۷۲ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۶۸ء کو کراچی میں انتقال ہوا۔ ان کے مرثیے بھی چھپ چکے ہیں۔

قیصر: قیصر بارھوی مرثیہ کے مشہور شاعر ہیں۔ پنجاب کے شہروں اور دیہاتوں میں اپنے مخصوص ترنم کے ساتھ مرثیہ پڑھتے ہیں۔ بقول خود انھیں کے اب تک ۷۵ کے قریب مرثیے کہہ چکے ہیں۔ انھوں نے امام حسینؑ کے علاوہ باقی ائمہ پر بھی مرثیے کہے ہیں۔ (افسوس کہ وہ بھی رخصت ہو چکے۔ ساحر)

کامل: نفیس کے ہم عصروں میں مولوی سید علی میاں کامل لکھنوی مشہور مرثیہ گو تھے، ۱۹۰۷ء میں وفات پائی۔ "معیارِ کامل" جلد اول ۱۹۵۱ء میں چھپ چکی ہے۔ اسے مہذب لکھنوی صاحب نے مرتب کیا ہے۔

کرار: ۱۹۱۱ء میں کرار جون پوری کی ولادت ہوئی۔ ظریفانہ لٹریچر میں نئے نئے راستوں کے خالق ہیں۔ "ہرسیہ" کے باقاعدہ شاعر ہیں۔ مرثیے بھی کہتے ہیں۔ (افسوس کہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ ساحر)

گدا: رجب علی بیگ سرور نے "فسانۂ عجائب" میں جن شاعروں کا تذکرہ کیا ہے، ان میں گدا کا نام بھی ملتا ہے۔ اس نے باقاعدہ مرثیے کہے ہیں۔ اس کا سنہ ولادت ۱۷۳۵ء اور سنہ وفات ۱۸۱۹ء ہے۔

ماہر: نواب مہدی حسین ماہر کا تعلق خاندان اجتہاد سے تھا۔ ۱۹۱۰ء میں انتقال ہوا (یہ تاریخ غلط ہے۔ ان کا انتقال ۱۳۲۵ھ مطابق ۱۹۰۷ء میں ہوا تھا۔ ساحر)۔ کہا جاتا ہے کہ عزیز لکھنوی کا قول تھا کہ "اگر ماہر کا کلام انیس کے نام سے پیش کر دیا جائے تو پڑھنے والا غالباً مشکوک نہ ہو گا" (مرثیہ بعد انیس از ڈاکٹر صفدر، ص ۶۹)۔ فاخر لکھنوی کے چچا بھی تھے اور استاد بھی۔

محب: راجہ صاحب محمود آباد محبوب کے والد بھی محب تخلص کرتے تھے۔ مہاراجہ محب کا انتقال ۲۱ مئی ۱۹۳۱ء کو ہوا۔ ان کے مرثیوں کا مجموعہ "مراثیِ محب" چھپ چکا ہے۔

محبوب: راجہ صاحب محمود آباد، تخلص محبوب غالباً گیارہ یا بارہ مرثیے کہے ہیں جن میں سے کئی چھپ چکے ہیں۔ ۱۹۷۳ء میں لندن میں انتقال ہوا۔ امام علی رضا کے روضہ میں دفن ہیں۔

مسکین: میر محمد مہدی دہلوی، مسکین تخلص۔ عہد محمد شاہی کا مشہور مرثیہ گو ہے۔ اس کا زمانہ ۱۷۴۰ء سے ۱۷۶۵ء تک ہے۔ سودا نے مسکین کو سرآمد مرثیہ گویاں لکھا ہے۔ درگاہ نے "مرقع دہلی" میں مسکین کا تذکرہ بڑی اہمیت کے ساتھ کیا ہے۔

منظر: منظر عظیمی، مرزا دبیر کے شاگرد، عظیم کے پوتے ہیں۔ ۱۹۰۵ء میں ولادت ہوئی۔ ان کے مرثیے غیر مطبوعہ ہیں۔ منظر ان دنوں کراچی میں قیام پذیر ہیں۔ (افسوس کہ اب نہیں ہیں۔ ساحر)

منظور: ڈاکٹر سید منظور مہدی رائے پوری نسیم امروہوی کے شاگرد تھے۔ ۱۹۶۵ء میں ان کے مراثی کی جلد شائع ہو چکی ہے۔ سنہ وفات ۱۹۶۶ء ہے۔

مؤدب: سلسلۂ خاندان عشق کے نامور مرثیہ گو۔ مؤدب لکھنوی نے کئی مرثیے کہے ہیں لیکن تمام غیر مطبوعہ ہیں۔

مونس: خلیق کے صاحب زادہ اور میر انیس کے بھائی، ۱۸۷۹ء میں انتقال ہوا۔ انھوں نے سلام بہت عمدہ کہے ہیں۔ شاد عظیم آبادی نے ان کی سلام نگاری پر

پیغمبران سخن میں اظہار خیال کیا ہے۔

مہذب: مؤدب لکھنوی کے بیٹے اور شاگرد۔ مرثیوں کی تین جلدیں چھپ چکی ہیں۔ ان دنوں لکھنؤ میں قیام ہے۔ آج کل ایک ضخیم لغت لکھنے میں مصروف ہیں جس کا نام مہذب اللغات ہے۔ (افسوس ہے کہ اس دنیا سے رخصت ہو چکے۔ ساحر)

میر: میر تقی میر ۱۱۳۶ھ میں آگرہ میں پیدا ہوئے، ۱۲۲۵ھ میں لکھنؤ میں وفات پائی۔ اردو غزل کے نامور شاعر ہیں۔ پانچ دیوان غزلیات کے ہیں اور چھٹا دیوان مرثیوں کا ہے۔

نانک: نانک چند نانک مذہباً ہندو تھے۔ نظامی پریس نے ان کے دو مرثیے شائع کیے ہیں۔ پیارے صاحب رشید کے شاگرد تھے۔

نجم: نوحے اور سلام کو نئے تیور دینے میں نجم آفندی کا مقام بہت بلند ہے۔ انھوں نے دو مرثیے "معراج فکر" اور "فتح مبین" کہے ہیں۔ ۱۸۹۳ء میں ولادت ہوئی اور ۱۹۷۵ء میں کراچی میں انتقال ہوا۔ نجم آفندی کی زندگی اور ان کے ادبی کارناموں پر بزم نجم آفندی نے ۱۹۷۷ء میں ایک شاہکار ضخیم مجلہ "النجم" شائع کیا ہے۔

ندیم: حکیم ندیم لکھنؤ کے باشندہ تھے۔ چند سال پیشتر کراچی میں انتقال ہوا۔

نسیم: ۱۹۰۸ء میں امروہہ میں ولادت ہوئی۔ ۱۹۲۳ء میں پہلا مرثیہ کہا۔ اب تک ۱۷۶ مرثیے کہہ چکے ہیں۔ ان کے کئی شاگردوں کے مرثیوں کی جلدیں چھپ چکی ہیں فاضل لکھنوی نے آپ کو جدید مرثیہ کا سربراہ کہا ہے (" نفس مطمئن ")۔ کراچی میں مقیم ہیں اور ۱۹۶۱ء سے مرکزی حکومت کے عظیم منصوبہ کے مطابق اردو ڈکشنری ۱۳ جلدوں میں مرتب کر رہے ہیں جس کا نام "تاریخی اردو لغت" ہے۔ (افسوس کہ وہ بھی رحلت کر چکے۔ ساحر)

نسیم: نسیم بہرسری داغ کے شاگرد تھے۔ ریاست الور میں مشہور بہرسری سادات کے فرد تھے۔ کئی مرثیے تصنیف کیے جو بہت مقبول ہوئے۔ جس علاقہ کے وہ باشندہ ہیں، اس علاقہ میں ان جیسا مرثیہ گو شاید ہی پیدا ہوا ہو۔ غزل بھی خوب کہتے

تھے۔

نظر: نظر جعفری رام پور میں پیدا ہوئے اور رہنے والے میمن ضلع بجنور کے ہیں۔ سنہ ولادت ۱۹۳۵ء ہے۔ غالباً تین مرثیے کہے ہیں۔ غزل، نعت، سلام اور منقبت کے بھی مشہور شاعر ہیں۔ (افسوس کہ اب نہیں ہیں۔ ساحر)

نفیس: ۱۸۱۹ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۰۱ء میں انتقال ہوا۔ انیس کے سب سے بڑے صاحب زادہ تھے۔ انیس کی اولاد میں انھیں سب سے بہتر مرثیہ گو قرار دیا جاتا ہے۔

نفیس: ۱۹۱۴ء میں فتح پور ہسوہ میں نفیس کی ولادت ہوئی۔ ان کے مرثیوں کی جلد "افکارِ نفیس" ۱۹۷۷ء میں شائع ہو چکی ہے۔

نوری: کرار نوری ریڈیو پاکستان کراچی سے منسلک ہیں، اصل وطن دلی ہے بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ مرثیے بھی کہے ہیں لیکن یہ سلسلہ اب ختم ہو چکا ہے۔ (وہ بھی اس دنیا میں نہیں ہیں۔ ساحر)

نیر: مقبول حسین نیر کراچی میں قیام پذیر ہیں۔ کافی تعداد میں مرثیے کہے ہیں جو غیر مطبوعہ ہیں۔ (افسوس کہ وہ بھی رخصت ہو چکے۔ ساحر)

وحشی: ڈاکٹر تقھونی لال دھون وحشی مظفر نگری پی ایچ۔ ڈی آج کل پٹنہ میں مقیم ہیں۔ جمیل مظہری کے شاگرد ہیں۔ (وہ پی ایچ۔ ڈی نہیں تھے۔ ساحر)

وحید: سید محمد ہادی وحید، میر مہر علی انس کے صاحب زادہ اور انیس کے بھتیجے تھے۔ ۱۸۳۲ء میں ان کی ولادت ہوئی اور ۵۴ سال کی عمر میں ۱۸۸۶ء میں انتقال ہوا۔

وحید: مشہور ادیب و نقاد وحید اختر علی گڑھ یونیورسٹی میں صدر شعبہ فلسفہ ہیں۔ انھوں نے جدید رنگ کے چند مرثیے لکھے ہیں۔

وصی: سید آل رضا کے شاگرد تھے۔ فیض آباد سے تعلق تھا۔ ۱۹۱۷ء میں پیدا ہوئے۔ جناب آل رضا نے اپنے ایک خط میں، جو میرے نام ہے، اپنے چار شاگردوں،

وصی فیض آبادی، عزم جون پوری، وحید الحسن ہاشمی اور ظفر جون پوری کا ذکر کیا ہے۔
اس خط میں جناب آل رضا نے وصی فیض آبادی کی صلاحیتوں کو سراہا ہے۔ آل رضا کا یہ خط میری کتاب "جدید مرثیہ کے تین معمار" میں شائع ہو گیا ہے۔

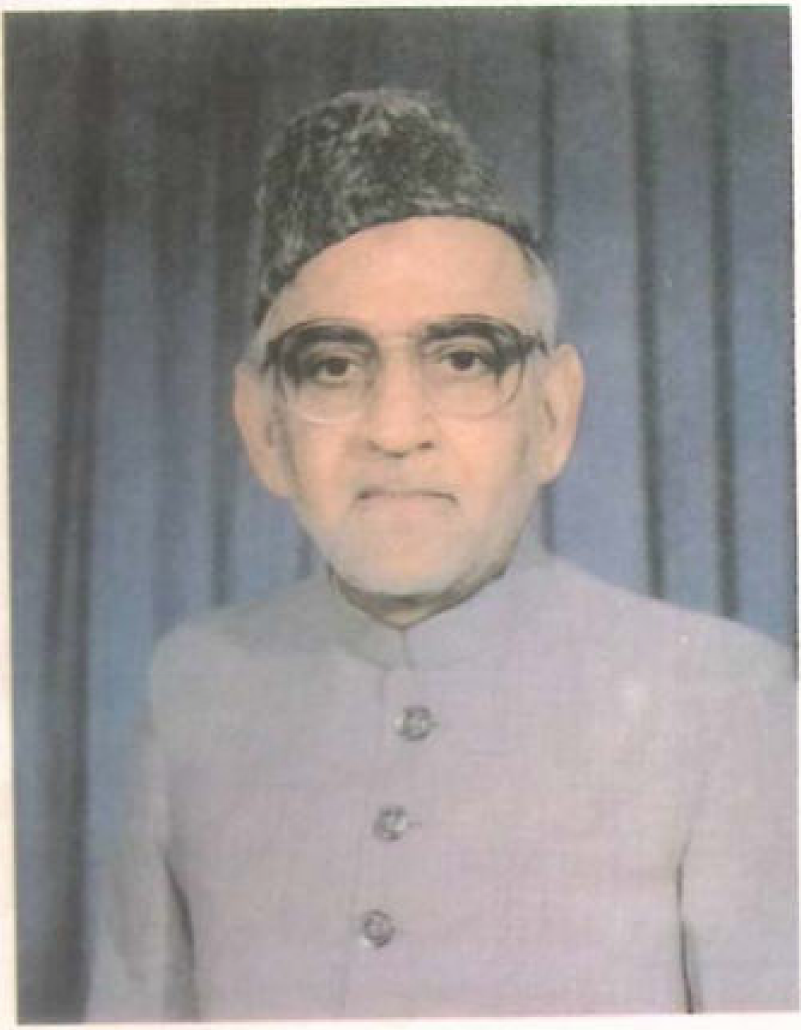
ہاشمی: وحید الحسن ہاشمی درس و تدریس کی خدمات انجام دیتے ہیں۔ ۱۵ ستمبر ۱۹۲۸ء میں محلہ میرانی بازار جون پور میں پیدا ہوئے۔ لاہور میں مقیم ہیں۔ دو تین مرثیے چھپ چکے ہیں۔ آل رضا نے انھیں ایک خط میں اپنا شاگرد لکھا ہے۔

ہلال: ۱۸ مارچ ۱۹۴۸ء کو راولپنڈی میں پیدا ہوئے۔ جوش نے انھیں اپنا واحد شاگرد لکھا ہے۔ نسیم امروہوی کے تلامذہ میں اب نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ "جدید مرثیہ" پر جامعۂ کراچی سے پی ایچ۔ ڈی کر رہے ہیں۔ تین مرثیے شائع بھی ہو چکے ہیں۔ ان کے مرثیوں میں انقلاب کا لب و لہجہ ہے جس سے ان کی انفرادیت ظاہر ہوتی ہے (ساحر لکھنوی)۔ (اب وہ پی ایچ۔ ڈی کر چکے ہیں۔ ساحر)

ہمزہ: سید لائق علی ہمزہ ۱۲ اگست ۱۹۱۲ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ خبیر کے شاگرد ہیں۔ مرثیے غیر مطبوعہ ہیں، البتہ نوحوں کی دو بیاضیں "حسینؑ حسنؑ" اور "شکوہ غم" طبع ہو چکی ہیں۔ (افسوس کہ وہ بھی رحلت کر چکے ہیں۔ ساحر)

یاور: ڈاکٹر یاور عباس ۱۹۱۷ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ تقسیم کے بعد پاکستان میں مرثیہ کی مجالس کے انعقاد اور اس کے اہتمام و انتظام میں انھوں نے بڑی خدمت انجام دی ہے۔ "۱۹۶۲ء کے چند جدید مرثیے" میں ان کا مرثیہ شائع ہو چکا ہے۔ ہر سال اپنے مکان پر مرثیہ پیش کرتے ہیں۔ (افسوس ان کے لیے بھی کہ اب وہ اس دنیا میں نہیں ہیں۔ ساحر)

یاور: یاور اعظمی، نسیم امروہوی کے شاگرد ہیں۔ یکم مئی ۱۹۱۲ء کو موضع بہاالدین پور کندھیا ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔ "مراثیِ یاور" ۱۹۷۷ء میں چھپ چکی ہے۔ اس میں چھ مرثیے ہیں۔



عطا ہو ساحرِ مجبوبیاں کو بھی جب تک
سخن کا رزق درِ بل اتی سے ہو تقسیم